تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی اُردو

نوآبادیاتی عہد میں خواتین کے اردو سفرنامے: سماجی و سیاسی مطالعہ

محقق

روبینہ پروین

38-FLL/PHDURDU/S13

نگران

ڈاکٹر نجیبہ عارف

پروفیسر، شعبہ اُردو

International Islamic Univ.
CENTRAL
LIBRARY
ISLAMABAD

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

Accession No. TH-22502

PhD
915
[illegible]

اردو ادب - سفرنامہ

" - سفرنامہ - خواتین

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: Robina Parveen

Title of the Thesis: " نوآبادیاتی عہد میں خواتین کے اردو سفرنامے: سماجی و سیاسی مطالعہ "

Registration No: 38-FLL/PHDURDU/S13

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Najeeba Arif
Chairperson Department Of Urdu Female IIUI

External Examiner:

Dr. Rubina Tareen
Professor, Multan

External Examiner:

Dr. Qurat ul Ain Tahira,
Associate Professor
Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Sabahat Mushtaq
Assistant Professor, Department of Urdu Female IIUI

Supervisor:

Dr. Najeeba Arif
Chairperson Department Of Urdu Female IUII

International Islamic Univ.
CENTRAL LIBRARY
ISLAMABAD

بسم الله الرحمن الرحيم

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ روبینہ پروین رجسٹریشن نمبر 38-FLL/PHDURDU/S13 نے پی۔ایچ۔ڈی اردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے مقالہ بعنوان "نوآبادیاتی عہد میں خواتین کے اردو سفر نامے: سماجی وسیاسی مطالعہ" رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر نجیبہ عارف

پروفیسر، شعبۂ اردو

VB5595

Rupees 20 — ۲۰ روپیہ

بیان حلفی

میں روبینہ پروین ولد شوکت علی۔ رجسٹریشن نمبر
38-FLL/PHD-Urdu/S-13 حلفیہ بیان دیتی ہوں کہ میں نے
اپنا تحقیقی مقالہ بعنوان "نوآبادیاتی عہد میں خواتین کے
اردو سفر نامے: سیاسی و سماجی مطالعہ" ڈاکٹر نجیبہ عارف
کی زیر نگرانی مکمل کیا ہے۔ جس میں کسی قسم کی چربہ سازی
اور نقل مکانی نہیں کی گئی۔ یہ کام وزویہ کی ذاتی محنت و
کاوش اور تحقیق پر مبنی ہے
مندرجہ بالا بیان میں جو کچھ کہا گیا میرے علم و یقین سے
مطابق بالکل صحیح اور درست ہے۔

گواہ
دستخط
نام: محمد نذیر
61101-1730676 NIC

دستخط
نام: روبینہ پروین
31201-2054585 NIC

ATTESTED
S.M. SAQLAIN ADVOCATE
NOTARY PUBLIC
Rawalpindi - Islamabad

20418
2-10-2018

مہ بینہ پروین دختر شوکت علی بیگ
البیرونی گیسٹ ہاؤس۔
روم نمبر 22 IIU ISB
31301-2054505-8
بیان حلفی برائے "مقالہ"
IIU - ISB

RAHEEL AHSAN
Stamp Paper Vender
License No.533
Main Road Khayaban-e-Sir Syed
Rawalpindi

پیش لفظ

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سفر نامے اپنے عہد کی تاریخی، تہذیبی، سماجی دستاویز ہوتے ہیں اور کسی بھی معاشرے کی تہذیب و ثقافت، سیاست، معاشرت اور تاریخ کو جاننے کے لیے سفر ناموں کا مطالعہ بے حد مفید ہے۔

سفر نامہ کا شمار اردو ادب کی بیانیہ صنف میں ہوتا ہے۔ سفر کرنے والا دورانِ سفر یا اختتامِ سفر پر دوسروں کو اپنے مشاہدات و تجربات اور احساسات میں شامل کرنے کی غرض سے جب سفر کے حالات و واقعات کو تحریری صورت عطا کرتا ہے تو وہ سفر نامہ کہلاتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں انگریز تاجروں کے بھیس میں آئے اور اپنی سازشوں کے ساتھ ساتھ نااہل مغل حکمرانوں کی نااہلی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پورے برصغیر پر قابض ہو گئے۔ ان کا یہ استبدادی دور تقریباً دو صدیوں پر محیط ہے۔ اس دور میں ہر شعبۂ زندگی میں تبدیلیاں آئیں۔ ادب بھی اس نو آبادیاتی عہد کے اثرات و ثمرات سے متاثر ہوا اور نئے اصناف و اسالیب متعارف ہوئے جن میں مضامین، سوانح، تنقید، ناول، افسانہ، آزاد نظم اور سفر نامہ اہم اصناف ہیں۔ سفر نامہ اس دور میں اتنی معروف و مقبول صنف بن گئی کہ اس میں کئی خواتین نے بھی طبع آزمائی کی اور اپنے سفر کے حالات و مشاہدات دلچسپ انداز میں تحریر کیے۔

سفر نامے کی صنف ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے اور اردو میں بھی اب اس میں خاصا سرمایہ موجود ہے۔ اس صنف پر جو تحقیقی کام ہوئے ہیں۔ ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن نو آبادیاتی عہد میں خواتین کے اردو سفر ناموں کا مطالعہ ابھی نامکمل ہے جب کہ نو آبادیاتی عہد کی خواتین سفر نامہ نگاروں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے اور یہ بھی اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہے۔ لیکن ان پر تاحال کوئی باقاعدہ اور مستقل تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ عام سفر ناموں پر ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر قدسیہ قریشی، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر خالد محمود اور ڈاکٹر بشریٰ رحمٰن وغیرہ نے کام کیا ہے جن کی وجہ سے اس صنف کی حیثیت نمایاں ہوئی ہے۔ لیکن راقمہ کی معلومات کے مطابق اردو سفر نامہ نگاری کی تاریخ میں خواتین سفر نامہ نگاروں کے کردار پر کوئی جامع، مبسوط اور مستند تحقیق ابھی تک سامنے نہیں آسکی، جو ان کے کام کی اہمیت و افادیت اجاگر کرے۔ دوسری اہم بات نو آبادیاتی عہد کے سفر ناموں کا بطورِ خاص مطالعہ ہے۔ یہ عہد ہماری سیاسی و سماجی تاریخ کا انتہائی اہم دور ہے جب ہماری قومی شخصیت کے خدوخال کی تشکیل ہوئی۔ اردو سفر نامہ کی فنی و ادبی خصوصیات کی تلاش بھی ضروری تھی۔ اب تک اردو سفر ناموں پر جو کام ہوا ہے وہ صرف سفر نامہ کے آغاز و ارتقا اور ان کے عمومی تعارف پر ہے۔ ان میں اوّل تو تمام خواتین سفر نامہ نگاروں کا تذکرہ ہی نہیں ملتا اور جہاں یہ تذکرہ موجود بھی ہے، وہ بہت کم اور سرسری سا ہے۔ ان مطالعات میں نہ تو خواتین کے سفر ناموں کا مفصل اور گہرا تجزیہ کیا گیا ہے اور نہ ہی ان کے سیاسی و سماجی افکار کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے۔ ایسی صورت حال میں یہ صنف اس امر کی متقاضی

تھی کہ اس کی طرف توجہ مرکوز کی جائے اور ان خواتین کے سفر ناموں کے مطالعہ و تحقیق کے ذریعے ان کی قدر و قیمت کا تعین کیا جائے۔

چنانچہ راقمہ نے اس جانب توجہ کی اور اللہ کے فضل و کرم سے پانچ ابواب پر مشتمل یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس سلسلے میں ایک وضاحت ضروری ہے کہ اس تحقیق میں انیسویں صدی سے لے کر قیامِ پاکستان تک کے سفر ناموں کا احاطہ کیا گیا ہے اور اس میں خواتین کے ان اردو سفر ناموں کو شامل کیا ہے جو باقاعدہ کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔

یہ مقالہ کل پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب سفر نامہ کے فن، اہمیت اور روایت پر ناز ہے۔ اس میں سفر نامہ کے معنی و مفہوم پیش کرنے کے علاوہ سفر نامہ کی تکنیک، اسلوب، اقسام بیان کرنے کے ساتھ اس کی اہمیت و روایت بھی واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دوسرے باب میں نوآبادیاتی عہد کا مطالعہ کیا گیا ہے اور اس عہد کے سفر ناموں کی مختلف اقسام کی صورت میں درجہ بندی کی گئی ہے۔ تیسرا باب نوآبادیاتی عہد کی سفر نامہ نگار خواتین کے علمی، سیاسی، سماجی اور خاندانی پس منظر پر مشتمل ہے۔ اب تک ان خواتین کے حالات و پس منظر کے بارے میں معلومات مختلف تذکروں اور رسائل میں تھوڑی بہت پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے سفر ناموں سے بھی راقمہ نے معلومات اکٹھی کی اور ان کو اس باب میں شامل کیا۔ اس باب کے سلسلے میں راقمہ نے بہت سے نامور ادیبوں سے رابطہ کیا اور ان سے ان کا خاندانی پس منظر جاننے کی کوشش کی اور بالآخر اس حد تک کامیابی ہوئی کہ چند خواتین کے علاوہ باقی کی خواتین کی سوانح حیات کو مکمل کیا۔

چوتھے باب میں خواتین کے سفر ناموں کا سیاسی و سماجی مطالعہ کیا گیا ہے اور ان کی ادبی اہمیت کے ساتھ سفر ناموں کی نوعیت، سفر کرنے کے مقاصد پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان سفر ناموں کا تجزیہ موضوعات کی حد بندی کے تحت کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے دیارِ مقدسہ کے سفر نامے، پھر دیارِ مغرب اور آخر میں اندرونِ ہندوستان کے سفر ناموں کا خصوصی جائزہ لیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں خواتین سفر نامہ نگاروں کے امتیازی خصائص کا جائزہ ان کے عہد کے تہذیبی و تمدنی مظاہر کے تناظر میں لیا ہے۔

سب سے پہلے اس پاک ذات کا صد شکر ہے کہ جس نے ہمیشہ مجھے میری اوقات سے بڑھ کر نوازا اور میرے تحقیقی کام کی تکمیل بھی اُس ہی کی خاص عنایت ہے۔ اب میں ان تمام افراد کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتی ہوں جن سب کا میرے اس تحقیقی کام میں کسی نہ کسی طرح کا تعاون رہا ہے۔ میرے ابو جان، بھائی اور بہنیں جو زندگی کے گرم و سرد میں ہمیشہ میرے لیے دعا گو، کوشاں اور فکر مند رہے۔ ان کی محبتوں کی میں مقروض رہوں گی۔

سب سے پہلے میں اپنی مشفق استاد و نگران ڈاکٹر نجیبہ عارف صاحبہ کا خلوصِ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جن کی علمیت، تجربے اور تخلیقی بصیرت نے قدم قدم پر کبھی ڈانٹ اور کبھی پیار سے میری رہنمائی کی اور میری دل چسپی دیکھتے ہوئے میرے لیے یہ موضوع تجویز کیا۔ ڈاکٹر حمیرا اشفاق صاحبہ کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے جن کی نیک خواہشات اور مواد کی فراہمی نے میرا کام آسان بنایا۔ محترم جناب ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب کا شکریہ ادا کرنا میرے لیے واجب ہے کہ جنھوں نے بڑی شفقت سے اپنی لائبریری سے مجھے استفادے کی اجازت دی۔

اپنے پیارے بھتیجے احتشام اکبر کا بھی خصوصی طور پر شکریہ ادا کرتی ہوں جو اپنی تمام تر مصروفیات کو چھوڑ کر میرے ساتھ گھنٹوں لائبریریوں کی خاک چھانتا رہا مگر کبھی بھی ناگواری کا اظہار تک نہ کیا اور دوست عطیہ ثمرہ کی دعاؤں نے ہر مشکل کو ختم کیا اور میری ہمت بڑھائی جس کا میں شکریہ ادا کرتی ہوں۔

شعبۂ اردو کے تمام اساتذہ اور ساتھیوں کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ اپنی عزیز دوستوں عاصمہ نذیر، اسماء عزیز اور سمیرا منیر کی بے حد ممنون ہوں جنھوں نے وقتاً فوقتاً میرا حوصلہ بڑھایا اور مجھے مقالہ مکمل کرنے کی تاکید کرتی رہیں۔ اپنی ہنستی مسکراتی چھوٹی بہنوں نوشین اختر، صابرہ، وجیہہ اور بصرین کا بھی خصوصی شکریہ کہ جنھوں نے اپنی پُر خلوص دعاؤں سے نوازا۔

اپنی دوستوں صغریٰ، نگینہ اور شہلا کی محبتوں اور خدمات گزاریوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی کہ جن کے تعاون اور ساتھ نے اس مرحلہ کو کامیابی سے ہم کنار کیا اور جن کا شکریہ ادا نہ کرنے پر مار پڑنے کا اندیشہ ہے۔ آخر میں اپنے تمام احباب اور کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرتی ہوں جن کا ذکر اس فہرست میں نہیں ہو سکا۔

روبینہ پروین

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
ا۔	**باب اوّل:**	
	سفر نامے کی صنف: اہمیت و روایت	۱
۲۔	**باب دوم:**	
	نو آبادتی عہد اور اردو سفر نامے	۵۰
۳۔	**باب سوم:**	
	نو آبادیاتی عہد کی خواتین سفر نامہ نگار: علمی، سیاسی و سماجی پس منظر	۸۱
۴۔	**باب چہارم:**	
	نو آبادیاتی عہد میں خواتین کے اردو سفر نامے: سماجی و ثقافتی مطالعہ	۱۲۹
۴۔	**باب پنجم:**	
	خواتین سفر نامہ نگاروں کے امتیازی خصائص: تہذیبی و تمدنی مظاہر	۱۸۸
	مجموعی جائزہ، نتائج اور سفارشات	۲۴۴
	کتابیات	۲۵۲
	ضیمہ جات	۲۵۸

فہرست ابواب

باب اول: **سفر نامے کی صنف: اہمیت و روایت**

الف۔ سفر نامہ کی صنف

ا۔ تکنیک

۲۔ اسلوب

۳۔ اقسام

ب۔ سفر ناموں کی اہمیت

ا۔ ادبی اہمیت

۲۔ علمی اہمیت

۳۔ سماجی اہمیت

۴۔ تمدنی اہمیت

ج۔ جنوبی ایشیا میں سفر نامے کی روایت

ا۔ اٹھارویں صدی تک کے اردو سفر نامے

۲۔ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء کے سفر نامے

۳۔ نو آبادیاتی عہد کے سفر نامے

حوالہ جات

باب دوم: **نو آبادیاتی عہد اور اردو سفر نامے**

الف۔ نو آبادیاتی عہد: ایک جائزہ

ب۔ نو آبادیاتی عہد میں اردو سفر نامے

ا۔ دیارِ مقدسہ کے سفر نامے

۲۔ سیاسی و سفارتی سفر نامے

۳۔ علمی سفر نامے

۴۔ تجارتی و تفریحی سفر نامے

حوالہ جات

باب سوم: **نوآبادیاتی عہد کی خواتین سفر نامہ نگار: علمی، سیاسی و سماجی پس منظر**

۱۔ نواب سکندر جہاں

۲۔ نواب سلطان جہاں بیگم

۳۔ بیگم سر بلند جنگ بہادر (اختر حمید)

۴۔ نازلی رفیعہ سلطان

۵۔ عطیہ فیضی

۶۔ بیگم صغرا ہمایوں مرزا

۷۔ بیگم حسرت موہانی

۸۔ شاہ بانو (میمونہ سلطان)

۹۔ محمودہ عثمان حیدر

حوالہ جات

باب چہارم: **نوآبادیاتی عہد میں خواتین کے سفر نامے: سماجی و ثقافتی مطالعہ**

۱۔ دیارِ مقدسہ کے سفر نامے

۲۔ دیارِ مغرب کے سفر نامے

۳۔ اندرونِ ہندوستان کے سفر نامے

حوالہ جات

باب پنجم: **خواتین سفر نامہ نگاروں کے امتیازی خصائص: تہذیبی و تمدنی مظاہر**

۱۔ تعلیمِ نسواں اور اس کے اثرات

۲۔ برصغیر کی مذہبی تحریکیں اور اس کے اثرات

۳۔ سیاسی و سماجی تحریکیں

۴۔ مذہبی وابستگی اور اس کے مظاہر

حوالہ جات

مجموعی جائزہ، نتائج اور سفارشات

کتابیات

ضمیمہ جات

باب اوّل

سفر نامے کی صنف:

اہمیت و روایت

باب اوّل

سفر نامے کی صنف: اہمیت وروایت

الف۔ سفر نامہ بطور صنفِ ادب:

سفر ازل سے انسانی فطرت میں شامل ہے اور وہ اپنی اسی فطرت کی وجہ سے کبھی بھی ایک جگہ ٹھہر نہیں سکا۔ انسان مختلف مقاصد کی تکمیل کے لیے سفر اختیار کرتا رہا ہے، کبھی وہ معاشی ضروریات کی تکمیل کے لیے گھر سے نکلا اور کبھی دین کی خاطر نقل مکانی کی۔ ایک سفر سیر و تفریح کی غرض سے بھی کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں بھی ہمیں سفر اختیار کرنے کی متعدد جگہوں پر تلقین کی گئی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ العنکبوت میں فرمایا ہے۔

قُل سِیرُوافِی الاَرضِ

کہہ دو کہ تم زمین میں چلو پھرو۔[1]

سفر زندگی کا ایک بڑا اہم جزو ہے اور ہر انسان کو اس میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ سفر کو وسیلۂ ظفر بھی کہا گیا ہے کیوں کہ سفر سے کامیابیاں اور کامرانیاں بھی ملتی ہیں اس سے راہ ورسم بڑھتے ہیں اور ترقی کے دروازے کھلتے ہیں۔

انسانی زندگی اور سفر دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ابتداء ہی سے جب انسان کسی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے پیدل یا کسی سواری پر سالوں سفر پر رہتا تھا تو وہ راستے کی ہر مشکل اور ہر واقعہ کو اپنے دل و دماغ میں محفوظ کرتا جاتا تھا اور واپسی پر وہ ان تمام واقعات و مشاہدات اور تجربات میں دوسروں کو شریک کرتا تھا۔ اپنی کہانی میں دوسروں کو شریک کرنے کی یہی خواہش سفر نامہ لکھنے کا باعث بنی اور سفر نامہ لکھنے کا آغاز ہوا۔

سفر نامہ: تعریف و تعبیر:

"سفر" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "طے مسافت" یا "قطع مسافت" کے ہیں۔ اردو زبان میں یہ لفظ عربی سے مستعار ہے اور انھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح "نامہ" فارسی زبان کا لفظ ہے اور جس کے لغوی معنی "لکھے ہوئے خط"، "فرمان" یا "تحریر شدہ عبارت" کے ہیں۔ اس طرح عربی اور فارسی کے ان دو لفظوں کو ملا کر

سفر نامہ کی اصطلاح وضع کی گئی۔ اُردو میں سفر نامہ رودادِ سفر یا سفر کے مشاہدات و تجربات کو تحریری طور پر بیان کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ سفر نامہ ایک قدیم نثری صنف ہے۔ عربی میں "رحلات" اور انگریزی زبان میں اسے "Travelogue" کہا جاتا ہے۔ سفر نامہ کی تعریف کے ضمن میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ رقم طراز ہیں۔

> سفر نامہ ہر ادب کی ایک مستقل بیانیہ صنف ہے جس میں خارجی مشاہدے کو تخیل پر فوقیت حاصل ہے، البتہ سفر سے متعلق ہونے کے باعث سفر نامے میں تحیّر کا عنصر نمایاں تر ہے۔ لیکن یاد رہے کہ مستقل ادبی صنف ہونے کے ناطے سفر نامے کی پیش کش ادبی نوع کی ہو گی نہ کہ محض مسافر کا بیان۔ اس لیے کہ اُمر مجبوری سفر اختیار کرنے والے ہر مسافر کا سفری احوال، ادب کی ایک مستقل صنف سفر نامہ یا سیاحت نامہ نہیں کہلائے گی۔ [۲]

سفر نامہ نثری ادب کی بیانیہ صنف ہے جس میں سفر کرنے والا اپنے چشم دید واقعات، تجربات و مشاہدات کو بیان کرتا ہے۔ اس میں نہ صرف خارجی واقعات کا بیان ہوتا ہے بلکہ باطنی احساسات و جذبات کا اظہار پایا جاتا ہے اور وہی سفر نامہ ادبی کہلائے گا جس میں خارج اور باطن کا امتزاج پایا جائے۔ سفر نامے میں کسی ملک کے حالات، جغرافیہ، تاریخ اور محل وقوع کو بیان کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ ایک تخلیقی تجربہ ہے۔ ایک ادیب یا ایک فنکار دورانِ سفر جن حالات و واقعات سے گزرتا ہے ان کو تمام جزیات سمیت اپنے جذبات و احساسات کے ساتھ ضبطِ تحریر میں لاتا ہے تو یہ تخلیقی کاوش سفر نامہ کے زمرہ میں آتی ہے۔ سفر نامہ کے بارے میں ڈاکٹر قدسیہ قریشی لکھتی ہیں کہ

> سفر نامے کے معانی داستانِ سفر، روداد سفر یا سفر کے قصّے کے ہیں جسے تحریری طور پر پیش کیا گیا ہو۔ انگریزی میں ایسے سفر کو بیان کرنے والی متحرک تصاویر یا مصّور تقریر بتایا گیا ہے۔ [۳]

سفر نامہ ایک ایسی صنف ادب ہے جن میں سفر نامہ نگار دورانِ سفر پیش آنے والے حادثات و واقعات اور مشاہدے میں آنے والی ہر چیز کو تحریری صورت میں بیان کرتا ہے۔ وہ اپنے اس عمل سے دوسروں کو معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ تجسس کو پیدا کرنے کے مختلف حربے استعمال کرتا ہے تاکہ قاری کی دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہے اور وہ پورا سفر نامہ پڑھنے پر مجبور ہو۔ سفر نامے کی صنف کے متعلق ابوالاعجاز حفیظ صدیقی رقم طراز ہیں:

> اجنبی شہروں اور غیر ممالک کے جغرافیائی اور سماجی حالات سے انسان نے ہمیشہ گہری دلچسپی لی ہے۔ ایک سیاح جب اپنے جغرافیائی اور سماجی گردوپیش سے نکل کر کسی دوسرے مقام پر پہنچتا ہے تو وہ ایسی تمام چیزیں جو اس کے اپنے مولد و منشا کے مانوس سے مختلف ہوتی ہیں اختلافِ ماحول اور اختلافِ معاشرت کے باعث دلچسپ اور استعجاب انگیز نظر آتی ہیں اور وہ باتیں جو مشترک ہوتی ہیں وہ اپنے

اشتراک کے باعث دلچسپ معلوم ہوتی ہیں اور انھیں دوسرے بالخصوص اپنے ہم وطنوں کے لیے قلم بند کر لیتا ہے۔ ایسی تحریر کو ادبی اصطلاح میں سفر نامہ کہتے ہیں۔[۴]

سفر نامہ تخلیق کرنے کی بنیادی شرط سفر ہے۔ یہ تخیلاتی صنفِ ادب نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی حالات و واقعات اور مشاہدات کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس کے لیے دیس پردیس، اجنبی راستوں اور مختلف حالات و واقعات سے گزرنا پڑتا ہے تب کہیں سفر نامہ وجود میں آتا ہے۔ سفر کرنے کے مختلف مقاصد ہو سکتے ہیں اور یہ دورانِ سفر یا اختتامِ سفر پر لکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر خالد محمود سفر نامے کے بارے میں کہتے ہیں کہ سفر نامہ نگار دورانِ سفر یا سفر سے واپسی پر اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات اور تاثرات و احساسات کو ترتیب دے کر جو تحریر رقم کرتا ہے وہ سفر نامہ ہے۔[۵]

اس طرح سفر نامہ نگار اپنی تحریر کے ذریعے نہ صرف معلومات فراہم کرتا ہے بلکہ وہ اپنے اس تجربے میں دوسروں کو بھی شامل کرتا ہے۔ جس احساسات و جذبات اور حادثات و واقعات سے وہ خود گزرتا ہے تو وہ کوشش کرتا ہے کہ اس کی ہو بہو منظر کشی کرے۔ تو جب وہ خارجی ماحول کے ساتھ ساتھ اپنے باطن پر گزرنے والی کیفیات کا خوبصورت الفاظ میں اظہار کرتا ہے تو سفر نامہ ادب کی صنف بن جاتا ہے اور یوں سفر نامہ ایک معلوماتی تحریر کی بجائے ادبی دائرے میں آ جاتا ہے۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد سفر نامہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> سفر نامہ نثری ادب کی ایک ایسی صنف ہے جو سفر کے حالات و واقعات، مشاہدات، کوائف اور تجربات کا اظہاریہ ہے۔ یہ وہ بیانیہ ہے جو مسافر کے ذوق اور احوالِ سفر کا غماز ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں مسافر کے عرصہ سفر کے روز و شب جگمگاتے ہیں۔[۶]

سفر نامہ اردو ادب میں ایک اہم صنف کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور یہ نہ صرف کسی سیاح کی سیاحت کا احوال ہوتا ہے بلکہ یہ سفر نامہ نگار کی خود نوشت بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے تناظر میں کسی ملک کے حالات، معاشرت اور طرزِ بود و باش کا ذکر کرتا ہے۔ اس طرح وہ ایک طرف تو سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات اور گرد و پیش کے مناظر کو بیان کرتا ہے تو دوسری طرف اپنی پسند، ناپسند اور احساسات کی ترجمانی بھی کر رہا ہوتا ہے۔ سفر نامے کے بارے میں سحر انصاری یوں رقم طراز ہیں:

> آج کل دنیا میں دو اصنافِ ادب بطورِ خاص مقبولیت حاصل کر رہی ہیں۔ ایک تو سفر نامہ اور دوسری خود نوشت، ویسے دیکھا جائے تو سفر نامہ بھی ایک نوع کی خود نوشت ہوتا ہے اور خود نوشت ایک طرح کا سفر نامہ کہا جا سکتا ہے۔[۷]

ا۔ سفر نامے کی تکنیک:

تکنیک طریقے یا انداز کو کہتے ہیں۔ ادیب و شاعر یا فن کار جس کے ذریعے اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کرتا ہے۔ ویبسٹر سکول ڈکشنری "Webster School Dictionary" کے مطابق:

> The way in which technical details are treated (as by a riter) or basic physical movements are used (as by a dancer) also: ability in such treatment or use (faultless Piano techniques). [8]

نگہت ریحانہ خان تکنیک کی تعریف یوں بیان کرتی ہیں کہ

> ہر موضوع اور مواد کے لیے الگ تکنیک کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک خاص مواد، ایک خاص تکنیک کے استعمال سے پُر اثر ہو جاتا ہے۔ اس کا استعمال مجموعی تاثر پیدا کرنے کے لیے یا اس کو بڑھانے کے لیے کیا جاتا ہے گویا تکنیک مقصد نہیں وسیلہ ہے۔ [۹]

تکنیک ایک ایسا طریقہ ہے جس کو اپنا کر تخلیقی جذبے کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ہر صنف کے لیے ایک الگ تکنیک کی ضرورت پڑتی ہے۔ داستان،، ناول، ڈرامہ، سفر نامہ، ہر ایک کی تکنیک دوسرے سے مختلف ہے کسی ایک صنف میں بھی مختلف تکنیکیں استعمال کی جاسکتی ہیں۔ اظہار کی قوت مختلف تکنیک کی متقاضی ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر احسن فاروقی:

> یہ امر ہمیشہ سے مسلم ہے کہ فن کے لیے تکنیک ضروری ہے لیکن اگر وہ فن میں چھُپ نہ سکے تو فن بناوٹی ہو جاتا ہے اور اپنے مقصد سے ہٹ جاتا ہے۔ [۱۰]

ہر تخلیق کار اپنے خیالات واحساسات اور تجربات کو بیان کرنے کے لیے مختلف طریقے استعمال کرتا ہے۔ یہی طریقے تکنیک کہلاتے ہیں۔ تکنیک کے استعمال کے لیے تخلیق کار کے ذہن میں کچھ تصورات ہوتے ہیں۔ کسی بھی صنف کے لیے تکنیک نہایت ضروری ہے۔

سفر نامہ ایک ایسی صنف ہے جس میں تکنیک کے نئے نئے تجرات کیے جارہے ہیں۔ اردو کے ابتدائی سفر نامہ نگاروں نے اپنے سفر نامے، خطوط، ڈائری، روزنامچے تکنیک میں لکھے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دوسری اصناف کی طرح سفر نامے میں بھی کئی تکنیکیں استعمال کی گئیں جیسے فلیش بیک، رپورتاژ، مکالماتی، آپ بیتی وغیرہ۔ تکنیک کے استعمال سے سفر نامہ نگار اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لاتا ہے تاکہ وہ اپنے مشاہدات و تجربات کو موثر انداز

میں دوسروں تک پہنچائے۔ وہ اپنی تخلیقات میں تکنیک کا استعمال ایک خاص تاثر پیدا کرنے اور چونکانے کے لیے کرتا ہے تاکہ وہ دوسروں سے الگ نظر آئے۔ بعض اوقات وہ شعوری اور لاشعوری طور پر ایسے تکنیکی حربوں کا استعمال کرتا ہے کہ اس کی تحریر پُراثر ہو جائے۔

سفر نامہ تکنیک کے اعتبار سے ایک ایسی صنف ہے جس میں بہت سی دیگر اصناف کے اوصاف شامل ہوتے ہیں مثلاً ڈائری، خطوط، آپ بیتی، روزنامچہ، رپورتاژ، ناول کی تکنیک میں افسانوی رنگ شامل کر کے، حتیٰ کہ منظوم سفر نامے بھی تخلیق کیے گئے ہیں۔ ابتدائی اور قدیم تمام سفر نامے بیانیہ تکنیک میں لکھے گئے ہیں۔ آج کے سفر نامے میں بیانیہ کے ساتھ ساتھ دیگر ادبی حربے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ اردو کے قدیم سفر ناموں میں بالعموم یہ طریق کار رائج رہا ہے کہ سفر نامہ نگار بیشتر ایسی تاریخی، جغرافیائی، تہذیبی، معاشرتی اور دیگر معلومات فراہم کرنے کا فریضہ سرانجام دیتے تھے جو دوسروں کو راستے کی مشکلوں سے بچانے کا کام دیں۔ سفر نامے کی مختلف تکنیکوں کے بارے میں شفیع عقیل لکھتے ہیں:

> دنیا کی ہر زبان میں سفر نامہ مختلف صورتوں میں موجود ہے، یادداشتوں کے روپ میں، ڈائریوں کی شکل میں، روزنامچوں کے انداز میں، آپ بیتی کی صورت میں، احوال و آثار کی تحریروں میں، خطوط کی طرز پر۔ [۱۱]

اُردو کے نامور سفر نامہ نگاروں یوسف خان کمبل پوش نے عجائبات فرنگ، مسیح الدین علوی سفیر اودھ، منشی محبوب عالم سفر نامہ یورپ، محمد حسین آزاد سیرِ ایران، کریم الدین سیاحت نامہ، سر سید احمد خان مسافرانِ لندن اور شبلی نعمانی نے اپنے سفر نامہ روم و مصر و شام میں ملک کی حالت، انتظامیہ کا طریقِ کار، عدالت کا اصول، ملک کا جغرافیہ، تجارت کی کیفیت اور عمارتوں کے نقشہ جات وغیرہ کو سفر نامے کا حصہ بنایا ہے اور یہ سفر نامے سفری گائیڈ کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں مگر آج کا سفر نامہ کہانی کی صورت میں لکھا جارہا ہے۔ سفر نامہ چونکہ واحد متکلم میں لکھا جاتا ہے، اس لیے اس میں آپ بیتی کا انداز نظر آتا ہے اور سفر نامے میں دلچسپی کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔ سفر نامے کی تکنیک میں اہمیت اس بات کو ہے کہ سفر نامہ کس وقت لکھا گیا اور لکھنے والے نے اپنی یادداشتوں کو کیسے محفوظ کیا ہے۔ سفر نامے کی تکنیک کے جو جو تجربات کیے جاتے ہیں ان کا مختصر احوال درج ذیل ہے۔

۲۔ خطوط کی تکنیک:

دورانِ سفر لکھے ہوئے سفر نامے کی دوسری صورت خطوط کی صورت میں نظر آتی ہے۔ ڈائری کی ہیئت میں

لکھے گئے سفر ناموں میں تخلیقی عمل بے ساختہ اُبھرتا ہے لیکن خطوط میں آرائش اور تخلیقی عنصر موجود ہوتا ہے۔ڈائری میں سفر نامہ نگار اپنے جذبات واحساسات میں دوسروں کو شامل نہیں کرتا بلکہ خود پر گزرنے والی کیفیات اور اپنے تجربات کو ڈائری کے حوالے کر دیتا ہے مگر خطوط کا مخاطب تو فاصلے پر موجود ہوتا ہے اور وہ مناظر کے حُسن و لطافت میں بالواسطہ شریک ہوتا ہے اور سیاح وہ کیفیت جو اُس نے خود محسوس کی ہوتی ہے مکتوب الیہ کو بھی منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ایسا بیانیہ صداقت پر مبنی ہوتا ہے کیونکہ سیاح آنکھوں دیکھا حال فوری طور پر دوسروں تک پہنچاتا ہے۔اس تکنیک کے بارے میں ڈاکٹر شہاب الدین لکھتے ہیں:

> اس میں سفر نامہ نگار اپنے گھر کے افراد، دوست، رشتہ دار یا کسی دیگر متعلق شخص کو خط کے ذریعے احوالِ سفر سے واقف کراتا ہے۔چوں کہ اس تکنیک میں بھی حالات وواقعات دورانِ سفر ہی تحریر کیے جاتے ہیں اس لیے اس میں بھی واقعات و جذبات کی تازگی اور صداقت کے عناصر موجود ہوتے ہیں۔[۱۲]

عطیہ فیضی کا سفر نامہ زمانہ ٔ تحصیل، عبدالغفار خاں کا سفر نامہ سیر دکن، شیخ عبدالقادر مقامِ خلافت، نازلی رفیعہ سلطان سیر یورپ، خطوط کی تکنیک میں ہیں۔اپنے سفر نامے لکھنے کے متعلق نازلی رفیعہ سلطان سیرِ یورپ کی تمہید میں یوں رقم طراز ہیں۔اصل میں یہ وہ خطوط ہیں جو میں نے اپنے بزرگوں کے نام سیرِ یورپ کے حالات کے لکھے ہیں اس میں نہ عبارت آرائی ہے نہ قافیہ پیمائی۔[۱۳]

۳۔ ڈائری/روزنامچے کی تکنیک :

ڈائری/روزنامچے کی تکنیک اُن سفر ناموں میں ملتی ہے جو سفر کے دوران لکھے جاتے ہیں۔ایسے سفر ناموں کے سیاح اپنا زیادہ وقت گھومنے پھرنے اور ارد گرد کے مشاہدے میں گزارے ہیں اور وہ جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اسے اپنے دل و دماغ یا کسی ڈائری پر لکھتے رہتے ہیں۔سفر ختم ہونے کے بعد ان یادداشتوں کو سفر ناموں کی صورت میں بیان کر دیتے ہیں۔ایسے سفر ناموں میں سیاح چوں کہ تمام مناظر کو پھر سے یاد کر کے لکھتا ہے تو اس میں تخیل کو بھی راہ مل جاتی ہے۔

قدیم سفر ناموں میں بہت سے سفر نامے ڈائری کی تکنیک میں لکھے گئے ہیں۔ان سفر ناموں میں سفر نامہ نگار دورانِ سفر کے تمام حالات وواقعات کو تاریخی ترتیب سے لکھتا ہے تو ایسا سفر نامہ ڈائری کی تکنیک اختیار کر لیتا ہے جس میں عام تجربات و مشاہدات ترتیب وار ہوتے ہیں۔اس قسم کا سفر نامہ نہ صرف سماجی و معاشرتی تاریخ کو بیان کرتا ہے

بلکہ حالات و واقعات پر سیاح کا فوری ردّ عمل بھی ظاہر کر دیتا ہے۔ اس قسم کے سفر ناموں کے متعلق ڈاکٹر قدسیہ قریشی یوں رقم طراز ہیں:

> ایسے سفر نامے جو افسانوں، داستانوں سے زیادہ واقعات، حالات یار ہنمائے سفر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ابتدائی سفر ناموں کے ادب میں زیادہ اہم ہیں۔ یعنی یہ سفر نامے سفری روزنامچوں یا گائیڈ بک کی شکل میں لکھے گئے، جنھیں شروع میں سفر کے متعلق نقشوں اور سفری معلومات کی اطلاع فراہم کرنے والی کتابوں کی صنف میں رکھا گیا۔ [۱۴]

ڈائری کی تکنیک میں لکھے گئے سفر ناموں میں سچائی کا عنصر قدرے زیادہ پایا جاتا ہے کیونکہ دورانِ سفر سیاح جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اس کو ہو بہو لکھ لیتا ہے۔ اس قسم کے سفر ناموں میں محمد طفیل کا سفر نامہ "یورپ کا سفر نامہ" سیّد فدا حسین کا "تاریخ افغانستان"، نثار علی بیگ کا "سفر نامہ یورپ"، صغرا ہمایوں بیگم "روزنامچہ بھوپال، آگرہ، دہلی کے حالات"، ڈاکٹر وزیر آغا "انگلستان کا سفر نامہ" شامل ہے۔ یہ سفر نامے ڈائری کی تکنیک میں لکھے گئے ہیں۔ اس لیے ان میں مشاہدہ تازہ اور سچائی سے بھرپور ہے۔

۴۔ ناول کی تکنیک:

دنیا کے تمام ادب میں ایسے بہت سے ناول اور افسانے لکھے گئے ہیں جن میں علاقائی جزیات کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ افسانہ ایک تخیلی صنفِ ادب ہے اور اس میں حقیقت کا عنصر بہت کم پایا جاتا ہے مگر سفر نامے میں گردو پیش کا مشاہدہ کر کے اپنے تجربات واحساسات کی روداد بیان کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں بعض افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں نے سفر کے پس منظر میں خوبصورت ناول اور افسانے لکھے ہیں جیسے فردوس حیدر کا ناول "دائروں میں دائرے" اور ڈاکٹر فرخندہ جالی کا "گرین کارڈ" سفر نامے کی ہیئت میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس طرح یہ ناول سفر نامہ بھی ہے لیکن اسے آسانی سے ناولوں کی صنف میں جگہ دے سکتے ہیں۔ ان کی تکنیک کے متعلق ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ

> سفر ناموں کو ناول کے انداز میں لکھنے کے دو تخلیقی تجربے حال ہی میں منظرِ عام پر آئے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دونوں تجربے خواتین نے کیے ہیں۔ فردوس حیدر کا "دائروں میں دائرے" اور ڈاکٹر فرخندہ جالی کا "گرین کارڈ" ایسے سفر نامے ہیں جو کرداروں کے حوالے سے لکھے گئے ہیں اور جن میں ناول کے وسیع کینوس کو استعمال کر کے ان کرداروں کے گرد پوری کہانی بھی بُن دی گئی۔ [۱۵]

اسی طرح مستنصر حسین تارڑ کا پیار کا پہلا شہر، قرۃ العین حیدر کا جہانِ دیگر، عزیز احمد اور رفعت ملک کے بعض افسانوں اور ناولوں میں غیر ملکی فضا کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن افسانے، ناول اور سفر نامے کے فنی تقاضے مختلف ہیں۔ سفر نامے میں چوں کہ سیاح ان دیکھی سرزمینوں کی سیر کرتا ہے اور وہ نئی دنیا سے واقفیت پیدا کرتا اور انوکھے مناظر کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس طرح سفر نامہ نگار اپنے سفر نامے میں مختلف حادثات و واقعات اور مہمات کو بیان کرتا ہے اور یہی باتیں سفر نامے میں داستان اور افسانے جیسی دلچسپی پیدا کر دیتی ہیں۔

۵۔ ڈرامائی تکنیک:

سفر نامہ اپنے آغاز سے مسلسل ارتقائی سفر کر رہا ہے۔ اس میں ہیئت، موضوع اور اسلوب کے نِت نئے تجربات کیے گئے ہیں۔ مختلف تکنیکوں کو بروئے کار لا کر سفر نامے تخلیق کیے گئے۔ افسانے اور ناول کی سی تحیر خیزی پیدا کی گئی۔ مکالمہ کی مدد سے ڈرامائی ہیئت کا تجربہ بھی کیا گیا ہے۔ جیسا کہ قدرت اللہ شہاب نے اپنے سفر نامے اے بنی اسرائیل میں میلو ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی طرح اطلاعی نوعیت کی تکنیک کو طیب علی شاکر جبل پوری نے تذکرہ سیفی میں استعمال کیا ہے۔ یہ سفر نامہ ایک الگ اور منفرد تکنیک میں ہے۔ اس سفر نامہ میں مختلف اخبارات سے اس سفر کے متعلق معلومات اکٹھی کر کے اسے مرتب کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ سفر نامہ اطلاعی نوعیت اختیار کر گیا ہے۔ اس تکنیک کے بارے میں سفر نامہ کے مرتبہ طیب علی عبدالرسول مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> اس سفر کے حالات ہم خود اپنے قلم سے نہیں لکھنا چاہتے بلکہ مختلف اخباروں کی مختلف اشاعتوں میں جو مضامین سفر مذکورہ کے متعلق شائع ہوئے ہیں ان سب کو ایک ترتیب کے ساتھ معہ ضروری نوٹوں کے ہم اس کتاب میں جمع کر دیتے ہیں اور بس۔[۱۶]

مگر اس تکنیک میں ابھی تک کم سفر نامے تخلیق ہوئے ہیں۔ یہ صنف زیادہ مستعمل نہیں ہے۔ آج کے سفر ناموں کے تکنیکی رنگ و روپ میں بہت زیادہ تنوع پیدا کیا گیا ہے۔ اس لیے اب ہمیں سفر نامہ کئی شکلوں میں ملے گا۔

۶۔ آپ بیتی کی تکنیک:

سفر نامہ میں سفر نامہ نگار کی نگاہ نہ صرف خارجی مناظر پر ہوتی ہے بلکہ اس کی باطنی زندگی بھی ہر لمحہ اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ بہت سے حالات و واقعات ایسے ہوتے ہیں جو اس کی ذات سے وابستہ ہوتے ہیں۔ وہ جب ان کا بیان

کرتے لگتا ہے تو سفر نامہ آپ بیتی میں ڈھلنے لگتا ہے اور ایسے لگنے لگتا ہے کہ یہ دونوں سگی بہنیں ہیں۔ کیوں کہ دونوں میں ادیب یا سفر نامہ نگار اپنے آپ کو براہِ راست پیش کرتا ہے جیسے سر رضا علی کا اعمال نامہ جعفر تھانیسری کا سفر نامہ کالا پانی اور حمیدہ اختر کا ہم سفر دونوں ایسی ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہیں کہ بعض اوقات حمیدہ اختر کی آپ بیتی کو سفر نامہ اور مولانا تھانیسری کے سفر نامے پر آپ بیتی کا گمان ہوتا ہے۔ بقول رحمان مذنب:

> سفر نامہ آج ادب کا قابلِ قدر اثاثہ ہے اس سے عین متصل آپ بیتی ہے۔ یہ دونوں سگی بہنیں ہیں کیوں کہ دونوں میں فن کار اپنے آپ کو براہِ راست پیش کرتا ہے اور گویا ہوتا ہے۔ اس طرح سے آپ بیتی بھی سفر نامہ ہے۔ یہ بھی ذاتی واقعات، واردات، معاملات، تجربات، محسوسات، جذبات اور نظریات کا مرقع ہوتا ہے۔ [۱۷]

۷۔ رپورتاژ کی تکنیک:

رپورتاژ اخباری رپورٹ کو کہتے ہیں۔ اس میں تخیل کی رنگ آمیزی اور خارج سے متعلق نقطۂ نظر اسے سفر نامے سے الگ کر دیتا ہے۔ حج ناموں میں سفر ناموں کی نسبت رپورتاژ کے عناصر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ممتاز مفتی کا لبیک، بلقیس ظفر کا مسافتیں کیسی اور سید انیس جیلانی مقبوضہ ہندوستان رپورتاژ کی تکنیک میں ہے۔

۸۔ فلیش بیک کی تکنیک:

کچھ سفر نامہ نگاروں نے فلیش بیک کی تکنیک کو بھی نہایت خوبصورتی اور کامیابی سے استعمال کیا گیا ہے اور یہ فلمی اور ڈرامائی تکنیک ہے جس کے سہارے مصنف ماضی کی وادیوں میں چلا جاتا ہے اور حال کے ساتھ ساتھ ماضی کی داستان بھی اپنے سفر نامے میں اس خوب صورتی سے بیان کرتا ہے کہ وہ سفر نامے کا حصہ ہی معلوم ہوتی ہے۔ اس طریقے کو فلیش بیک کہتے ہیں۔ اس سے اشفاق احمد نے اپنے سفر نامے سفر در سفر اور عرش منور، قرۃ العین حیدر دکھلائیے لے جا کے اسے مصر کا بازار، محمود نظامی کا نظر نامہ اور ممتاز مفتی نے ہند یاترا میں اس تکنیک سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ:

> اشفاق احمد کا سفر نامہ اس فلم کی طرح ہے جس میں فلیش بیک تکنیک سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ وہ ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں لیکن اگلے قدم پر ہی ماضی اس کا دامن تھام لیتا ہے۔ [۱۸]

محمود نظامی بھی اپنے سفر ناموں میں عہد رفتہ کی یادوں میں کھوئے رہتے ہیں اور اُن کا قلم بڑی روانی کے ساتھ اندرونی کیفیات و تاثرات کو پوری جزیات اور حاکمانہ قدرت کے ساتھ بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ بعض مقامات دیکھ کر

چشم تصور میں زمانوں کا فاصلہ منٹوں میں طے کر کے اہرامِ مصر پہنچ جاتے ہیں اور ایک ایک جز کو ایسے سمیٹے چلے جاتے ہیں کہ تمام واقعات پر صداقت کا گمان ہوتا ہے۔

۹۔ منظوم سفر نامے کی تکنیک:

دنیائے ادب کے بہترین سفر نامے نثر میں ہی لکھے گئے ہیں اس لیے کہ نثر تفصیل کی زیادہ متحمل ہوتی ہے اور اس کے برعکس نظم منظوم صورت میں ہوتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ منظوم سفر نامے نہیں لکھے جا سکتے بلکہ مثنوی اور مسدس کی ہیئت میں یہ سفر نامے لکھے گئے ہیں جو اس دور کی مقبول ترین صنف تھی اور کچھ حج ناموں میں نظم کی صنف کو عشق رسول ﷺ کی اظہار کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اردو کے منظوم سفر ناموں میں قلق لکھنوی کا سفر آشوب (۱۸۷۲ء)، سندھی خان صفی کا تحفۂ بنگال (۱۹۲۰ء)، ضیاء القادری بدایونی کا دیارِ نبی (۱۹۴۹ء)، واجد علی شاہ کا حزنِ اختر (۱۹۰۱ء) قابلِ ذکر ہیں۔

سفر نامے کا اسلوب:

کسی بھی ادیب و فنکار کے طرزِ تحریر یا لکھنے کے انداز کو اسلوب کہتے ہیں۔ اسلوب کسی بھی شخصیت کا اندازِ تحریر ہے جس سے لکھنے والے کی ذات کا اظہار ہوتا ہے۔ یعنی کوئی مصنف اور شاعر اپنے تخلیقی اظہار کے لیے جو انداز یا رویہ اختیار کرتا ہے وہی اس کا اسلوب کہلائے گا۔ اس طرح اسلوب سے مراد طرزِ تحریر، انداز، اظہارِ بیان، طرزِ بیان، راہ، روش، اسٹائل، رنگ وغیرہ کے ہیں۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات کے مطابق:

> اسلوب سے مراد کسی ادیب یا شاعر کا وہ طریقہ ادائے مطلب یا خیالات وجذبات کے اظہار و بیان کا وہ ڈھنگ ہے جو اس خاص صنف کی ادبی روایت میں مصنف کی اپنی انفرادیت کے شعول سے وجود میں آتا ہے اور چوں کہ مصنف کی انفرادیت کی تشکیل میں اُس کا علم، کردار، تجربہ، مشاہدہ، افتادِ طبع، فلسفۂ حیات اور طرزِ فکر و احساس جیسے عوامل مل جُل کر حصّہ لیتے ہیں اور اس لیے اسلوب کو مصنف کی شخصیت کا پرتو اور اس کی ذات کی کلید سمجھا جاتا ہے۔ [۱۹]

ہر تخلیق کار کا اپنا ایک طریقہ کار ہوتا ہے اور وہ اس پر چل کر اپنی ذات کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح ہر لکھنے والا اپنے لیے ایک الگ راہ نکالتا ہے اور اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتا ہے، اظہار کا یہی انداز و بیان اس کا اسلوب ہے۔ اسلوب کا تعلق جدت اور انفرادیت سے ہے۔ یہ جدت ہی کسی ادیب و شاعر کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہے اور

اسے ایک الگ صاحبِ اسلوب کی حیثیت سے متعارف کرواتی ہے۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے اسلوب کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

> شاعر یا مصنف قدم قدم پر پیرائیہ بیان کی آزادی کا استعمال کرتا ہے۔ پیرائیہ بیان کی آزادی کا استعمال شعوری طور پر کرتا ہے اور غیر شعوری بھی۔اس میں ذوق، مزاج، ذاتی پسند ناپسند، صنف، ہیئت کے تقاضوں نیز قاری کی نوعیت کے تصور کا بھی دخل ہو سکتا ہے یعنی تخلیقی اظہار کے ممکنہ امکانات جو وجود میں آچکے ہیں اور جو وقوع پذیر ہو سکتے ہیں ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا (جن کا اختیار مصنف کرے) دراصل اسلوب ہے۔[۲۰]

سید عابد علی عابد اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

> اسلوب دراصل فکر و معانی اور ہیئت و صورت یا مافیہ و پیکر کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔[۲۱]

اسلوب مصنف کی سوچ کا آئینہ دار ہوتا ہے بلکہ شخصیات کا تضاد اور ان کی جداگانہ حیثیت اسلوب ہی طے کرتا ہے۔ کسی بھی ادیب و شاعر کے اسلوب پر اس کا عہد بھی اثر انداز ہوتا ہے۔اسلوب کی اہمیت ادب میں بہت زیادہ ہے ایک طرح سے کسی ادب پارہ کا اسلوب سے وہی رشتہ ہے جو روح کا جسم سے۔سفر نامہ ایک ایسا نثری بیانیہ ہے جس میں سفر نامہ نگار اپنے محسوسات، مشاہدات، تاثرات اور تجربات کو تحریری صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ لہٰذا سفر نامہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ دورانِ سفر اپنی ظاہری و باطنی آنکھیں کھُلی رکھے اور گرد و پیش کا بڑی ذہانت اور باریک بینی سے مشاہدہ کر کے اپنے محسوسات کو خوبصورت زبان و بیان سے تحریر کرے۔سفر نامے میں معلومات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ سفر نامہ نگار کا اسلوب بھی اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اسلوب اس کی ذہنی کیفیات اور جذبات کا بھرپور عکاس ہوتا ہے۔اس لیے سفر نامے میں گہرا مشاہدہ اور طرزِ بیان یا اسلوب کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور وہ سفر نامے سب سے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں جو بہت خوبصورت اندازِ تحریر میں لکھے گئے ہوں۔سفر نامے میں اسلوب کی اہمیت کے متعلق ڈاکٹر روبینہ شاہین لکھتی ہیں:

> سفر نامہ چوں کہ ہر قاری کی نظر سے گزرنے والی تحریر ہے لہٰذا سفر نامہ نویس کو عام فہم اور سادہ اسلوب استعمال کرنا چاہیے۔واقعات کے بیان اور زبان پر خاص توجہ کی ضرورت ہے تاکہ عام ذہنی سطح کا آدمی اُسے پڑھ کر لطف اندوز ہو سکے۔سفر نامے کی زبان جس قدر آسان، سلیس اور عام فہم ہو گی اسی قدر سفر نامہ کامیاب تصور کیا جائے گا۔[۲۲]

سفر نامہ نگاری بھی ایک فن ہے جسے کمال تک پہنچانے کے لیے زبان و بیان کی خوبیوں کا ہونا اشد ضروری

ہے جو سفر نامے کو ادبی حُسن بخشتی ہیں۔ایک سفر نامہ نگار کا اندازِ تحریر ایسا دلچسپ ہونا چاہیے کہ قاری جب اس کی تحریر کا مطالعہ کرے تو اس کو ختم کر کے ہی دم لے۔آج کے دورِ جدید میں سفر نامہ نگاری میں بھی اسلوب کے مختلف تجربات کیے گئے ہیں۔ ہر سفر نامہ نگار نے سفر نامہ لکھنے کے لیے اپنی پسند کے اسلوب کا انتخاب کیا ہے۔ بعض سفر نامے مزاحیہ اور افسانوی طرز میں لکھے گئے ہیں۔ کچھ نے اپنے سفری تاثرات کو سوانحی پیش کش کے رنگ میں ڈھالا۔ بعض ایسے بھی سفر نامہ نگار ہیں جنھوں نے شاعری کے اسلوب کو اپنایا، صحافیانہ اسلوب کے سفر نامے بھی لکھے گئے ہیں۔

ا۔افسانوی اسلوب:

جدید سفر نامے میں اسلوب اور طرزِ بیان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بعض اوقات سفر نامہ ایسی صورتحال اختیار کر لیتا ہے جیسے سفر نامے کا سیاح سفر نامے کا ہیرو ہو اور دورانِ سیاحت ملنے والی ہر لڑکی اس پر عاشق ہے۔اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ بہت مشہور ہیں۔ وہ ایک سچے سیاح ہیں۔انہوں نے اپنے سفر ناموں میں قاری کو کمال کی خوبصورت دنیا دکھائی ہے۔ اس کا افسانوی اسلوب زندگی اور اس کی حقیقتوں سے اس قدر قریب ہے کہ ان کے سفر ناموں کی طلسماتی حصار سے نکلنا دشوار ہوتا ہے۔انھوں نے اپنے افسانوی انداز و تحریر سے سفر نامہ کی صنف کو بامِ عروج تک پہنچایا ہے۔ ان کے سفر ناموں پر افسانوں اور ناولوں کا گمان ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے سفر ناموں میں شوخی و شرارت بھی پایا جاتا ہے۔

۲۔مزاحیہ اسلوب:

سفر نامہ نگار اپنے سفر نامے میں صرف حادثات و واقعات اور خوبصورت مناظر کی منظر کشی ہی نہیں کرتا بلکہ اپنی ذات کو بھی سمو کر کہانی کا تانا بانہ بنتا ہے۔ وہ سفر نامے کو دلچسپ اور موثر بنانے کے لیے بہت سے دوسرے حربے بھی استعمال کرتا ہے۔ بعض اوقات افسانوی رنگ، شعری اسلوب اور مزاح کو شامل کر کے سفر نامے میں شگفتگی اور ہنسی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

سفر نامہ بظاہر ایک سنجیدہ صنف ہے مگر بعض اوقات سفر نامہ نگار جب زندگی کو غیر متوازن، ناہموار اور اپنے ارد گرد بے اعتدالیوں، حماقتوں کو دیکھتا ہے تو وہ اپنی ذات کو شامل کر کے مزاحیہ انداز اختیار کرتا ہے اور یوں سفر نامہ مزاحیہ رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے علاوہ جب ایک سیاح اپنی تہذیب و معاشرت کا دیگر ممالک کی تہذیب سے

موازنہ کرتا ہے تو اس کو غیر سنجیدہ انداز میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ بعض سفر نامہ نگاروں نے لطائف کا سہارا لے کر بھی شگفتگی پیدا کی ہے۔ اردو کے جن مزاح نگاروں نے سفر نامے میں مزاح کے روّیے کو برتا ہے۔ ان میں کرنل محمد خان کا بجنگ آمد، عطاء الحق قاسمی کا گوروں کے دیس میں اور شوق آوارگی، کرنل شفیق الرحمان کا دجلہ ،اختر ممونکا کا پیرس ۲۰۵ کلو میٹر ،ابنِ انشاء کا چلتے ہو تو چین کو چلئیے اور ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں پطرس بخاری کا سفر لندن وغیرہ مزاحیہ اسلوب کے حوالے سے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

پطرس بخاری کے اسلوب کے حوالے سے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

> سفر انگلستان کے متعلق پطرس بخاری کے خطوط بنام امتیاز علی تاج اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر میں ہر ہر منظر پر پھلجھڑیاں سی چھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ پطرس بخاری کے یہ خطوط سفر نامے کی روایت میں اس اعتبار سے ہمیشہ یادگار رہیں گے کہ اس کے بعد اردو سفر نامے میں مزاح کا عنصر لازم و ملزوم ہو کر رہ گیا۔ [۲۳]

اردو ادب میں سفر نامے کی صنف کو مقبول بنانے میں جہاں دوسرے ادیبوں کا ہاتھ ہے وہاں مزاح نگاروں نے ان کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ ان سفر نامہ نگاروں نے سفر نامے کو ایک خاص مزاحیہ اسلوب عطا کیا ہے۔ ان کے سفر نامے اپنے اسلوب کی شگفتگی، بیان کی بے ساختگی اور زبان کی شوخی کے اعتبار سے ایک شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے سفر ناموں میں کارٹون کے علاوہ مزاح کے دیگر حربے، تحریف، طنز، ظرافت، مقابلہ، موازنہ وغیرہ سے مزاح پیدا کیا ہے۔

۳۔ بیانیہ اسلوب:

قدیم سفر ناموں میں سیاح اپنے ارد گرد پر سرسری نظر ڈال کر صرف مناظر کی تصویریں ہی پیش کرتے تھے۔ حالات و واقعات کو بیان کرتے ہوئے اپنے جذبات و احساسات کو پس پشت ڈال کر اور خوبصورت مناظر سے خود کو خارج کر کے سفر نامے کو شہروں، تاریخ، جغرافیہ، معاشرت اور لوگوں کی بود و باش کا غیر جذباتی اور غیر تخلیقی بیان بنا دیتے تھے۔ ان کے سفر ناموں میں معروف شہروں، عمارتوں اور واقعات کا بیان زیادہ ہوتا اور باطنی احساسات اور محسوسات کا بیان، جو کہ سفر نامے کے لیے بہت اہم سمجھا جاتا ہے بہت کم عمل میں آتا تھا۔

اس عہد کے سفر ناموں میں محض شہروں کی بنیادی معلومات اور سفر کی صعوبتوں سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ تخلیقی تجربے سے ان کے دور کا تعلق بھی معلوم نہیں ہوتا۔ ان سفر ناموں کا اسلوب سادہ، سپاٹ، سنجیدہ اور معلوماتی گائیڈ بک

کا سا تھا۔ قدیم سفر نامہ نگار اپنی زیادہ توجہ معلوماتی کوائف جمع کرنے پر صرف کرتے تھے اور حقیقت، حالات و واقعات پر ذاتی تاثرات کو غالب نہیں آنے دیتے تھے۔ ان کا اسلوب سادہ اور بیانیہ کا انداز معلوماتی اور تاریخی ہوتا تھا۔ وہ صرف سفری احوال کی سر گزشت کے بیان کو ہی ضروری سمجھتے تھے اور ان احوال کو بیان کرنے کا انداز خشک اور سپاٹ نثر کا سا ہوتا تھا۔

۴۔ شعری اسلوب:

سیاح کے لیے نئی زمینیں، نئے مناظر، نئے لوگ اور نئی طرزِ بود و باش ہمیشہ سے پُر کشش اور پُر اسرار رہے ہیں۔ یہ سب اس کے لیے کسی عجائب سے کم نہیں، وہ انھیں دیکھ کر بچوں کی طرح مچلتا ہے اور تمام کیفیات کو دل پر محسوس کر کے، اس میں دوسروں کو شامل کرنے کی خاطر تخلیقی عمل سے گزرتا ہے اور اپنے ذاتی تاثرات و مشاہدات کو ادبی اسلوب کے ساتھ سفر نامے کی صورت میں پیش کر دیتا ہے۔

دوسری اصناف کی طرح سفر نامے میں بھی طرزِ تحریر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہی سفر نامہ کامیاب سمجھا جائے گا جس کا اندازِ تحریر سہل اور عام فہم ہو گا۔ ابتداء سے لے کر اب تک کے سفر نامے مختلف اسالیب میں تخلیق کیے گئے ہیں۔ جدید دور میں سفر نامے کو شعری اسلوب میں پیش کرنے کا انداز بھی نمایاں ہو ہے۔ بہت سے شاعر سفر نامہ نگاروں نے سفر نامے میں غزل کی شعری روایت کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے تاثرات کو شاعری کی معاونت سے پیش کیا ہے۔ بعض اوقات وہ بے ساختہ اور بے تکلف کیفیت میں اشعار اور مفرد مصرعے بھی لکھ جاتے ہیں اور اسی طرح کچھ سفر ناموں میں تشبیہ، استعارہ اور رعایت لفظی کو بھی خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے جیسے بلدیو مرزا کا سفر نامہ ستروگا، بشریٰ رحمن کا براہِ راست، وحیدہ نسیم کا حدیثِ دل اور جمیل الدین عالی کے دنیا مرے آگے اور تماشا میرے آگے خوبصورت شعری اسلوب کا شاہکار ہیں۔ جمیل الدین عالی بنیادی طور پر ایک شاعر بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے سفر نامون میں شعری اسلوب کا بہترین استعمال کیا ہے اور سفر نامے کے نثری اسلوب کو شعری اسلوب کا جامہ پہنایا ہے۔ جمیل الدین عالی کے شعری اسلوب کی ایک مثال ملاحظہ کیجئے۔

آگے چلو میاں برلن دکھاؤ۔ مادام کی کوئی بات سناؤ، کوئی سنسنی خیز، چٹپٹی بات یا کسی قحبہ خانہ میں لے چلو یا کوئی غزل سناؤ۔ کیونکہ

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحیٔ مئے ناب و سفینہ غزل است [۲۴]

وحیدہ نسیم کے سفر نامہ حدیث دل کے اسلوب کے متعلق مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

خواتین کے ہی کیا، جملہ حجاز ناموں میں "حدیث دل" کی انفرادیت اس کا اسلوب ہے۔ شعری لحن نے اس میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔[۲۵]

۵۔ انشائی اسلوب:

ان تمام اسلوب کے علاوہ چند ایک سفر نامہ نگاروں نے اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر سفر نامے میں دیگر اصناف کو استعمال کرنے کے شاندار تجربات کیے ہیں جیسے ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے سفر نامہ ایک طویل ملاقات کو انشائی مزاج میں تحریر کیا ہے جو نہ صرف قاری کو سفرِ ہند کی روداد سناتا ہے بلکہ اس میں وزیر آغا کی ذات کے مخفی گوشے بھی آشکار ہوتے ہیں۔

سفر نامے کی اقسام

انسان نے حیات انسانی کی مختلف جہتوں، سمتوں اور مناظرِ فطرت سے آشنا ہونے کے لیے زمانہ قدیم سے ہی سفر کیا ہے اور سفر کی تفصیل اور سفر کے حادثات و واقعات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ سفر نامہ ایک غیر افسانوی بیانیہ تحریر ہے جس میں سفر نامہ نگار اپنے محسوسات، تجربات، مشاہدات و واقعات تحریری صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ سفر نامہ میں سیاح کسی سفر، ملک اور اس کے باشندوں کی روداد کو بیان کرتے ہوئے نہ صرف اس علاقے کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتا ہے بلکہ اپنے تجربے اور مشاہدات کے بل بوتے پر نتائج اخذ کرتے ہوئے اپنی سفری تحریر کو علمیت کی رنگارنگی سے بھی ہمکنار کرتا ہے۔ سفر نامہ نگار کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی تحریر میں قاری کو وہ سب کچھ دکھادے جس سے وہ خود گزرا ہے اور دیکھا ہے۔ اس طرح کا تمام انحصار سفر کرنے والے پر ہے کہ وہ کیا دیکھتا ہے اور کیا محسوس کرتا ہے اور پھر اپنے محسوسات و مشاہدات کو دوسروں تک کیسے پہنچاتا ہے۔ تجربے کو تخلیقی عمل کا حصہ بنانے کے لیے وہ کون سا رویہ یا انداز تحریر اختیار کرتا ہے۔ اس میں ایک طریقہ تو روایتی سفر نامے کا ہے جس میں سیاح کی نظر صرف سطحی ہوتی ہے اور وہ ملکوں کا حدود اربعہ، تاریخ اور لوگوں کی طرزِ معاشرت کو بیان کرنا ہی ضروری سمجھتے ہوئے وہ بنیادی معلومات فراہم کرتا ہے جو سفری گائیڈ کی ذیل میں آتی ہیں۔

دوسرا جدید روش کو اپناتے ہوئے اس معلومات میں اضافہ کچھ یوں کرتا ہے کہ وہ اپنی باطنی کیفیات اور محسوسات کو کہانی کی صورت میں تحریر کرتا ہے۔ قدیم اور جدید کے اس فرق کے بارے میں شفیع عقیل کہتے ہیں:

> قدیم اور جدید سفر ناموں میں یہی فرق ہے کہ پہلے لکھنے والا اپنے تجربات و مشاہدات کو بنیاد بنا کر نئی نئی معلومات فراہم کرتا تھا لیکن اب جو سفر نامے لکھے جا رہے ہیں ان میں نئی نئی معلومات دینے کی بجائے مصنف اپنی مرضی اور پسند کے واقعات رقم کرتا ہے اور حقائق کو افسانے کی آمیزش سے پیش کرتا ہے۔[۲۶]

جدید سفر نامہ اپنے اندر متنوع کیفیات رکھتا ہے اور اس میں جمود کی بجائے حرکت کی کیفیت ملتی ہے۔ جدید سیاح اپنے شوقِ آوارگی میں ملکوں ملکوں اور قریہ قریہ گھومتا ہے اور وہاں سے معلومات اکٹھی کرنے کی بجائے اپنی ذات کی پہچان کے ساتھ ساتھ کائنات کے بھید بھی جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ جن جگہوں سے گزرتا ہے ان کو اپنی روح میں اس طرح سموتا ہے کہ سفر نامہ نگار اور شہر الگ الگ نظر نہیں آتے جیسے محمود نظامی نے اپنے سفر نامہ نظر نامہ میں لکھتے ہیں کہ میں بہت سے شہروں سے گذرتا ہوں مگر کچھ شہر ایسے ہیں جو میرے دل سے گذرے پھر سفر نامہ نگار اور شہر دوئی کی بجائے اکائی بن جاتے ہیں۔ ابتدائی سطح پر ہم سفر نامے کو دو قسم قدیم اور جدید سفر نامہ میں بانٹ سکتے ہیں۔ قدیم سفر نامہ نگاروں کی نظر اشیاء کی خارجی اور سطحی پہلوؤں پر رہتی ہے اور جدید سفر نامہ نگار اپنے باطن میں جھانکنے کے ساتھ ساتھ کائنات کے رازوں کو بھی فاش کرتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا سفر نامے کی اقسام کے بارے میں لکھتے ہیں:

> سفر نامے کئی طرح کے ہوتے ہیں مثلاً ایک قسم روایتی سفر نامے کی ہے جس میں سفر کرنے والا صرف ملک کا جغرافیہ بیان کرتا ہے۔ موسم کا حال، میدانی اور پہاڑی مناظر، آدابِ معاشرت حاکم وقت کے خدوخال اور اگر وہ بیسوی صدی کا سفر نامہ نگار ہے تو غسل خانوں اور ہوٹلوں کا حال، مشروبات کی قلت یا فراوانی ہر قسم کے شعار کی جملہ تفاصیل اپنے سفر نامے میں سمیٹ لیتا ہے جس میں سفر نامہ نویس جغرافیہ کی بجائے صرف ملک کی تاریخ سے سروکار رکھتا ہے اور سُنے سنائے قصوں کے اظہار مکرر میں لطف محسوس کرتا ہے۔[۲۷]

اس طرح سفر نامے کو صفات کے اعتبار سے دو حصوں قدیم اور جدید میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول الذکر میں صرف خارجی معلومات ہوتی ہیں اور آخر الذکر میں ذاتی کیفیات اور احساسات کا اظہار۔ سفر نامہ میں طریقِ اظہار کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر کوئی صاحب طرزِ ادیب و شاعر سفر نامہ لکھتا ہے تو وہ اپنے طرزِ بیان سے اس میں ایک ادبی شان پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر سفر نامہ لکھنے والا اس خوبی سے عاری ہو تو پھر اس کے اندازِ تحریر میں وہ بات پیدا نہیں

ہوتی۔ ہر سفر نامہ اپنے لکھنے والے کا آئینہ دار ہوتا ہے جیسا مصنف ویسا ہی اس کا سفر نامہ۔ یہ صنف اپنے اندر کافی وسعت رکھتی ہیں۔ اس میں ہیئت اور اسلوب کے تجربات کیے گئے اور یہ بہت سی اقسام میں لکھے گئے ہیں۔ اس کے متعلق ڈاکٹر مرزا حامد بیگ رقم طراز ہیں:

> سفر نامے کی دو قسمیں ہوں گی۔
>
> ا۔ادبی سفر نامہ
>
> ۲۔ محض سفری احوال
>
> اس دوسری قسم میں مزید تین اقسام کے سفر نامے دکھائی دیتے ہیں۔
>
> ا۔ محض معلومات فراہم کرنے والے غیر تخلیقی انداز کے سفر نامے۔
>
> ۲۔ نجی یادداشتوں کے مماثل سفر نامے، جو آپ بیتی کا خام مواد بن سکتے ہیں۔
>
> ۳۔اخبارات وڈرائنگ روم رسالوں کا پیٹ بھرنے والے چلنتر قسم کے سفر نامے۔ [۲۸]

ادبی سفر نامہ ایک تخلیقی بصیرت رکھنے والا ہی تخلیق کر سکتا ہے مگر غیر ادبی سفر نامہ ایک سفری رپورٹ یا سفری روداد ہو گی۔ جیسے کوئی سفر کرنے والا سیاح لکھ سکتا ہے۔ بہت سے قدیم سفر نامے صرف معلومات فراہم کرنے کی غرض سے لکھے گئے ہیں جیسے مولانا شبلی نعمانی کا سفرنامہ روم و مصر و شام اور محمد حسین آزاد کا سفرنامہ ایران ہے۔اس حوالے سے مولانا شبلی نعمانی اپنے سفر نامے میں لکھتے ہیں:

> سفر نامہ میں جس قسم کی اطلاعیں لازمی اور ضروری ہیں یعنی ملک کی اجمالی حالت، انتظام کا طریقہ، عدالت کے اصول، تجارت کی کیفیات، عمارتوں کے نقشے،ان میں سے ایک چیز بھی سفر نامہ میں نہیں البتہ معاشرت اور علمی حالت کے متعلق متعدد بہ واقعات ہیں۔ اگرچہ وہ بھی اس تفصیل کے ساتھ نہیں ہیں جس قدر ہونے چاہیئے۔ [۲۹]

ہمارے ادب میں سفر نامہ کی صنف عربی اور فارسی سے آتی ہے۔ قدیم دور کے سفر نامے انہی اصول وضوابط پر لکھے گئے اور صرف سیاسی، تجارتی، تمدنی حالت کے ساتھ ساتھ تاریخی عمارتوں کے نقشہ جات اور ملکوں کی صورت حال کے بارے میں بیان کرنا ہی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس نقطۂ نظر سے سفر نامے کی بنیادی دو ہی اقسام قرار پائی ہیں مگر اس ذیل میں ڈاکٹر قدسیہ قریشی انیسویں صدی کے حوالے سے سفر ناموں کو چار سمتوں میں کچھ یوں تقسیم کرتی ہیں۔

ا۔ یورپ کے سفر نامے

۲۔ مذہبی سفر نامے

۳۔ مشرقی سفر نامے

۴۔ مقامی سفر نامے

> انیسویں صدی کے سفر ناموں کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا تاکہ مختلف سفر ناموں کی تحریر کے اسباب اور ان کی اہمیت کو اچھی طرح واضح کیا جا سکے۔ اس تقسیم کے علاوہ سفر ناموں کو ادوار یا تاریخی ترتیب کے لحاظ سے بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں یہ دشواری تھی کہ مختلف مقامات کے سفر سے متعلق متعدد سفر ناموں کے بیان اور مباحث میں غیر ضروری تکرار اس حد تک بڑھ جاتی جو کہ ناگوار ہو سکتی تھی۔ اس لیے موضوع کے اعتبار سے ان کی تقسیم کو فوقیت دی گئی ہے۔ [۳۰]

سفر نامہ اپنے اندر متنوع کیفیات اور وسعت رکھتا ہے۔ اس میں حرکت و عمل کا پہلو ہونے کے ساتھ ساتھ علاقائی جزیات کو بھی سمویا جاتا ہے۔ معلومات کی فراہمی کے ساتھ اگر یہ باطنی کیفیات کا بھی ترجمان ہے تو ایسا سفر نامہ ادبی کہلائے گا۔ شروع شروع میں سفر نامہ محض تاریخی اور جغرافیائی معلومات فراہم کرنے والا ایک کتابچے کی حیثیت رکھتا تھا لیکن رفتہ رفتہ یہ اپنی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے اور باقاعدہ و مقبول صنف کی صورت اختیار کر لی ہے اور اب سفر نامہ کا میدان بہت وسیع ہے اور اس میں کئی موضوعات اور جہتوں میں بڑے عمدہ سفر نامے تخلیق کیے گئے ہیں۔ موضوعات کے حوالے سے بھی اس کی درجہ بندی کی جا سکتی ہے جیسا کہ

۱۔ سیاسی

۲۔ مذہبی

۳۔ تاریخی

۴۔ جغرافیائی

۵۔ تحقیقی نوعیت کے سفر نامے

سفر نامے کی اقسام کے بارے میں محمد برکت علی اپنے مضمون سفر نامہ ادب کا ایک حصہ میں لکھتے ہیں کہ

> اردو ادب میں جو سفر نامے آزادی کے بعد لکھے گئے ہیں انہیں بآسانی تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔
>
> اول: روایتی سفر نامے جن میں سفر نامہ نگار جغرافیہ اور تاریخ کے کوائف جمع کرتا ہے۔ موسموں کا حال اور مناظر کی کیفیت پیش کرتا ہے۔ سیاست اور بازار کے اتار چڑھاؤ کا گوشوارہ بناتا ہے اور یوں قاری کو ایک ایسی رہنما کتاب مہیا کر دیتا ہے جسے ہاتھ میں لے کر وہ آسانی سے بھاٹی گیٹ سے ایفل ٹاور تک سفر کر سکتا ہے۔

دوم : محسوساتی سفر نامے جن میں سفر نامہ نگار نہ صرف آنکھیں کھلی رکھتا ہے بلکہ داخل کی تیسری آنکھ کو دیکھنے کی دعوت بھی دیتا ہے اور یوں معروضی حقیقت کے ساتھ موضوعی حقیقت کو بھی آشکار کرتا ہے۔

سوم : اول الذکر دو اقسام کے سفر نامہ نگار حقیقت کو سیدھی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور سچائی سے پیش کر دیتے ہیں۔

مزاح نگار منظر کو قدرے ٹیڑھی آنکھ سے دیکھتا ہے اور دانستہ طور پر اس کا مضحکہ خیز پہلو ابھارتا ہے۔ اس قسم کے سفر نامے زیادہ تر کالم نگاروں نے لکھے ہیں۔ [۳۱]

سفر نامہ بہت سی اقسام میں لکھا جاتا رہا ہے۔ ہر سفر نامہ نگار نے اپنی افتادِ طبع کے مطابق اس میں رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کو معلوماتی بنانے کے علاوہ اپنے جذبات کی رو میں بہہ جانے کے مناظر کو بھی قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ رحمن مذنب سفر نامے کی اقسام کے بارے میں لکھتے ہیں:

سفر ناموں کی کئی اقسام ہیں۔ ہر سفر نامہ اپنے لکھنے والے کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے جیسا مصنف ویسا سفر نامہ۔ ایک سفر نامہ ایسا بھی ہے جو سب سے الگ ہے۔ اس میں سفر کی نوعیت اور غایت بھی سب سے مختلف ہوتی ہے۔ اسے حج نامہ کہتے ہیں۔ [۳۲]

ب۔ سفر ناموں کی اہمیت:

ا۔ ادبی اہمیت:

سفر نامے میں مشاہدے کی ضرورت زیادہ پائی جاتی ہے۔ جس شخص کا مشاہدہ جتنا وسیع ہو گا وہ اتنا ہی عظیم ادب تخلیق کرے گا۔ سفر نامہ نگار جن کیفیات سے خود دوچار ہوتا ہے اور نظریں جن مناظر کو اپنے اندر جذب کرتی ہیں۔ ان تمام حالات و واقعات میں شریک کرتا ہے۔ سفر نامے اپنے اندر لطف و حسن کے علاوہ دلچسپ معلومات، حادثات و واقعات، ضروری اور غیر ضروری تفصیلات کی کافی گنجائش رکھتے ہیں۔ ان کے ذریعے ہمیں ملکوں، قوموں، انسانوں کا رہن سہن، جغرافیائی اور تاریخی حالات و واقعات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

سفر نامہ کو اردو ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ دوسری اصناف کی مانند اس میں بھی تخلیقی تجربات کی کارفرمائی پائی جاتی ہے۔ قدیم سفر نامے صرف خارج کا بیانیہ ہوتے تھے مگر اب سفر نامہ ایک تخلیقی ادب میں شمار ہوتا ہے۔ سفر نامہ دنیا کے ہر ادب کی ایک مستقل صنف ہونے کے ناطے سے کچھ بنیادی تقاضے رکھتا ہے جو اسے دوسرے

اصناف سے الگ کرتا ہے۔ پہلی یہ کہ جو کچھ بیان کیا گیا ہو سیاح اس سے خود بھی گزرا ہو اور جب وہ بیان کرے تو اس سے وہی لطف حاصل ہو جو کسی ادب پارے کی نثر کے مطالعے سے ہوتا ہے۔

سفر نامہ میں احساسات و جذبات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ خارجی واقعات اور معاشرتی حالات کی تصویر کشی بھی پائی جاتی ہے۔ ان تمام لوازمات نے سفر نامے میں ایک ادبی ستان پیدا کر دی ہے اور یہ اہم ترین نہیں صرف اہم ادب کی ایک اہم صنف مانا جاتا ہے۔ سفر ناموں میں سفر نامہ نگار جہاں اپنی روداد سفر کو بیان کرتا ہے، وہاں اس ملک کے لوگوں کی تہذیب و معاشرت، رہن سہن، جغرافیائی حالات اور علم و ادب کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کسی ملک کی ادبی تحریکوں، وہاں کے ادبی مباحثوں اور مشاعروں کے بارے میں بھی تفصیل مہیا کرتا ہے۔

رئیس احمد جعفری سفر نامے کی ادبی اہمیت یوں بیان کرتے ہیں:

> سفر نامہ علمی و ادبی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ واحد ادب ہے جس کا تقریباً تمام اہم معاشرتی علوم سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ مورخوں، سوانح نگاروں اور جغرافیہ دانوں نے اس صنف سے بہت فائدہ اٹھایا ہے اور اسی وجہ سے دنیا کی تمام بڑی چھوٹی زبانوں کے ادبیات میں سفر ناموں کو ایک بہت اہم مقام حاصل ہے۔ [۳۳]

اس طرح اس بات سے قطعی انکار ممکن نہیں ہے کہ ملکوں کے سیاسی اتار چڑھاؤ اور انقلاب کا اثر وہاں کے سماجی، اقتصادی، ثقافتی، معاشرے اور ادب پر بھی پڑتا ہے اور یہ تمام تبدیلیاں اور تاریخی واقعات کا احوال سفر ناموں میں پایا جاتا ہے۔ اس حوالے سے سفر ناموں کی نہ صرف تاریخی اور سماجی اہمیت ہے بلکہ ادبی اور معاشرتی اہمیت بھی مسلم ہے۔ مولانا شبلی نعمانی کا سفر نامہ روم ومصر و شام اور محمد حسین آزاد کا سیر ایران کی ادبی اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر قدسیہ قریشی لکھتی ہیں:

> ان کے سفر نامہ کی اہمیت صرف سفر نامہ کی حیثیت سے جو کچھ ہے وہ ہے ہی لیکن اس سے بھی زیادہ اس سفر نامہ کی ادبی اہمیت ہے کیونکہ مولانا نے اپنے سفر نامے میں سفری حالات و واقعات کے علاوہ وہاں کی ادبی تحریکوں کا بڑا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ان کے سفر نامے کی علمی اور ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ [۳۴]

ناول اور افسانے کے بعد سفر نامہ اب مقبول ترین صنف ادب بن چکا ہے۔ دیگر اصناف کی طرح سفر نامہ

نگاری بھی ایک فن ہے جسے کمال کی بلندیوں تک پہنچانے کے لیے زبان و بیان کی خوبیوں کا ہونا بھی اشد ضروری ہے۔ دلچسپ انداز و بیان سفر نامے کو ادبی حسن بخشتا ہے۔ بقول رفیع الدین ہاشمی:

> سفر نامے کی عمدگی اور خوبصورتی دو باتوں پر منحصر ہوتی ہے۔ ایک واقعات سفر کی نُدرت و جدت اور دوسرے انداز و بیان میں تازگی، دلچسپی اور مقبولیت کے لحاظ سے ایک معیاری سفر نامہ ناول اور افسانے سے کسی بھی طرح کم نہیں۔ دور جدید میں اردو اصناف نثر میں سفر نامہ ایک امتیازی اور منفرد صنف کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ [۳۵]

سفر ناموں سے کسی خطے کے لوگوں کی سماجی، اخلاقی، مذہبی، زندگی کے ساتھ ساتھ وہاں کے علمی ادبی رجحان کا بھی پتہ چلتا ہے۔ سفر نامے کی ادبی اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید یوں رقم طراز ہیں:

> سفر ناموں میں شخصیتوں کی تصویریں ہی نہیں ابھرتیں بلکہ علمی و ادبی مجالس کا حال واحوال اور مختلف علاقوں کی ادبی صورتحال بھی نظر آتی ہے۔ یوں ان کا سفر نامہ، "احباب نامہ"، "محبت نامہ" اور "عقیدت نامہ" ہونے کے ساتھ ادب نامہ بن جاتا ہے۔ [۳۶]

۲۔ سماجی اہمیت:

سفر ناموں کی سب سے بڑی سماجی اہمیت یہ ہے کہ معاشرے کے بارے میں جو چیزیں اور واقعات بڑی بڑی کتابوں میں نہیں، مختلف سفر ناموں میں ان کے بارے میں تفصیلات مل جاتی ہیں۔ سفر نامہ اپنے عہد کی خاص رسم و رواج، تہذیب و معاشرت، شادی بیاہ کی رسومات، آداب و اخلاق، نشست و برخاست، سب کے بارے میں اپنے پورے سیاق و سباق کے ساتھ پیش کر دیتا ہے۔ وہ جس واقعہ کو جس انداز سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، پیش کر دیتا ہے۔ اس طرح سفر نامہ سیاسی و سماجی، تہذیبی و تمدنی حالات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ پروفیسر تنویر حسین سفر نامہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> سفر نامہ نگار اپنے ملک کی سیر و سیاحت کرے یا بیرون ملک کاروبار، سیاحت اور تعلیم کے لیے جائے تو اپنے دوران سفر پیش آنے والے حالات و اقعات کو اس ملک یا خطے کے جغرافیائی، تاریخی، سماجی، تہذیبی، اور ثقافتی پس منظر میں پیش کرے۔ [۳۷]

تنویر حسین کے اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سفر نامے کے لیے ضروری اصول کون سے ہونے چاہئیں۔ ان کے مطابق سفر نامہ میں ملکوں کی اقتصادی، تاریخی، جغرافیائی حدود کے متعلق اور سماجی و تہذیبی حالت کے بارے میں بھی مفصل بیان ہونا چاہیے۔ اس طرح تمام قدیم سفر نامے زیادہ تر اسی طرز پر لکھے گئے ہیں۔ عجائبات

فرنگ میں یورپ کی تہذیب و معاشرت کے متعلق یوسف کمبل پوش نے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اسی طرح سفر ناموں کی سماجی اہمیت کے لحاظ سے ابن بطوطہ کا سفر نامہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ چودھویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا اور اس نے اپنے سفر نامے میں ہندوستان کی تہذیبی اور معاشرتی حالات کے بڑی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ مولوی عبیدالرحمان خان، ابن بطوطہ کے سفر نامے کی سماجی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

> وہ مختلف علوم و فنون میں دستگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ نگاہِ دور بین رکھتا تھا۔ اس لیے وہ جہاں بھی کہیں گیا، وہاں کے سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی حالات کا مطالعہ بڑی دقیقہ رسی کے ساتھ کیا۔ وہ کہیں بادشاہوں کے دربار میں اعزاز واکرام کی بڑی کرسی پر نظر آتا ہے تو کبھی بڑی صوفیائے کرام کی مجلس و جدو حال میں شریک دیکھا جاتا ہے۔ اس بناء پر اس کا سفر نامہ جہاں بے حد دلچسپ اور دل آویز ہے وہاں پر نایاب اور بیش قیمت معلومات کا گنجینہ بھی ہے۔ ان میں بھی بہت سے معلومات ایسی ہیں جو کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ [۳۸]

اس طرح دوسرے بہت سے چینی، فرانسیسی عرب سیاح ہندوستان میں آئے اور انھوں نے اپنے سفر ناموں میں یہاں کے تاریخی، تمدنی، جغرافیائی، معاشرتی اور تہذیب کے بارے میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ابتداء سے ہی ہندوستان اپنے مخصوص تہذیب و تمدن کے سبب غیر ملکی سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی فرانسیسی سیاح ڈاکٹر ''برنئیر'' کے سفر نامہ کی اہمیت کے ضمن میں کہتی ہیں:

> ڈاکٹر برنیر فرانسیسی سیاح ۱۶۵۵ء میں اورنگزیب کے عہد میں ہندوستان آیا۔ برنیر نے شاہجہان، دارا اور اورنگزیب کے حالات لکھنے میں اپنا زور قلم خوب صرف کیا۔ وہ فلسفہ کا عالم تھا، اس نے ہمارے ملک کے حالات کا جائزہ لیا اور اپنے سفر نامہ میں تمام حالات کا تفصیلی ذکر کیا ہے، مغل عہد کی داستان بیان کی ہے۔ مذہبی، تہذیبی، تمدنی، معاشرتی، علمی، فنی، غرض ہر پہلو کو بڑی وضاحت سے قلمبند کیا، کچھ اندرونی حالات، شہزادوں کا معاشقہ اور انکی رنگ رلیاں، رؤوسا اور امراء اور عمائدین شہر کی رنگ رلیاں بھی بیان کی گئی ہیں۔ ملک کی تجارت اور پیداوار کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ [۳۹]

سفر نامے کسی بھی ملک کے سماج کی اہم دستاویز ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعے ایسی معلومات ملتی ہیں جو کسی اور کتب میں اتنی تفصیل کے ساتھ ہی نہیں ملتی۔ معاشرے میں موجود ایک چیز کی عکاسی میں سفر نامے کا کوئی ثانی نہیں جیسا کہ مغلوں کے عہد کی شان و شوکت، ان کا اپنی رعایا کے ساتھ برتاؤ اور اس عہد کی رسومات حتیٰ کہ لوگوں کی ترجیحات اور پسند ناپسند کے بارے میں جاننے کے لیے اس عہد کے سفر ناموں کا مطالعہ بڑا ناگزیر ہے۔

قدیم سفر ناموں میں موجود معلومات کسی لگی لپٹی اور مبالغے سے مبرا ہوتی ہیں اور جس طرح سفر نامہ، تاریخ، جغرافیہ، سماجیات، ادب، صنعت و حرفت، سیاست، معاشیات، مذہب وغیرہ سب کا احاطہ بڑی دل آویز زبان و بیان کے ساتھ کرتا ہے اسی طرح ہر شعبۂ زندگی کے بارے میں معلومات کسی ایک کتاب میں ملنا ممکن نہیں ہوتی۔ سفر نامے میں کسی خطے یا ملک کی تہذیب و معاشرت کی ایسی جاندار عکاسی کی گئی ہوتی ہے کہ جسے پڑھ کر وہاں کے لوگوں کے رہن سہن، رسم و رواج اور ان کی طرزِ زندگی سے آشنا ہوتے ہیں مگر ان تمام کو بیان کرنے کے لیے سفر نامہ نگار کے پاس مشاہدے کی گہرائی اور گہرائی کا ہونا بہت ضروری ہے وہ جتنا باریک بین ہوگا اتنا ہی گردو پیش کی منظر کشی کرنے پر قادر ہوگا اور اس کے پاس حسن و قبیح کو پرکھنے کی آنکھ ہو کہ جس تجربات و مشاہدات سے وہ خود گزرا ہے، قاری کو بھی اس میں شامل کرے۔ سفر نامے کی سماجی اہمیت کے متعلق آغا محمد طاہر سیر ایران کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> سفر ناموں میں انسانی زندگی کے ان گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو تاریخ، ادب اور جغرافیہ کی دوسری کتابوں میں تاریک چھوڑ دیئے گئے ہیں جیسے معاشرتی طور طریق، رواج و عقائد، مذہبی تعلقات، تجارتی و صنعتی خصوصیات، فرقے، زبانیں، شکل و صورت سفر ناموں کی ایسی خصوصیات ہیں جس نے اسی کو جغرافیہ کی دوسری کتابوں سے منفرد کر دیا ہے۔ [۴۰]

سفر نامے معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ فراہم کرتے ہیں۔ ان کے ذریعے لوگوں کا معیارِ زندگی، عادات، عمارتوں کی بناوٹ، مذہبی تہواروں کا ذکر، کسی ایک علاقے یا ملک کی سماجی زندگی کا نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ یوسف کمبل پوش اپنے سفر نامے میں مصر کی سماجی زندگی اس طرح پیش کرتے ہیں۔

> ستیسویں تاریخ فروری ۱۸۳۸ء کے بموجب رسم اس ملک کے ہم گدھے پر سوار ہوئے اور عنایت پر نکل صاحب سے ایک چوب دار بادشاہی راہ بتانے کے لیے ساتھ لے کر بازار کا تماشا دیکھنے چلے۔ ہر ایک دوکان اور تنگی راہ وہاں کی اور خرید و فروخت اشیاء کی مثل بنارس کے تھی، مگر ساخت بازار میں البتہ صورت دوسری یعنی یہاں درمیان دوکانوں کے چھپّر گھاس پھوس کا ڈالا ہے، بہ سبب اس کے مینھ اور غبار سے صحن بازار کا بچتا ہے۔ دوکانیں حلوائیوں اور باورچیوں کی مانند، دوکانوں ہندوستان کے آباد نان بائیوں کی دوکان پر ترک و عرب روٹی کھا رہے تھے۔ دل شاد، چھوارا، بیچنے والے دوکانوں پر بیٹھے چھوارہ بیچتے تھے، مکھیوں کے ان پاس ہجوم تھے۔ [۴۱]

۳۔ تمدنی اہمیت:

سفر ناموں کی تہذیبی اور تمدنی اہمیت بھی مسلم ہے۔ سفر ناموں سے بہت سے ایسے حالات و واقعات، رسم

رواج، آداب و اخلاق لوگوں کا آپس کا میل ملاپ، رکھ رکھاؤ، لوگوں کا سیاسی اور سماجی نقطہ نظر کا علم ہوتا ہے جو عام کتابوں میں نہیں ملتے۔ ان تمام کو سفر نامہ نگار اپنے نقطۂ نظر سے پیش کرتا ہے۔

تمدن کسی خطے یا ملک میں انسانوں کے مل جل کر رہنے کے طریقے، طرز معاشرت اور کسی نظام کے تحت زندگی گزارنے کا نام ہے۔ انسائیکلوپیڈیا میں تمدن موروثی فنی کارناموں، تکنیکی طریقوں، تصورات، عادات، اور قدروں پر مشتمل ہے۔

سفر ناموں میں سیاح نگری نگری گھوم کر اپنے تجربات و مشاہدات کو بیان کرنے ساتھ ساتھ لوگوں کی زندگی کے ہر ایک زاویے کو بغور مشاہدے اور تجزیے کے بعد بیان کرتا ہے۔ وہ چھوٹے سے چھوٹے واقعے اور طرزِ معاشرت کو سفر نامے میں لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس طرح سے قاری سیاح کے تجربات میں شامل ہو کر اور اس خطے کے لوگوں کے رہن سہن سے آشنا ہو کر لطف محسوس کرتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ:

> سفر نامہ محض سیاح کے ذوق سفر کو ہی آسودہ نہیں کرتا بلکہ یہ رنگ، نسل، زبان، اور عقیدے کے اختلاف کے باوجود ایک ملک کو دوسرے ملک سے اور ایک انسان کو دوسرے انسان سے متعارف کرانے اور ان کے درمیان پل تعمیر کرنے کا وسیلہ بھی ہے اور اس سے کسی ملک کی جغرافیائی، تاریخی، تہذیبی اور تمدنی معلومات بھی حاصل ہو سکتی ہیں۔ [۴۲]

سفر نامہ کے ذریعے کسی ملک یا شہر کے بارے میں حتیٰ کہ وہاں کی زبان و ادب، مذہبی رجحان، تہذیب، و معاشرت، وہاں کا تمدن، لوگوں کے عقائد وغیرہ کے بارے میں حالات کا علم ہوتا ہے۔ سفر نامہ نگاروں نے اپنی طبع کے مطابق مختلف زاویوں سے حالات کا جائزہ لیا اور کسی نے تاریخی پہلو اور کسی کے ملک کے جغرافیے کو اور کسی نے عمارتوں، بازاروں، سڑکوں کو اور کسی نے تہذیب و معاشرت کو بیان کرنے کو اہمیت دی اس طرح سفر نامہ معلومات کی فراہمی کا عمدہ وسیلہ ہے۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی سفر نامے کی تمدنی اہمیت یوں بیان کرتی ہیں:

> ہر زبان کے ادب میں سفر ناموں یا سیاحت ناموں کی ایک خاص اہمیت رہی ہے۔ یہ وہ صنف ادب ہے کہ جو معلومات بھی بہم پہنچائی ہے۔ بصیرت بھی دیتی ہے اور پڑھنے والے کو تخلیقی ادب کا لطف بھی اور انبساط بھی فراہم کرتی ہے۔ اس کے ذریعے قاری دنیا کی دوسرے قوموں کے تہذیبی، جغرافیائی اور تمدنی حالات کی آگاہی حاصل کر کے انسانی فطرت کی وسعتوں سے آشنا ہوتا ہے۔ [۴۳]

سفر نامے کے ذریعے قاری گھر بیٹھے دوسری قوموں اور دوسرے خطوں کی سیر سے محظوظ ہوتا ہے۔ وہ سیاح کے ساتھ ساتھ ان نظاروں اور سڑکوں پر گھومتا ہے جو حقیقت میں اس کی دسترس سے دور ہیں۔ سفر نامہ نگار دو طرح

سے قاری پر احسان کرتا ہے۔ ایک تو اس طرح کہ وہ اپنی انگلی پکڑا کر قاری کو ان پہاڑوں، آبشاروں اور بازاروں میں گھوماتا ہے یہاں وہ خود سیاحت کے مزے لیتا رہا ہے اور دوسرا وہ اُس لطف و سرور میں شامل کرتا ہے جس سے وہ خود دو چار ہوا تھا۔

سفر ناموں کے ذریعے زندگی کے تمام شعبوں کے بارے میں معلومات ملتی ہے کیونکہ سیاح اپنا بہت سا وقت لوگوں کے درمیان گھومتا پھرتا ہے اور وہ نظام حکومت کا جائزہ لیتا ہے۔ حکمران وقت کا اپنی رعایا کے ساتھ سلوک، دینی نظریات، علماء اور بزرگانِ دین کی تعلیمات کا پرچار بھی کرتا ہے۔ سفر نامے میں بہت سے واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے وہاں کی تہذیب و تمدن کا پتہ چلتا ہے نواب لیاقت جنگ بہادر کا سفر نامہ یورپ و امریکہ سے اقتباس ملاحظہ ہے:

> مجھے امریکن لوگ طبیعت سے خشک معلوم ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دولت کی وجہ سے ان میں رعونت آگئی ہے اور ہر وقت دولت پیدا کرنے اور کاروبار کو آگے بڑھانے کی فکر میں رہتے ہیں اس لیے مروت کا فقدان ضروری ہے۔۔۔ سفید فام عورتیں جہاں کتوں سے انتہائی محبت رکھتی ہیں۔ انکے مرد حبشیوں سے کتوں سے بھی بدتر برتاؤ کرتے ہیں۔ [۴۴]

سفر نامے کسی معاشرے کی بود و باش لوگوں کے رہن سہن اور ان کی روایات و عقائد کو جاننے میں بڑی مدد فراہم کرتے ہیں۔

۴۔ علمی اہمیت:

علم حاصل کرو خواہ تمھیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ علم کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ انسان مہد سے لحد تک جاننے کے عمل سے گزرتا رہتا ہے۔ سفر نامہ بھی ایسی صنف ہے کہ جاننے کی جستجو سیاح کو ملکوں ملکوں، قریہ قریہ گھومنے پر مجبور کیے رکھتی ہے اور سیاح اپنی اسی عادت کی وجہ سے کبھی ایک جگہ ٹھہر نہیں پاتا۔ وہ اپنی دور بین نگاہوں سے کائنات کا مشاہدہ کر کے اپنے واقعات اور جذبات میں دوسروں کو شریک کرتا ہے۔ وہ جہاں جہاں سے گزرتا ہے اس کو اپنے دل پر نقش کر لیتا ہے اور دوسرے ملکوں اور دوسرے لوگوں کی ایک ایک بات کو دوسرے لوگوں تک پہنچانے کو فریضہ سمجھ کر اچھی بری باتوں کو بیان کر دیتا ہے۔ اس کے اس عمل سے حالاتِ حاضرہ اور واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ جس سے ان جگہوں اور حالات و واقعات سے دوسرے لوگ بھی واقف ہو جاتے ہیں اور اس سے انکے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی مذہبی سفر ناموں کی علمی اہمیت بیان کرتی ہیں:

مذہبی سفر ناموں کی تعلیمی اہمیت بھی ہے۔ ان سے ایک طرف مذہبی تعلیمات حاصل ہوتی ہیں اور دوسری طرف متعلقہ ممالک کی زندگی سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ کیوں کہ جو بھی حج کر کے آتا ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ میں اپنے خیالات اپنے تجربات دوسروں تک پہنچاؤں، چونکہ یہ سفر نامے مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان میں سب سے پہلے مذہب کے بارے میں لکھا جاتا ہے۔ حج اور اس کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ حج، عمرہ، اور تمام ارکان حج کی تفصیلات ان سفر ناموں میں مل جاتی ہے۔ بعض سفر ناموں میں دعائیں بھی لکھی ہوئی ہیں۔ مذہبی سفر نامے دنیاوی اور دینی دونوں لحاظ سے مفید اور اہم ہیں۔ [۴۵]

سفر نامہ داستانی ادب کی پیداوار ہے۔ داستان کا ہیرو سالوں کسی نہ کسی مہم پر محو سفر رہتا تھا اور راستے میں پیش آنے والی ہزار ہا مشکلات اور حادثات سے نبرد آزما رہنے کے بعد اپنی منزل کو پاتا تھا اور پھر ہنسی خوشی وطن لوٹ آتا تھا۔ ایک طرح سے داستان بھی سفر نامہ ہی ہے مگر دونوں فنی لوازمات مختلف ہیں۔ دونوں کے اصول یکسر الگ الگ ہیں۔ اصول خواہ کچھ بھی ہوں، دونوں میں سفر کی روداد بیان کی جاتی ہے۔ سیاح یا مسافر سفر سے واپسی کے بعد زبانی یا تحریری طور پر اپنے تجربات اور مشاہدات میں دوسروں کو شامل کرنے کی غرض سے سفر کی روداد بیان کرتا ہے تاکہ دوسرے لوگ بھی دیس پردیس کے شہروں، ادیبوں، عالموں، کتابوں، مجلسوں، تعلیمی اداروں اور علمی وادبی مباحثوں سے واقف ہوں۔ سفر نامہ نگار اپنی مباحث بھی بیان کرتا ہے جسے پڑھ کر قاری کے علم میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ ان دیکھے دیسوں کی سیر اور بہت سے لوگوں سے سفر نامے کے ذریعے ملاقات کر کے خوشی محسوس کرتا ہے۔ سفر نامہ نگار جب کسی ملک کی سیاحت پر ہوتا ہے تو وہ صرف مناظرِ قدرت کا ہی مشاہدہ نہیں کرتا بلکہ وہاں کی علمی، ادبی، فنی اور صنفی اداروں کے بارے میں بھی معلومات جمع کرتا ہے۔ اس طرح سفر نامہ صرف محض حالات سفر ہی پیش نہیں کرتا بلکہ معلوماتی اور علمی صحیفہ بھی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی لکھتے ہیں:

> قدیم سیاح بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے دور دیس کے کوچہ و بازار کی رونق عجائب و غرائب، جغرافیائی اور تاریخی نوادر اور معاشی کیفیات کی تفصیل قلم بند کرتے تھے۔ پڑھنے والے ان کے تفصیلی بیان سے گھر بیٹھے جغرافیہ اور تاریخ دونوں سے بھرپور استفادہ کر لیتے تھے۔ لیکن اب یہ ساری تفصیل عام ہو گئی ہے اور سیاح کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ مخصوص ماحول اور حالات میں اپنے ذاتی اور انفرادی رد عمل کی وہ جھلک پیش کر دے جس سے قاری کی ذہنی وسعت اور انسان شناسی میں اضافہ ہو۔ [۴۶]

قدیم سفر نامے زیادہ تر اصلاحی مقصد کے تحت لکھے گئے۔ تب ذرائع آمد و رفت محدود تھے اور دور دراز کی خبروں تک رسائی ناممکن تھی۔ ان حالات میں کوئی بیرونی ملک یا دوسرے علاقے کا سفر کر کے بھی آتا تو لوگ اس کی معلومات سے استفادہ کرتے۔ ڈاکٹر انور سدید سفر نامے کی علمی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> مسافر نے اس سفر کے دوران جو مشاہدات جمع کیے اور تجربات سمیٹے ہیں ان میں دوسرے لوگ بھی شریک کر سکیں۔ قدیم سفر نامے میں اس قسم کا استفادہ عام کارِ خیر سمجھ کر بھی انجام دیا جاتا تھا اور سفر نامے اس مقصد کے تحت بھی لکھے جاتے تھے کہ آئندہ ان راہوں پر سفر کرنے والوں کو مناسب راہنمائی فراہم کر سکیں۔ سر سید احمد خان، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد اور متعدد دوسرے قدیم سفر نامہ نگاروں نے اس ذوقِ تحسین کی تسکین اور اس میں قومی منفعت کا زاویہ بھی شامل کیا اور علمی، تہذیبی اور تمدنی معلومات کے علاوہ جغرافیائی کوائف، تاریخی واقعات، بود و ماند کی معلومات کا بیش بہا خزانہ بھی پیش کر دیا۔[۴۷]

سفر نامے قاری کو لطف اندوز کرنے کے علاوہ علم و دانش کی بیش بہا دولت بھی فراہم کرتے ہیں۔ سیاح جس جگہ قدم رکھتا ہے وہاں کے جذبات کو سمیٹتا چلا جاتا ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ جو کچھ اس نے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اس میں دوسروں کو بھی شریک کرے۔ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت لوگوں میں گزارتا ہے۔ ایک سچے سیاح کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ ان دیکھے راستوں پر گھومنے میں لطف و تسکین محسوس کرتا ہے۔ جب کہ مسافر کی نظریں اپنی منزل کی جانب لگی ہوتی ہیں اور وہ صرف راستے میں آنے والی جزیات کو سمیٹنے پر ہی اکتفا کرتا ہے۔

یہ وہ سفر نامے ہیں جن میں مصنف کی توجہ کا مرکز علم اور اس کے متعلق معلومات ہوتی ہے۔ ان سفر ناموں میں ایسی معلومات فراہم کی جاتی ہے جو دوسروں کے لیے رہنمائی کا باعث بنے۔ سر سید احمد خان کا سفر نامہ مسافرانِ لندن (۱۹۶۱ء)، محمد حسین آزاد کا سیر ایران (۱۸۸۶ء) اور شبلی نعمانی کا سفر نامہ مصر روم شام (۱۸۸۱ء) ایک خاص قومی مقاصد کے تحت لکھے گئے یہ سب سیر کی غرض سے بیرون ملک نہیں گئے تھے بلکہ ان کا مقاصد ان خزینوں تک رسائی کرنا تھا جنھیں اقوام مغرب لوٹ کر لے گئی تھی۔ ان کے سفر نامے علمی معلومات سے بھرپور ہیں۔ شبلی نعمانی کے سفر نامہ روم و مصر و شام سے ایک اقتباس ملاحظہ ہے کہ

> علم یہاں ذریعہ دولت نہیں تاہم اس علاقے میں کثرت سے اہل علم اور مصنفین پیدا ہوئے اور اب بھی موجود ہیں خاص لبنان کے علماء و شعراء کے حال میں ایک مستقل کتاب لکھی گئی ہے۔ لیکن افسوس اور

سخت افسوس ہے کہ یہ تمام علمی ترقی اور تصنیف وتالیف جو کچھ ہے۔ عیسائیوں کے ساتھ مخصوص ہے مسلمان ان چیزوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ [۴۸]

مسافران لندن سے یہ اقتباس دیکھیے:

پس جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی بھلائی اور ترقی چاہتے ہیں۔ وہ یقین مان لیں کہ ہندوستان کی بھلائی صرف اس پر منحصر ہے کہ تمام علوم اعلیٰ سے لے کر ادنی تک انہی کی زبان میں ان کو دیئے جائیں۔ میری یہ رائے ہندوستان کے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر بڑے بڑے حرفوں میں آئندہ ۸ زمانے کی یادگاری کے لیے کھود دیئے جائیں۔ اگر تمام علوم ہندوستان کو اسی زبان میں نہ دیئے جائیں گئے تو بھی ہندوستان کو شائستگی اور تربیت کا درجہ نصیب نہ ہوگا۔ [۴۹]

سفر نامہ ایک ایسی مفید صنف ہے جو کہ علمی وادبی، تہذیبی، معاشرتی، تاریخی، جغرافیائی معلومات میں اضافہ کرنے کا باعث بنتا ہے۔ سفر نامہ نگار نہ صرف تاریخی معلومات دینے پر اکتفا کرتا ہے بلکہ وہ ملکوں کی سیاست، مذہب، لوگوں کے رسم ورواج اور بود وباش کے متعلق بھی اپنی افتاد طبع کے مطابق تحریر کرتا ہے جس سے قاری دوسرے ملک اور خطے سے واقف ہوتا ہے۔ پرانے سفر نامے معلومات فراہم کرنے کا ایک اہم ذریعہ سمجھے جاتے تھے کیونکہ اس وقت ذرائع آمد ورفت نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ لوگ آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکیں اور دوسرے ممالک کے بارے میں جان سکیں۔ اس لیے لوگ سفر نامے سے مستفید ہوتے تھے۔ سفر نامے کی اہمیت کے بارے میں پروفیسر تنویر حسین لکھتے ہیں۔ سفر نامہ کسی ملک یا خطے کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا مثبت ذریعہ فراہم کرتا ہے۔ [۵۰]

سفر نامہ دنیائے ادب کی ایک دلچسپ اور اہم صنف ہے، اس لیے تمام زبانوں میں اسے تخلیق کیا گیا ہے۔ سفر نامہ دوسری اقوام کے تاریخی، ثقافتی، معاشی، سیاسی حالات، لوگوں کے رہن سہن اور معاشرت کو سامنے لاتا ہے اور سفر نامہ نگار مصلح قوم بھی ثابت ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنی باریک بین نگاہوں سے خامیوں اور خوبیوں کا تجزیہ بھی کرتا ہے۔

سفر نامہ ایک ایسی واحد صنف ہے جو کم وقت میں ہر طرح کی معلومات فراہم کرتا ہے۔ یہ معلومات ادبی، قومی اور انفرادی، زندگی کے ہر گوشے پر محیط ہے۔ سفر نامہ معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور لطف سے بھرپور صنف ہے۔

ج۔ جنوبی ایشیاء میں سفر نامے کی روایت:

اٹھارویں صدی تک کے سفر نامے

سولھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے تعلقات انگلستان کے ساتھ اس وقت استوار ہونا شروع ہوئے، جب بادشاہ انگلستان نے اپنے سفیر سرٹامس رو (Thomas Rao)کو جلال الدین محمد اکبر (۱۵۵۶ء۔۱۶۰۵ء) کے دربار میں بھیجا تاکہ وہ ہندوستان میں تجارت کرنے کا اجازت نامہ حاصل کریں اور انھیں ہندوستان کے کچھ علاقوں میں تجارتی کمپنیاں قائم کرنے کی اجازت مل گئی۔ انگریز ایک خاص مقصد کے تحت ہندوستان میں آئے تھے۔ انھوں نے خود کو مغلوں کا خیر خواہ اور دوست ثابت کرنے کی حتی الامکان کوششیں کیں اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔ [۵۱]

انگریزوں نے آہستہ آہستہ دوسرے علاقوں میں بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے اپنے پنجے گاڑنے شروع کر دیئے اور پھر کچھ عرصہ بعد ان کا تجارتی لین دین سیاسی عملداری میں بھی مداخلت کرنے لگا۔ انھوں نے حکومتی معاملات میں عمل دخل شروع کر دیا مگر جب تک مغل حکمران اپنی فہم وفراست اور رعب و دبدبے سے نظام حکومت چلاتے رہے تب تک وہ اپنی سیاسی چالوں میں کامیاب نہ ہوئے مگر ۱۷۰۷ء میں اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو گیا۔ ان کے جانشین نااہل حکمران اپنی نااہلی اور عیاشیوں میں پڑ کر کمزور سے کمزور تر ہوتے گئے اور ان سب کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریز اپنی عیاری سے ہندوستان پر غلبہ پاتے گئے۔

اٹھارہویں صدی، ہندوستان کے زوال و انحطاط کی صدی ہے۔ مغلیہ سلطنت کے کمزور ہوتے ہی جاٹ، روہیلے، مرہٹے، اور انگریز ملکی لوٹ کھسوٹ میں لگ گئے۔ ان سب کے سامنے غریب عوام بے بس و مجبور تھی اور کسی کی بھی عزت و ناموس محفوظ نہ تھی۔ حتیٰ کہ روزی روٹی کے لالے پڑ گئے تھے۔ صنعتیں تباہ اور تمام پیشے اپنی اہمیت کھو بیٹھے تھے۔ عوام فارغ البالی اور خوف وہراس کی کیفیت میں تھے اور نہ صرف عوام بلکہ خود شاہی خاندان پر کئی کئی وقت کے فاقے کی نوبت آگئی تھی۔ معاشرے میں اطمینان اور آسائشوں بھرا دور ختم ہو چکا تھا۔ [۵۲]

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ہندوستان مکمل طور پر انگریزوں کے تسلط میں آگیا۔ انھوں نے ملکی نظام کو چلانے کے لیے ایک طرف تو ملک میں صنعتوں کا جال بچھا دیا اور دوسری طرف اپنی انتظامی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے انگریزی اور سائنسی علوم کی تعلیم کے لیے مدارس اور کالج قائم کیے۔ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام انھی

TH-22509

مقاصد کی تکمیل کا شاخسانہ تھا۔ایک طرف تو وہ اس کے قیام سے ہندوستانی عوام کے دلوں میں اپنی وفاداری اور خود کو ان کا ہمدرد ثابت کرنا چاہتے تھے اور دوسری طرف انہوں نے اپنے نو آموز انگریز افسروں کی تربیت کے لیے اور ان کو اردو سے متعارف کروانے کے لیے کتابوں کے آسان اردو میں تراجم کروائے۔ یہ ایک ایسا دور ہے کہ جس میں انگریز اور مسلمانوں میں سرد مہری کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔انگریزوں نے غدر کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں پر ڈالتے ہوئے ان کو اپنے عتاب کا نشانہ بنایا اور مسلمان انگریزوں سے مختلف وجوہات کی بناء پر متنفر تھے۔ [۵۳]

اٹھارویں صدی ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس عہد میں ہندوستانیوں کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب آیا۔ یوں تو سترھویں صدی میں سلطنتِ برطانیہ کے تعلقات بادشاہ ہندوستان کے ساتھ قائم ہونا شروع ہو گئے تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کی غرض سے اپنے مذموم مقاصد کے ساتھ اپنی اجارہ داری قائم کر چکی تھی مگر ہندوستان پر مکمل قابض ہونے کی خواہش اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد پوری ہوئی، جب مغلیہ سلطنت کے جانشینوں میں تخت کے حصول کے لیے خانہ جنگی شروع ہوئی تو انگریزوں نے برصغیر کی سیاست میں اپنی مداخلت شروع کر کے ہندوستان پر اپنی مکمل سلطنت قائم کرنے کے لیے کوششیں تیز کر دیں اور بالآخر ۱۷۵۷ء کے غدر کے بعد پورے ہندوستان پر سلطنتِ برطانیہ کی نو آبادی قائم ہو گئی۔اٹھارویں صدی میں انگلستان کا سفر نہایت دشوار تھا اور ذرائع آمد و رفت محدود ہونے کی وجہ سے بہت کم لوگ سفر پر آمادہ ہوتے تھے۔اسی وجہ سے اس صدی میں کم سفر نامے لکھے گئے اور جو سفر نامے میسر ہیں، وہ بھی فارسی زبان میں ہیں۔

۱۔ شاہ ولی اللہ	فیوض الحرمین	۱۷۴۷ء
۲۔ محمد عبد اللہ	سفرنامہ روس و چین	۱۷۷۰ء
۳۔ منشی اسماعیل	تاریخِ جدید	۱۷۷۳ء
۴۔ مرزا اعتصام الدین	شگرف نامہ ولایت	۱۷۷۵ء
۵۔ میر محمد حسین لندنی	مشاہداتِ فرنگ	۱۷۷۵ء
۶۔ مولوی رفیع الدین مراد آبادی	سوانح الحرمین	۱۷۸۷ء

اٹھارویں صدی میں لکھے جانے والے سفر ناموں میں سے زیادہ ترحج نامے ہیں جو کہ حجاز مقدس کی وارداتِ قلبی کا سچا بیان ہے اور یہ سفر نامے راستے کی صعوبتوں میں دوسروں کو شریک کرنے کی غرض سے لکھے جاتے تھے۔ اس میں مناسکِ حج اور دیگر ارکان کے علاوہ راستوں، لوگوں کے رسم و رواج اور ضروری اشیاء جو کہ زادِ راہ کا کام دیں،

ان کے متعلق بھی ہدایات دی جاتی تھیں۔اس طرح سے یہ سفری گائیڈ کی ذیل میں بھی آتے ہیں۔یہ سفر نامے لوگوں کی رہنمائی کے لیے لکھے جاتے رہے ہیں۔

حج ناموں کی روایت پر نظر ڈالیں تو بہت سی سوانح عمریاں ایسی ملیں گی جن میں حجاز مقدس کے سفر کا احوال بھی پایا جاتا ہے۔اس طرح وہ سوانح اور سفر نامے دونوں کی ذیل میں آتی ہیں جیسے کہ "سوانح احمدی" یہ حضرت سید احمد بریلوی شہید کی سیرت سے متعلق بڑی تاریخی اہمیت رکھنے کے ساتھ ساتھ حج کی سعادت سے متعلق بھی معلومات فراہم کرتی ہے لیکن یہ ایک باقاعدہ حجاز مقدسہ کا سفر نامہ یا حج نامہ میں شمار نہیں ہوتی مگر اس حج نامے کی روایت میں شیخ عبدالحق دہلوی اور حضرت شاہ ولی اللہ نے تقدیس کا زاویہ پیدا کیا۔حج نامے کی اولیت کا سہرا شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے سر ہے۔ان کا حج نامہ بہ عنوان "جذب القلوب(۱۵۸۹ء) میں حج کی سعادت حاصل کرنے سے متعلق ہے۔[۵۴]

دوسرا قدیم ترین حج نامہ حضرت شاہ ولی اللہ کا فیوض الرحمین (۱۷۴۸ء) ہے اس سفر نامے میں حج کی روحانی واردات اور باطنی کیفیات کو بیان کیا گیا ہے۔یہ روحانی سفر حیرتوں کو جگانے کے ساتھ ساتھ روح کو بیدار کرنے کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔حضرت شاہ ولی اللہ اسی شوقِ سفر کی تکمیل کے لیے زائرین کے قافلے کے ساتھ روانہ ہوئے۔حضرت شاہ ولی اللہ برصغیر پاک وہند کی ایک ایسی برگزیدہ ہستی ہیں جنھوں نے اسلامی شعائر کے تحفظ کے لیے بڑی کوششیں کیں اور انگریزوں کے خلاف برسرِپیکار رہے۔ان کا کام اور نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔جہاں کہیں بھی اسلامی تحریکوں کا نام آئے گا وہاں حضرت شاہ ولی اللہ تحریک کا نام بھی ضروری ہے۔یہ سفر نامہ نہ صرف فارسی زبان کے اہم سفر ناموں میں شمار ہوتا ہے بلکہ اس میں مناسکِ حج اور وارداتِ قلبی کا خوبصورت بیان ملتا ہے۔

نوآبادیات کے اس عہد میں اہلِ مغرب مختلف مقاصد اور سیر و سیاحت کے لیے آئے اور برصغیر کے لوگ اپنے آقا کے انتظامی امور اور اثر ورسوخ سے متاثر ہو کر یورپ کی جانب مائل ہوئے اور اس طرح دونوں جانب سے اسفار کا سلسلہ شروع ہوا۔اہلِ ہندوستان کی طرف سے کچھ اسفار ایسے بھی ہیں جو انھوں نے سلطنتِ برطانیہ سے تعلقات بڑھانے کے لیے یا انگریزوں کے کچھ سیاسی عزائم کی تکمیل کی خاطر انجام دیئے۔ان سفر ناموں میں یہ عزائم کھل کر تو سامنے نہیں آتے مگر بعض سرگرمیوں سے اور ان سفر نامہ نگاروں کی تحریروں کے کچھ اقتباسات سے ان شکوک کو تقویت ملتی ہیں کہ وہ سلطنت برطانیہ کے منظورِ نظر تھے۔ان سفر نامہ نگاروں میں سے ایک سفر نامہ "روس و چین" ہے جسے محمد عبداللہ نے ۱۷۷۰ء میں تحریر کیا۔اس سفر نامے کو ڈاکٹر نجیبہ عارف نے دریافت

کیا، وہ اس سفر نامے کی تلاش کے متعلق لکھتی ہیں کہ بعد از کوشش بسیار برٹش لائبریری ہی میں اس مخطوطے تک رسائی حاصل ہو گئی۔[۵۵]

اٹھارویں صدی میں جنوبی ایشیاء سے مغرب کی جانب سفر کرنے والے محمد عبداللہ نے تقریباً ۱۷۷۰ء سے پہلے مختلف خطوں کا سفر کیا اور اس سفر نامے میں دو الگ الگ اسفار کا حال مختصراً بیان کیا ہے۔ مصنف نے صرف راستوں اور شہروں کی تفصیل دی ہے اور بہت سی باتیں پردہ راز میں رکھیں ہیں۔ وہ جن لوگوں سے ملا ان کا ذکر بھی سرسری کرتا ہے یا اس نے کسی مقصد سے سفر اختیار کیا۔ اس کے بارے میں بھی سفر نامے میں کوئی شہادت نہیں ملتی، مگر سفر نامے میں اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ وہ انگریزوں کا تنخواہ دار ملازم تھا۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف اس سفر نامے کے بارے میں لکھتی ہیں:

> قرین قیاس ہے کہ محمد عبداللہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارپردازان نے کسی جاسوسی مہم پر روس و چین روانہ کیا ہو گا۔ اٹھارویں صدی میں ایسی مہمات کا سراغ ملتا ہے اور کچھ اور جاسوسوں کی ڈائریاں اور روزنامچے بھی برٹش لائبریری میں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب اقتدار ہندوستان، افغانستان، ایران اور روس تک جاسوسی کے جال پھیلا رہے تھے۔[۵۶]

سفر نامہ نگار نے بہت سی باتیں صیغۂ راز میں رکھیں ہیں اور اپنی تمام تر توجہ صرف مقامات کے نام، وہاں قیام کی مدت اور بہت کم لوگوں کے ناموں کے متعلق لکھا ہے۔ محمد عبداللہ کے سفر نامے کا یہ قلمی نسخہ بنگال کے گورنر جنرل وارن ہسٹنگز (Warren Hastings) کے ذریعے انڈیا آفس لائبریری برطانیہ پہنچا۔ یہ سفر نامہ اپنی اختصار نویسی کے باوجود اٹھارویں صدی کے تاریخی حوالے سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

کسی بھی خطے کی تاریخ، رسم رواج، سیاست، معاشرت اور دوسری معلومات کے لیے سفر نامے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جنوبی ایشیاء میں اٹھارویں صدی تک اس صنف کی جانب کم توجہ دی گئی اور جو تھوڑے بہت سفر نامے تخلیق کیئے گئے، وہ گوشہ گمنامی میں پڑے کسی صاحبِ نظر کے انتظار میں ہوں گئے۔ ایسا ہی ایک سفر نامہ منشی اسماعیل کا تاریخ جدید ہے جو ۱۷۷۳ء میں فارسی زبان میں لکھا گیا ہے۔ منشی اسماعیل نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک افسر مسٹر کلارڈ رسل کے ساتھ ۱۷۷۱ء سے ۱۷۷۳ء کے دوران کلکتہ سے انگلستان کا سفر کیا اور سفر نامے کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سفر نامہ لکھنے کا خیال انھیں دورانِ سفر ہی آ گیا تھا تاکہ وہ اپنی سرکاری نوکری اور سلطنتِ برطانیہ کا احوال قلم بند کر کے اپنے آقا کی خوشنودی حاصل کرے۔

اس سفر نامے میں منشی اسماعیل نے نہ صرف سفر کے مشاہدات و تجربات کو بیان کیا ہے بلکہ اپنے خاندانی حالات اور بنگال کی قحط زدہ صورت حال کا اظہار بھی باریک بینی سے کیا ہے۔ اس حوالے سے یہ سفر نامہ نوآبادیاتی عہد کی معاشرتی، سیاسی، ثقافتی، تاریخ کا ایک اہم دستاویز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خود نوشت کی ذیل میں بھی آتی ہے۔ ان تمام باتوں کے علاوہ اس سفر نامہ کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ ہے کہ یہ انگلستان کا اولین سفر نامہ ہے۔ منشی اسماعیل کے اس سفر نامہ تاریخ جدید کو بڑی کاوش و لگن کے ساتھ دریافت کیا ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف اس سفر نامے کی اہمیت کے متعلق لکھتی ہیں:

> منشی اسماعیل کے مذکورہ سفر نامے کے دریافت کے بعد کہا جا سکتا ہے۔ کہ اب تک دست یاب معلومات کے مطابق "تاریخ جدید" ہندوستان میں لکھا جانے والا، انگلستان کا پہلا سفر نامہ ہے جس کی تالیف ۱۷۷۳ء میں ہوئی۔ یہ الگ بات ہے کہ کم و بیش دو سو سال تک یہ تحریر اہل علم کی نظروں سے اوجھل رہی۔ [۵۷]

۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری اور سلطنت برطانیہ کی ابتدائی نوآبادیات کا عہد ہے بلکہ ہندوستانیوں کے بدتر استحصال اور تنزلی کا بھی عہد ہے۔ نوآبادکاروں نے اپنی حکومت قائم کرنے اور تجارتی مقاصد کے حصول کی خاطر ہندوستانیوں سے جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا اور ان کی جانوں تک کی پرواہ نہ کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ تسلط علاقوں میں ۱۷۶۹ء تا ۱۷۷۳ء تک کمپنی کی بدترین پالیسیوں کی وجہ سے خوف ناک قحط کی صورت حال پیدا ہوئی جس سے لاکھوں انسان لقمۂ اجل بنے۔ نوآبادیات کے اس عہد میں اگر یورپ کا سفر اختیار کرنے والے سفر نامہ نگاروں کے ہاں دیکھیں تو انھیں اپنے حقوق کا تحفظ، سیاسی شعور اور قومیت کا احساس تک نہیں بلکہ اس کے برعکس وہ اہل برطانیہ کی ذہنی قابلیت، انتظامی صلاحیت اور عدل و انصاف کے معترف دیکھائی دیتے ہیں۔

ان کے سفر نامے مغربی تہذیب و ثقافت اور انکی ترقیاتی کاموں کی قصیدہ خوانی کا دیوان معلوم ہوتا ہے۔ ابتدائی دور کے تمام سفر ناموں میں یہ رویہ پایا جاتا ہے۔ مرزا اعتصام الدین کا سفر نامہ شگرف نامہ ولایت بھی اس ستائش سے بھرپور ہے وہ بھی انگریزوں کے خیر خواہ اور مغربی تہذیب و تمدن کے دلدارہ ہیں۔ یہ سفر نامہ ۱۷۷۵ء میں شائع ہوا اور اسے منشی اسماعیل کے سفر نامہ تاریخ جدید کے دریافت ہونے سے پہلے، انگلستان جانے والے پہلے ہندوستانی کا سفر نامہ سمجھا جاتا تھا۔ اعتصام الدین نے ۱۷۶۷ء سے ۱۷۶۹ء میں انگلستان کا سفر کیا اور اسے فارسی زبان میں تخلیق کیا۔ اس عہد کے مروجہ اسلوب کے مطابق اندازِ تحریر ادبی اور جزیات نگاری پر مبنی ہے۔ یہ سفر نامہ بھی مغربی تہذیب و ثقافت اور ہندوستانی فضا اور سماجی و معاشرتی اور سیاسی حوالوں سے اہمیت کا حامل ہے۔

اسی عہد میں عربی میں لکھا جانے والا ایک اور اہم سفر نامہ جسے ۱۷۷۵ء-۱۷۷۶ء میں میر محمد حسین لندنی نے رسالۂ احوالِ ملک فرنگ و ہندوستان کے نام سے لکھا۔ انھوں نے سیر و سیاحت کی غرض سے یورپ کا سفر اپنے ایک برطانوی انگریز دوست (Elliot) کے ہمراہ اختیار کیا۔ وہاں جا کر انھوں نے اپنے دوست کے توسط سے انگریزی سیکھی اور ایک انگریزی کتاب کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

> میر محمد حسین لندنی نے اس سفر سے واپسی پر اپنے تاثرات و مشاہدات کو سب سے پہلے عربی زبان میں لکھا مگر بعد میں اپنے دوست کی فرمائش پر اسے فارسی میں ترجمہ کیا۔ ۲۰۱۰ء میں اس سفر نامے کے مخطوطے کو محمد احمد برکتی نے ڈھونڈ کر اس تعارف کے ساتھ "مشاہدات فرنگ" کے نام سے شائع کیا۔[۵۸]

اٹھارویں صدی میں لکھے جانے والے حج ناموں میں سے ایک اور اہم حج نامہ مولوی رفیع الدین مراد آبادی کا سوانح الحرمین ہے جسے انھوں نے خود نوشت کے انداز میں ۱۷۸۷ء میں تحریر کیا۔ اس حج نامے میں انھوں نے روضۂ رسول ﷺ اور خدا پاک کے گھر کی عظمتوں کو وارداتِ قلبی سے بیان کیا ہے۔ اسی لیے یہ سفر نامہ فارسی زبان کا ایک عمدہ سفر نامہ شمار ہوتا ہے۔[۵۹]

۱۸۰۰ تا ۱۸۵۷ء کے سفر نامے

برصغیر پاک و ہند میں انیسویں صدی بڑی کش مکش سے بھرپور صدی تھی اور ایسے حالات کی سنگینی کو سر سید احمد خان کی دور بین نگاہوں نے بھانپ لیا اور مسلمانوں کو جدید علوم حاصل کرنے کی نا صرف تلقین کی بلکہ علی گڑھ میں عملی طور پر عملی کام کا آغاز کیا۔ انھوں نے دوسری طرف سائنٹیفک سوسائٹی کے زیرِ اثر مغربی کتابوں کے تراجم بھی کروائے۔ اس طرح سر سید کی کوششوں سے عوام انگریزی علوم کی طرف راغب ہوئے اور انھی کی کوششوں سے کئی نئی اصناف مضمون نگاری، سوانح، تنقید، ناول اور سیاحت نامے جیسی صنف اردو ادب میں داخل ہوئیں۔

سر سید احمد خان اور ان کے رفقاء نے قومی مقاصد کے تحت مختلف ملکوں کے سفر اختیار کیے اور واپسی پر سفر نامے تخلیق کیے۔ ان کے یہ سفر نامے علمی، ادبی، سماجی اہمیت کے حامل ہیں۔ ہندوستان میں انگریز سلطنت کے ثمرات تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے قائم ہوتے ہی شروع ہو گئے تھے مگر اس میں تیزی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد آئی کیونکہ ان کے بعد وہ تمام سیاہ و سفید کے مالک بننے کے بعد تمام شعبہ ہائے زندگی پر چھا گئے تھے۔ انگریز قوم ایک عرصے سے ہندوستان کے سحر میں گرفتار تھی۔ انھوں نے متعدد بار ہندوستان کے سفر کیے اور بہت سے ہندوستانی اپنے آقاؤں

کے دیس کی برکتوں اور ترقیوں سے فیض یاب ہونے کی خاطر یورپی سفر پر نکلے اور واپسی پر اپنی روداد سفر میں دوسروں کو شریک کرنے کی خاطر سفر نامے لکھے۔

مسیر طالبی(۱۸۰۵ء)

مرزا ابو طالب نے اپنا یہ سفر کلکتہ سے شروع کیا اور لندن کی سیر وسیاحت پر روانہ ہوئے۔ان کا یہ سفر خاص مقصد کے تحت تھا جن میں سلطنت برطانیہ کے اہم لوگوں سے ملاقاتیں بھی تھیں۔اس سفر میں نہ صرف مسافرت لندن کا احوال ہے بلکہ برصغیر کے متعلق اہم اطلاعات بھی موجود ہیں۔خاص کر ایرانی پارسیوں اور تاریخی عمارتوں کے متعلق اہم معلومات ہیں۔اس سفر نامے میں مرزا ابو طالب یورپی تہذیب سے متاثر نظر آتے ہیں۔

مثنوی نادر(۱۸۲۴ء)

یہ اہم سفر نامہ مثنوی کی صنف میں ۱۸۲۴ء میں شاعر نادر نے تخلیق کیا اور یہ **مثنوی نادر** کے نام سے مشہور ہے۔یہ سفر نامہ اب تک غیر مطبوعہ شکل میں ہے۔اس میں نادر نے نواب اعظم جاہ والی ارکاٹ کے، مدراس سے ناگور شریف کے سفر کے حالات و واقعات کو پیش کیا ہے اور اس سفر نامے کو دکنی اردو میں تحریر کیا گیا ہے۔اس سفر نامے کی اہمیت کے متعلق ڈاکٹر قدسیہ قریشی کہتی ہیں:

> مثنوی نادر اردو سفر ناموں میں دو اعتبار سے بے حد اہم ہے۔اول یہ کہ یہ اردو کا پہلا سفر نامہ ہے، اب تک جتنے سفر نامے دستیاب ہوئے ہیں۔ان میں تاریخی اعتبار سے قدیم ترین بھی ہے۔اس کی دوسری اہمیت یہ ہے کہ یہ منظوم سفر نامہ ہے۔[۱۰]

اس منظوم سفر نامے سے اس عہد کے نوابوں کی زندگی اور اس عہد کی تہذیب و معاشرت کے بارے میں بہت سی اہم معلومات ملتی ہیں۔

سیاحت نامہ(۱۸۳۹ء)

نواب کریم خان کا تعلق ریاست جھجر سے تھا۔انھوں نے یکم دسمبر ۱۸۳۹ء کو دہلی سے کلکتہ کا سفر اختیار کیا اور وہاں سے ۱۴ مارچ ۱۸۴۰ء کو لندن کے لیے روانہ ہوئے اور وہاں وہ ۱۸۴۱ء تک مقیم رہے۔اس دوران انھوں نے حکمران اعلیٰ سے ملاقاتیں کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی بے پناہ مصروفیت میں لندن کو سرسری نظر سے دیکھ کر، اپنے

حالات سفر کو ڈائری میں قلم بند کرتے رہے۔ اس قلمی نسخے کو ڈاکٹر عبادت بریلوی نے دریافت کر کے سیاحت نامہ کے نام سے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا۔

ترغیب المسالک الیٰ احسن المالک (۱۸۴۱ء)

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ اردو ادب کے ایک نام اور شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے حج کی واردات قلبی کو اس حج نامے میں لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ انیسویں صدی میں نثر اپنی ارتقائی منازل طے کر رہی تھی اور اردو ادب کا ذخیرہ وسیع ہو رہا تھا مگر نواب شیفتہ نے اپنا سفر نامہ کو فارسی زبان میں لکھا۔ یہ سفر نامہ فارسی زبان میں بڑا اہم اور منفرد سفر نامہ سمجھا جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں فارسی زبان میں جو بھی سفر نامے لکھے گئے ان میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا ترغیب المسالک احسن المالک بھی اس سلسلے کی کڑی ہے۔[۱۱] نواب غوث محمد خان نے اپنا سیر المحتشم سفر نامہ ۱۸۵۱ء میں لکھا۔ اس میں انھوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں کے سفر کا احوال تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ سفر نامہ تاریخی واقعات کے حوالے سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ ایک تو اس میں ہندوستان کی تہذیب و معاشرت ملتی ہے اور دوسرا مصنف نے مختلف عمارتوں اور مکانوں کی تصویریں اور نقشے بھی پیش کیے ہیں۔ یہ ایک تصویری سفر نامہ ہے۔

عجائبات فرنگ (۱۸۴۷ء)

یوسف خان کمبل پوش کا سفر نامہ عجائبات فرنگ جس کو تاریخ یوسفی بھی کہا جاتا ہے۔ اس سفر نامے کو بجا طور پر اردو ادب کا پہلا سفر نامہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے کوئی ایسا سفر نامہ دریافت نہیں ہوا جو اردو زبان میں لکھا گیا ہے۔ یوسف خان کا ایک اور نادر سفر نامہ سیرِ ملکِ اودھ جسے ڈاکٹر نجیبہ عارف نے دریافت کرنے کے بعد اس کو اپنے مقدمے کے ساتھ ۲۰۱۷ء میں شائع کیا ہے۔ یہ سفر نامہ ۱۸۴۷ء کے عرصہ میں لکھا گیا تھا اور غیر مطبوعہ حالت میں برٹش لائبریری میں موجود رہا۔ یوسف خان کا سفر نامہ عجائبات فرنگ ۱۹۴۷ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ انھوں نے ۱۹۳۷ء/۱۹۳۸ء میں اپنے وطن کو خیر باد کہا اور لندن کی سیاحت کے لیے روانہ ہوا۔ یوسف نے یورپ کی تہذیب و معاشرت کو دیکھا اور اپنے مشاہدات و تجربات میں دوسروں کو شریک کرنے کے لیے اپنا سفر نامہ تخلیق کیا۔

سیر کشمیر(۱۸۴۷ء)

سیر کشمیر پنڈت کنھیالال کا سفر نامہ ہے۔ وہ ۱۸۴۷ء میں انگریزوں کے ساتھ ایک گائیڈ کے طور پر، کشمیر کی سیاحت پر روانہ ہوئے اور واپسی پر انھوں نے بہت مختصر سیر کشمیر کے نام سے یہ سفر نامہ لکھا۔ اس میں پنڈت کنھیالال وادیٔ کشمیر کے خوبصورت مناظر کی منظر کشی کرتے ہیں۔ یہ سفر نامہ انیسویں صدی کی اردو نثر کا بہترین نمونہ ہے۔

تاریخ افغانستان(۱۸۵۲ء)

سید فدا حسین کا سفر نامہ تاریخ افغانستان ۱۸۵۲ء میں اردو زبان میں لکھا گیا ہے۔ یہ روزنامچے کی ہئیت میں ہے، اس میں فدا حسین نے اپنی جنگی مہمات اور دورانِ سفر پیش آنے والے واقعات کو حقیقت نگاری سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سفر نامے کا کینوس محدود ہے اور یہ جنگی وقائع نگاری کا ایک غیر مرقع نمونہ نظر آتا ہے۔[۶۲]

نوآبادیاتی عہد کے سفر نامے(۱۸۵۷ءتا۱۹۴۷ء)

نوآبادیاتی عہد دیگر اصناف کی ترقی کی طرح اردو سفر نامے کے لیے بھی ایک اہم دور ہے۔ اس دور میں بہت سے سفر نامے لکھے گئے ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں جن میں سب سے پہلی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں اہل یورپ سیر و سیاحت، امور سلطنت اور دیگر مقاصد کے تحت برصغیر میں آئے اور اسی طرح برصغیر کے لوگوں کے بھی یورپ کی چکا چوند نے اپنی جانب متوجہ کیا اور اس طرح یورپ جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان کے علاوہ سفر میں بہت سی سہولیات پیدا ہونے کی وجہ سے بھی ایک ملک سے دوسرے ملک یا ایک خطے سے دوسرے خطے کی جانب آمد ورفت استوار ہوئی اور ان سہولیات کی وجہ سے لوگوں میں سفر کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے سفر سے واپسی پر اپنے سفر کے تجربات اور حالات وواقعات کو سفر ناموں کی صورت میں بیان کیے۔

ا۔حج کے سفر نامے:

حج دین اسلام کا ایک اہم فرض ہے اور اس فرض کی ادائیگی کا ہر مسلمان خواہش رکھتا ہے۔ جب خدا کی ذات

کسی کو اپنے در پر بلاتی ہے تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہتا اور وہ بندہ خدا تمام دنیاوی مصروفیات سے خود کو آزاد کر کے اس کے بلاوے پر لبیک کہتا، درِ نبی ﷺ کی جانب بھاگ پڑتا ہے۔

حج ایک ایسا روح پرور منظر ہے جو آنکھوں میں حیرت و ٹھنڈک پیدا کرتا اور مسافر کو نئی نئی کیفیتوں سے آشنا کرتا ہے۔ اس سفر پر روانہ ہونے والے مسافر اپنے وطن سے دیارِ محبوب تک کا سفر اسی شوقِ عشق اور ذہن و قلب کی آسودگی کی خاطر کرتے ہیں۔ اسی لیے یہ روحانی سفر دوسرے ارضی اسفار سے الگ نوعیت کا ہوتا ہے اور جب اس مقدس فرض کی تکمیل کے بعد وہ مسافر واپسی کا سفر کرتا ہے تو اس کیفیت اور سرشاری میں کرتا ہے کہ وہ دنیا کی غلاظتوں سے پاک اور رب نے اپنے راضی ہونے کا عندیہ دے دیا ہے۔

ایک زائر جب اس محبت و عقیدت کے سفر سے واپس آتا ہے تو دور و نزدیک کے سب لوگ اس وارداتِ قلبی کی روداد سننے آتے ہیں اور ان مقاماتِ مقدسہ کی زیارتوں سے فیض یاب ہونے والا خود بھی، اپنے روحانی تجربات اور مشاہداتِ حج میں دوسروں کو شریک کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ شروع شروع میں یہ زبانی داستان سنائی جاتی تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو راستے کی مصیبتوں سے بچانے کی خاطر اور مناسک حج کی معلومات دینے کے لیے سفر نامے لکھے گے۔ جیلانی کامران حج کے سفر ناموں کے متعلق لکھتے ہیں کہ حج کے سفر نامے بنیادی طور پر محبت کے سفر نامے ہیں۔ محبت کے جذبے کے بغیر یہ سفر شروع ہی نہیں ہوتا اور وارداتِ حج کی باتیں عموماً عشق و جذب کی باتیں ہیں۔ [۳۳] اس جذباتی واردات کو مختلف لوگوں نے اپنے اپنے انداز سے بیان کیا ہے۔ اندازِ بیان مختلف ہے مگر احساس و جذبات سب کے یکساں ہیں۔ اس عہد میں جن لوگوں نے حج کے سفر نامے تخلیق کیے ان کے نام اور سنِ اشاعت درج ذیل ہیں۔

	مصنف	سفر نامہ	سنِ اشاعت
۱۔	نواب سکندر بیگم	تاریخ وقائع حج (قلمی)	۱۸۶۱ء
۲۔	حکیم فرید اللہ	سعادت دارین	۱۸۷۱ء
۳۔	حاجی محمد زردار خان	سفر نامہ حرمین	۱۸۷۳ء
۴۔	محمد بخش قادری	منبع الحرمین	۱۸۸۲ء
۵۔	محمد ایزد بخش	مفید الدارین	۱۸۸۲ء

۶۔	سید محمد علی جونپوری	تبصرہ المومنین یلعب رفیق الزارین	۱۸۸۲ء
۷۔	حاجی سید وزیر حسین	وکیل الغربا	۱۸۸۴ء
۸۔	منشی سید برکت علی	رہنمائے حجاج	۱۸۸۴ء
۹۔	محمد عمر علی خان	زادِ غریب	۱۸۹۰ء
۱۰۔	مولانا محمد حفیظ اللہ	سفر نامہ حجاز	۱۸۸۴ء
۱۱۔	حاجی علیم الدین	رسالہ حج	۱۸۹۲ء
۱۲۔	سید کاظم حسین شیفتہ	سفر نامہ حرمین شرقین	۱۸۹۳ء
۱۳۔	حکیم محمد محی الدین	سفر نامہ حرمین الشرمین	۱۹۰۳ء
۱۴۔	نواب احمد حسین خان	سفر نامہ حجاز و مصر	۱۹۰۳ء
۱۵۔	حاجی نورالدین قصوری	سفر نامہ حجاز و مصر	۱۹۰۴ء
۱۶۔	خان بہادر محمد عبدالرحیم	سفر حرمین الشرمین	۱۹۱۰ء
۱۷۔	خواجہ حسن نظامی	سفر نامہ حجاز و مصر و شام	۱۹۱۱ء
۱۸۔	فاطمہ بیگم	سفر نامہ حجاز	۱۹۲۴ء
۱۹۔	مولانا عبدلماجد دریابادی	سفیر حجاز	۱۹۲۹ء
۲۰۔	منشی امیر احمد علوی	سفر سعادت	۱۹۳۲ء
۲۱۔	مولوی ظفر احمد تھانوی	سفر نامہ حجاز	۱۹۳۳ء
۲۲۔	مولوی محمد عبدالعزیز	سفر نامہ بلاد/اسلامیہ	۱۹۳۵ء
۲۳۔	نواب آف بھاول پور	حج صادق	۱۹۳۵ء
۲۴۔	عبدالمجید خان	کلیدِ جنت	۱۹۳۶ء

۲۔یورپ اور دوسرے ممالک کے سفر نامے:

نو آبادیاتی عہد کے اوائل ہی سے برصغیر میں یورپی ممالک کی سیر و سیاحت کا رجحان پایا جاتا ہے کیونکہ اس عہد

میں تمام علومِ نو اور سائنسی ایجادات مغرب سے آرہے تھے اور مغرب نے کچھ ہی عرصے میں نہ صرف ملکی سیاست بلکہ برصغیر پر بھی دوررس اثرات مرتب کیے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد نہ صرف مغل سلطنت کا خاتمہ ہوا بلکہ اس کے ساتھ ہی مشرقی تہذیب و معاشرت زوال آمادہ ہو گئی۔ ہندوستان کا صدیوں کا جادوئی سحر اپنا اسرار کھو بیٹھا اور اس کی جگہ مغربی تہذیب کا علوم اور سائنسی ایجادات باعث کشش بن گئیں۔

برصغیر پر اس مغربی غلبے نے لوگوں میں یورپ کی سیر و سیاحت اور عجائبات سے مستفید ہونے کا شوق بیدار کیا۔ اس شوق میں دو طرح کے لوگ شامل تھے ایک تو وہ جو صرف انگریزوں کے خیر خواہ یا ان کی تہذیب سے متاثر ہو کر سیاحت پر مجبور ہوئے تھے اور دوسرا وہ گروہ جن کا مقصد یورپ جا کر وہاں کے نظامِ تعلیم، اصولِ تدریس اور سیاسی و سماجی صورتِ حال کا جائزہ لے کر اپنے ملک کی تبدیلی کے خواہاں تھے۔ ان سیاحوں نے اپنے اپنے مقاصد کے تحت یورپ کا سفر کیا اور لوگوں کو وہاں کی طرزِ بود و باش اور رسم و رواج، رہن سہن اور عجائبات یورپ سے متعارف کروانے کے لیے سفرنامے تخلیق کیے۔ وہ سفرنامے یہ ہیں۔

	مصنف	سفرنامہ	سنِ اشاعت
۱۔	سر سیّد احمد خان	مسافرانِ لندن	۱۸۶۹ء
۲۔	منصب علی حاجی	ماہِ مغرب	۱۸۷۶ء
۳۔	مولوی سمیع اللہ خان	سفرنامہ لندن	۱۸۸۰ء
۴۔	راما شنکر	آئینہ سکندری	۱۸۸۷ء
۵۔	نواب محمد عمر خان	فرہنگ فرنگ معہ آہنگ فرنگ	۱۸۸۹ء
۶۔	مرزا نثار علی بیگ	سفرنامہ یورپ	۱۸۹۰ء
۷۔	نواب محمد حامد علی خان	سیرِ حامدی	۱۸۹۲ء
۸۔	نواب محمد عمر	قندِ مغربی	۱۸۹۳ء
۹۔	نواب محمد عمر	سفرنامہ آئینہ فرنگ	۱۸۹۵ء
۱۰۔	ڈاکٹر سیّد محمد شاہ علی سبزواری	خوفناک دنیا	۱۸۹۹ء
۱۱۔	منشی محبوب عالم	سفرنامہ یورپ	۱۹۰۰ء
۱۲۔	نازلی رفیعہ سلطان	سیرِ یورپ	۱۹۰۸ء

۱۳۔	ڈاکٹر محمد حسین	سفر نامہ جاپان	۱۹۰۸ء
۱۴۔	سر بلند جنگ بہادر بیگم	دنیا عورت کی نظر میں	۱۹۰۹ء
۱۵۔	حید اللہ سر بلند جنگ بہادر	سفر نامہ قسطنطنیہ	۱۹۱۰ء
۱۶۔	خواجہ غلام الثقلین	روزنامچہ سیاحت	۱۹۱۲ء
۱۷۔	شاہ بانو	سیاحت سلطانی	۱۹۱۵ء
۱۸۔	قاضی عبد الغفار	نقشِ فرنگ	۱۹۳۱ء
۱۹۔	عطیہ فیضی	زمانۂ تحصیل	۱۹۲۲ء
۲۰۔	شوکت عثمانی	میری روس یاترا	۱۹۲۲ء
۲۱۔	پنڈت ٹھاکر دت	سیرِ یورپ	۱۹۲۴ء
۲۲۔	یعقوب	مشاہداتِ عرفانی	۱۹۲۵ء
۲۳۔	بیگم ہمایوں مرزا	سفر نامہ یورپ	۱۹۲۶ء
۲۴۔	مسٹر ولی محمد	سفر یورپ	۱۹۲۶ء
۲۵۔	نواب محمد ظہیر الدین	سیاحت نامہ	۱۹۳۳ء
۲۶۔	بدر الدین شکیب	یورپ کے تاثرات	۱۹۳۵ء
۲۷۔	خواجہ احمد عباس	مسافر کی ڈائری	۱۹۳۸ء
۲۸۔	ہارون خان شیروانی	یورپ جنگ سے پہلے	۱۹۴۴ء
۲۹۔	سر رضا علی	اعمال نامہ	۱۹۴۴ء

۳۔ علاقائی سفر نامے/اندرون ملک کے سفر نامے:

۱۸۵۷ء کے بعد سفری سہولیات کی دستیابی سے جہاں یورپ اور مشرقی ممالک جانے کا رجحان بڑھا، وہیں اندرون ملک بھی سیر وسیاحت کو تقویت ملی اور سیاحوں نے علاقائی سفر نامے لکھے۔ یہ سفر نامے ان مشاہدات و تجربات کو بیان کرتے ہیں جو علاقائی سیاحت میں سیاحوں کو پیش آئے۔ ان سفر ناموں کی تعداد دیگر سفر ناموں سے کم نہیں ہے۔

دوسرے سفر ناموں کی طرح علاقائی سفر ناموں کی بھی سماجی و ثقافتی اور تاریخی و مذہبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے ذریعے اندرون ملک کے شہروں، لوگوں کے رہن سہن، تاریخی عمارتوں کے متعلق، ہر صوبے کے موسموں، زبانوں، پہاڑوں، ریگستانوں اور دریاؤں کی خوبصورتی کے بارے میں معلومات ملتی ہے۔ اس کے علاوہ برصغیر پاک وہند دنیا کا وہ بڑا اور قدرتی وسائل سے مالا مال ملک ہے جو مختلف تہذیبوں، رسم و رواجوں اور مختلف زبانوں کا مجموعہ ہے اور اس خطے کی سب سے دلچسپ و عجیب بات یہ ہے کہ ہر شہر سے تھوڑے فاصلے پر رسم و رواج، زبان کا لہجہ اور لباس تک تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اندرونِ ملک کے بہت سے شہر ہیں اور یہ تمام شہر ایک دوسرے سے رہن سہن کے لحاظ سے مختلف ہیں اس لیے یہ سفر نامے بھی دوسرے سفر ناموں کی طرح اہمیت کے لحاظ سے کم نہیں۔

۱۔	مثنوی نادر (غیر مطبوعہ)	نادر	۱۸۲۴ء
۲۔	سیر کشمیر	پنڈت کنھیا لال	۱۸۴۷ء
۳۔	باغ نو بہار	سید کریم علی	۱۸۵۰ء
۴۔	سیر ا محتشم	نواب غوث محمد خان	۱۸۵۱ء
۵۔	سفر نامہ امین چند	منشی امین چند	۱۸۵۵ء
۶۔	سرورِ ریاضی	شیخ محمد ریاض الدین	۱۸۶۰ء
۷۔	آئینہ حیرت	مرزا عوض علی بیگ	۱۸۶۶ء
۸۔	سیر دریا	مرزا عوض علی بیگ	۱۸۶۶ء
۹۔	ضمیمہ اودھ اخبار	نواب کلب علی خان	۱۸۷۰ء
۱۰۔	سفر نامہ کشمیر	کنھیا لال	۱۸۸۲
۱۱۔	سفر نامہ لالہ جنیدہ رام	لالہ جنیدہ رام	۱۸۸۲ء
۱۲۔	سیّد احمد خان کا سفر نامہ پنجاب	مؤلفہ مولوی سیّد اقبال علی	۱۸۸۴ء
۱۳۔	موج سلطانی	مرزا رئیس بخت	۱۸۸۴ء
۱۴۔	سیاحت کشمیر	سرکار کپور تھلہ	۱۸۹۰ء
۱۵۔	سفر نامہ حضور عالی	نواب محمد بسم اللہ خان	۱۸۹۱ء
۱۶۔	سیر دھلی	حاجی سیّد محمد شاہ اکبر	۱۸۹۳ء

۱۷۔	دہلی اور اس کے اطراف	مولانا عبدالحہٰ	۱۸۹۴ء
۱۸۔	سیر پنجاب	کرشن پرشاد	۱۸۹۷ء
۱۹۔	سفر نامہ کشمیر	محمد دین فوق	۱۹۰۷ء
۲۰۔	سیاحت ہند	عبدالرحمن امرتسری	۱۹۰۹ء
۲۱۔	سفر نامہ پونا و مدراس	بیگم ہمایوں مرزا	۱۹۱۸ء
۲۲۔	تحفہ بنگال	سندھی خان صفی بجواڑیہ	۱۹۳۰ء
۲۳۔	تذکرہ سیفی	طیب علی شاکر جیل پوری	۱۹۳۰ء
۲۴۔	شاہ اودھ کا حسرت ناک سفر	واجد علی شاہ	۱۹۳۵ء
۲۵۔	سفیر شاہانہ	محمد اکبر علی	۱۹۳۵ء
۲۶۔	سفر نامہ شمیم	پنڈت شیو نرائن	۱۹۳۸ء

۴۔ مشرقی ممالک کے سفر نامے:

مشرقی ممالک کے سفر ناموں میں مصر، شام، ایران، عراق، قسطنطنیہ، چین، برما، افغانستان، وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سفر مذہبی رسومات کے علاوہ سیاسی، علمی، یا سیاحت کے لیے کیے گئے ہیں۔ ان ممالک کی سیاحت سے وہاں کی اقدار و روایات سے ہم آہنگی اور معلومات میں تبادلہ ہوتا ہے۔ بہت سے مندوبین اپنی ثقافت اور ادبی سیمینار میں شرکت کے لیے بھی ان ممالک میں جاتے ہیں۔ ان ممالک کے سفر ناموں میں سیاحوں نے طرزِ معاشرت، تہذیب، اور سماجی حالات کا نقشہ کھینچا ہے۔ عراق، ایران، عرب اور دیگر مشرقی ممالک کی تہذیب سے ہندوستانی تہذیب کا موازنہ کیا گیا ہے۔ ان سفر ناموں سے نہ صرف ملک کی صورت حال، جغرافیہ، تاریخ، تمدن بلکہ بہادری ہماری اسلامی اقدار اور ثقافت سے قریب تر ہیں تو ان سے دلی یگانگت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور ان ممالک میں جا کر اپنائیت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ان ممالک کے سفر نامے یہ ہیں۔

۱۔	مرزا کاظم برلاس	سیر دریا	۱۸۶۷ء
۲۔	محمد حسین آزاد	سیر ایران	۱۸۸۶ء
۳۔	نواب محمد عمر علی خان	سفر نامہ رئیس	۱۸۸۶ء

۴۔	نواب محمد عمر علی خان	فرہنگ فرہنگ	۱۸۹۱ء
۵۔	شبلی نعمانی	سفر نامہ روم و مصر و شام	۱۸۹۲ء
۶۔	عبدالخالق	سیر برہما	۱۸۹۲ء
۷۔	سیّد سخاوت علی	پیر پہاڑ اسفر نامہ کھٹمنڈو	۱۸۹۶ء
۸۔	حفیظ اللہ	حالاتِ برما	۱۸۹۸ء
۹۔	عبدالغفور	سفر نامہ ملایا	۱۸۹۸ء
۱۰۔	عزلت بیگم صاحبہ	سفر نامہ عراق	۱۹۱۰ء
۱۱۔	مولانا عبداللہ سندھی	کابل میں سات دن	۱۹۱۵ء
۱۲۔	بیگم ہمایوں مرزا	سفر نامہ عراق	۱۹۱۵ء
۱۳۔	منشی محبوب عالم	سفر نامہ بغداد	۱۹۱۸ء
۱۴۔	سید ابو ظفر ندوی	سفر نامہ برما	۱۹۲۱ء
۱۵۔	قاضی ولی محمد کسمنڈوی	اندلس کا سفر	۱۹۲۴ء
۱۶۔	راحیل شرمانیہ	سفر نامہ بلاد مقدس	۱۹۲۹ء
۱۷۔	ڈاکٹر محمد حسین	افغانستان میں میرے اکیس دن	۱۹۲۹ء
۱۸۔	محمودہ عثمان حیدر	مشاہداتِ بلادِ اسلامیہ	۱۹۳۲ء
۱۹۔	سید سلمان ندوی	سیر افغانستان	۱۹۳۳ء
۲۰۔	مولوی محمد عبدالعزیز	سفر نامہ بلادِ اسلامیہ	۱۹۳۵ء
۲۱۔	بیگم حسرت موہانی	سفر نامہ عراق	۱۹۳۵ء
۲۲۔	عبدالصمد صارم	سفر نامہ صارم	۱۹۳۸ء

نوآبادیاتی عہد اردو نثر کے لیے بڑا اہم دور ہے۔ اس میں دیگر اصناف کے ساتھ سفر نامہ کی صنف کو بھی پذیرائی ملی اور بہت سے ہندوستانیوں نے ذرائع آمد و رفت میں آسانی آجانے سے دوسرے خطوں کا سفر اختیار کیا۔ کسی دوسرے خطے یا ملک کا سفر اختیار کرنے کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں۔ کچھ لوگ حصولِ علم کے لیے، کچھ تجارت اور

ملازمت کے سلسلے میں اور بعض نے سیاحت کی غرض سے سفر کیے اور انھوں نے دوسروں کی رہنمائی اور اپنے تجربات میں لوگوں کو شامل کرنے کے لیے سفر نامے لکھے۔

حوالہ جات

۱۔ سورۃ العنکبوت، آیت نمبر ۲۰۔

۲۔ مرزا حامد بیگ، اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء)، ص ۹۔

۳۔ قدسیہ قریشی، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں، (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۷ء)، ص ۲۴۔

۴۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء)، ص ۱۰۰۔

۵۔ خالد محمود، اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، (نئی دہلی: دریا گنج، ۱۹۹۵ء)، ص ۲۲۔

۶۔ ارشد محمود ناشاد، سفر، سفر نامہ اور فرصت نگاہ، (مشمولہ سہ ماہی، عطاء سالنامہ، ۲۰۱۲ء)، ص ۶۰۔

۷۔ انصاری، سحر، (فلیپ) دھوپ کنارہ، (کراچی: بیلا پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء)، ص ۳۔

۸۔ ویبسٹر سکول ڈکشنری (Webster School Dictionary)، (ایڈیشن ۱۹۸۰ء)، ص ۱۰۹۷۔

۹۔ نگہت ریحان خان، اردو مختصر افسانہ فنی و تکنیکی مطالعہ، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۵ء)، ص ۱۶۵۔

۱۰۔ فاروقی، احسن، فکشن اور تکنیک، مشمولہ، (کراچی: سیپ، شمارہ ۲۹)، ص ۱۹۳۔

۱۱۔ شفیع عقیل، زندگی بھر کہاں، (لاہور: بک ہوم، ۲۰۰۶ء)، ص ۹۔

۱۲۔ محمد شہاب الدین، اردو میں حج کے سفرنامے، (دہلی: بھارت آفیسٹ، س۔ن۔)، ص ۴۲۔

۱۳۔ نازلی رفیعہ سلطان، سیر یورپ، (لاہور: یونین اسٹیم پریس، ۱۹۰۸ء)، ص ۱ (تمہید)۔

۱۴۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں، ص ۲۶۔

۱۵۔ انور سدید، اردو ادب میں سفر نامہ، (لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء)، ص ۴۴۳

۱۶۔ طیب علی، عبدالرسول، تذکرۂ سیفی (مرتبہ)، (جبل پور: مطبع نادری، ۱۹۳۰ء)، ص ۳۔

۱۷۔ رحمٰن مذنب، (مقدمہ) اردو میں سفرنامہ از ڈاکٹر انور سدید، ص ۲۰۔۲۱۔

۱۸۔ انور سدید، اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ، ص ۴۱۳۔

۱۹۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصلاحات، ص ۱۳۔

۲۰۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ادبی تنقید اور اسلوبیات، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۸۸۹ء)، ص ۱۵۔

۲۱۔ سید عابد علی عابد، اسلوب، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ء)، ص ۳۶۔

۲۲۔ روبینہ شاہین، سفر نامے کے بنیادی مباحث، مشمولہ، خیابان، (خزاں ۲۰۱۴ء)، ص ۱۷۰۔

۲۳۔ مرزا حامد بیگ، اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ، ص ۹۱۔

۲۴۔ عالی، جمیل الدین، تماشا مرے آگے، (لاہور: غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۵ء)، ص ۵۷۔

۲۵۔ مرزا حامد بیگ، اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ، ص ۳۵۔

۲۶۔ شفیع عقیل، زندگی، پھر کہاں، ص ۱۱۔

۲۷۔ وزیر آغا، سفر نامے کی بحث، مشمولہ اوراق، سالنامہ، (لاہور: ۱۹۷۸ء)، ص ۲۶۵۔

۲۸۔ مرزا حامد بیگ، اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ، ص ۹۔

۲۹۔ مولانا شبلی نعمانی، سفرنامہ روم و مصر وشام، (دہلی: قومی پریس، ۱۸۸۱ء)، ص ۴۹۔

۳۰۔ قدسیہ قریشی، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں، ص ۶۴۔

۳۱۔ محمد برکت علی، آج کل اور سفرنامہ، مرتب ۳۲۔

۳۲۔ رحمٰن مذنب، مشمولہ (مقدمہ) اردو ادب میں سفر نامہ، از ڈاکٹر انور سدید اردو ادب میں سفرنامہ، (لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء)، ص ۲۱۔

۳۳۔ جعفری، رئیس احمد، (مرتبہ)، سفر نامہ ابن بطوطہ، (کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۶۱ء)، ص ۳۔

۳۴۔ قدسیہ قریشی، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں، ص ۳۴۵۔

۳۵۔ رفیع الدین، ہاشمی، اصنافِ ادب، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۸۸۔

۳۶۔ انور سدید، اردو ادب میں سفر نامہ، ص ۴۶۱۔

۳۷۔ تنویر حسین، پروفیسر،اصناف ادب اردو،(لاہور: مقبول اکیڈمی اردو بازار،۲۰۰۹ء)، ص۲۲۹۔

۳۸۔ عبدالرحمان، مولوی،خلاصہ تحفہ النظار،(دہلی: جمال پریس،۱۹۷۲ء)، ص۱۱۔

۳۹۔ قدسیہ قریشی،اردوسفر نامے انیسویں صدی میں، ص۴۰۔

۴۰۔ آزاد، محمد حسین،سیر ایران، مرتبہ، آغا محمد طاہر،(لاہور: کریمی پریس،۱۸۸۶ء)، ص۷۔

۴۱۔ یوسف خان کمبل پوش،عجائبات فرنگ،(لکھنو: مطبع نول کشور،۱۸۹۸ء)، ص۸۸۔

۴۲۔ انور سدید، اردو ادب میں سفرنامہ، ص۵۲۔

۴۳۔ قدسیہ قریشی، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں ،ص۱۵۔

۴۴۔ نواب لیاقت جنگ بہادر،سفر نامہ یورپ و امریکہ،(دکن:۱۹۴۷ء)، ص۲۷۹۔

۴۵۔ قدسیہ قریشی، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں ،ص۷۰۔

۴۶۔ اسلم فرخی، کنارے کی دھوپ مشمولہ دھوپ کنارہ از جمیل زبیری،(کراچی: بیلا پبلی کیشنز،۱۹۸۱ء)، ص۱۲۔

۴۷۔ انور سدید،اردو ادب میں سفرنامہ، ص۲۷۔

۴۸۔ نعمانی، شبلی،سفرنامہ روم، و مصر و شام،(دہلی: قومی پریس،۱۸۸۱ء)، ص۴۹۔

۴۹۔ سرسید احمد خان،،مسافران لندن،(لاہور: مجلس ترقی اردو،۱۹۶۱ء)، ص۸۔

۵۰۔ تنویر حسین، پروفیسر،اصناف ادب اردو،(لاہور: مقبول اکیڈمی،۲۰۰۹ء)، ص۲۳۰۔

۵۱۔ امجد علی شاکر،دو قومی نظریہ: ایک تاریخی تجزیہ،(لاہور:۲۰۰۹ء)، ص۳۱۔

۵۲۔ غلام حسین ذوالفقار،اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر،(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)، ص۶۹۔

۵۳۔ ایضاً، ص۷۱۔

۵۴۔ حامد مرزا بیگ،اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ، ص۲۶۔

۵۵۔ نجیبہ عارف،اٹھارھویں صدی کا ایک نادر سفر نامہ روس و چین، مشمولہ،بازیافت، جلد۲۵،(جولائی تا دسمبر۲۰۱۴ء)، ص۵۴۔

۵۶۔ ایضاً، ص۵۵۔

۵۷۔ نجیبہ عارف، جنوبی ایشیا میں اولین سفر نامہ انگلستان تاریخ جدید، مشمولہ، بنیاد، (جلد ۵، ۲۰۱۴ء)، ص۱۲۵۔

۵۸۔ نجیبہ عارف، *Indology and South Asia Study*، ۲۰۱۴ء، ص۳۱۔۳۲۔

۵۹۔ انور سدید، اردو ادب میں سفر نامہ، ص۱۰۷۔

۶۰۔ قدسیہ قریشی، اردو سفرنامے انیسویں صدی میں، ص۲۵۵۔

۶۱۔ انور سدید، اردو ادب میں سفر نامہ، ص۵۳۷۔

۶۲۔ مرزا حامد بیگ، اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء)، ص۳۷۔

۶۳۔ جیلانی کامران، حج کے سفر ناموں کی روایت، مشمولہ، ماہ نور، (نومبر ۱۹۷۸ء)، ص۵۱۔

باب دوم

نوآبادیاتی عہد اور اردو سفر نامے

باب دوم

نوآبادیاتی عہد اور اردو سفر نامے

الف۔ نوآبادیاتی عہد: ایک جائزہ

کسی طاقت ور ملک کا اپنی سرحد سے باہر، کسی دوسرے ملک کی حکومت کو ختم کر کے وہاں اپنی حکومت کو مستحکم کرنا اور مقامی لوگوں کے حقوق کا استحصال کر کے اپنی معیشت کو مضبوط کرنا نوآبادیات کہلاتا ہے۔ اس کے لیے انگریزی میں Colonialism اور اردو میں نوآبادیات کی اصطلاح رائج ہے۔ ڈکشنری آف دی انگلش لینگوئج (Dictionary of the English Language) کے انسائیکلو پیڈیا ایڈیشن میں نوآبادیات کے متعلق یہ تعریف درج ہے۔

> The Policy of a nation seeking to acquire, extend or retain overseas dependencies. [1]

اس طرح آکسفورڈ انگلش ڈکشنری (Oxford English Dictionary) کے مطابق نوآبادیات سے مراد:

> A settlement in a new Country .....a body of people who settle in a new locality, forming a community Subject to or connected with their parent state, the Community so formed, consisting of the original settlers and their descendants and successors as the connnection with parent state is kept up. [2]

نوآبادیات کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے۔ یہ ایک ایسا منظم نظام ہوتا ہے جس میں کسی غیر ملکی قوم کا دوسری

بیرونی اور نسبتاً غیر آباد ملک میں آباد ہونا، اپنی خوراک ورہائش کا بندوبست کرنا مگر اپنے اصل ملک سے بھی جڑے رہنا نوآبادی نظام ہے۔ اس کی وضاحت انگریزی کی لغت *Longman* میں اس طرح درج ہے۔

> Control by one power over a dependent area of people.
> A Policy advocating based on such control.[3]

اس تعریف کے مطابق کسی بھی خطے کی محکوم قوم یا کسی بھی ملک پر اقتدار حاصل کرنے کو نوآبادیات کہا گیا ہے جو عام حکومتی عمل سے کسی طرح بھی مختلف نہ ہو۔ اس طرزِ عمل کے بارے میں ایک ماہر ادیبہ Gina Wisker اپنی رائے کا اظہار یوں کرتی ہیں:

> Colonialism means the settlement of people and so the colonization of lands by powers from other, usually economically richer, more powerful lands.[4]

دی انسائیکلو پیڈیاامریکہ *(The Encyclopedia America)* میں نوآبادیات سے مراد یہ ہے:

> بہت سی یورپی طاقتوں نے اپنی آبائی ریاستوں سے معاشی اور عسکری فوائد کے لیے یورپ سے باہر جو سکونت (Settlement) اختیار کی اسے نوآبادیات کہا جائے گا۔[۵]

کولونیل ازم میں طاقت ور طبقہ کمزوروں پر حاوی ہوتا ہے اور وہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر دوسروں کا استحصال کر کے خود کو مضبوط سے مضبوط تر کرتا چلا جاتا ہے۔ کولونیل ازم جو تقریباً ہمیشہ امپیریل ازم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ دور دراز خطے پر آبادکاری کو مسلط کرنے کا نام ہے۔[۶] نوآبادکار خود کو مستحکم اور قابض کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتا ہے اور اس کی دو صورتیں ہیں یا تو وہ اپنی طاقت سے دوسروں کو کچل کر اپنا مطیع و تابع بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ ملک میں ایسی حکمت عملی اختیار کرتا ہے کہ محکوم آبادی اسے اپنا ہمدرد سمجھیں۔ نوآبادیاتی نظام ایک ایسا قابضانہ نظام ہے کہ جس میں محکوم قوم کی ساری صلاحیتیں مفلوج کر کے اسے اپنا دستِ نگر بنا کر اپنا مفاد

حاصل کیا جاتاہے۔نوآبادیات کی تعریف کے متعلق مختلف کتب اورلوگوں میں کافی تضاد پایا جاتا ہے۔

کولونیل ازم یانوآبادیات میں طاقت ور قومیں طاقت کے بل بوتے پر اپنے خاص تجارتی مقاصد کے حصول کے لیے، کسی دوسرے علاقے پر اپنا تسلط قائم کر لیتی ہیں۔ وہ نہ صرف وہاں کے مقامی باشندوں کو اپنا محکوم بناتی ہیں بلکہ ان کی معیشت، ثقافت، زبان وادب، معاشرے اور ہر ایک چیز کو اپنے قبضے میں کر لیتی ہیں۔ ہر چیز کو مکمل طور پر اپنے قبضے میں کرنے کے بعد سامراجی قوتیں مقامی لوگوں کا استحصال شروع کر دیتی ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے وہ اپنی تمام تر طاقت کو بروئے کار لاتی ہیں۔

نوآبادیاتی نظام طاقت کے بل بوتے پر قائم کیا جاتا ہے اور محکوم آبادی کو اپنے قبضے میں مستقل طور پر رکھنے کے لیے طاقت کے نئے نئے حربے استعمال کیے جاتے ہیں اور یہ لوگ اپنا دیرپا تسلط قائم رکھنے کے لیے انھیں ذہنی طور پر غلام بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ محکوم آبادی سے سیاسی، ثقافتی اور ذہنی اطاعت کا تقاضا بھی کرتے ہیں۔ وہ یہ سب بڑی منصوبہ بندی سے کرتے ہیں۔ نوآبادکار مقبوضہ علاقے کے محکوموں کو حکومتی امور میں مداخلت کی اجازت نہیں دیتے بلکہ انھیں کم تر درجے کی نوکریاں فراہم کی جاتی ہیں اور کچھ لوگ انھیں ایسے بھی مل جاتے ہیں جنھیں یہ لوگ اپنے سامراجی مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کرتے ہیں ، نوآبادیاتی نظام کے متعلق ایڈورڈ سعید لکھتے ہیں کہ سامراجیت کا مطلب اپنے تصرف سے باہر کی، دور دراز اور دوسروں کی زیرِ ملکیت زمین کے متعلق سوچنا، وہاں آباد اور قابض ہونا ہے۔ ۷

نوآبادیات دراصل ایک نظریہ ہے، ایک رجحان ہے کہ طاقت ور اقوام جب مفتوح اقوام پر قبضہ کر لیتی ہیں اور وہ انھیں اپنا محکوم بنا لیتی۔ تو وہ ان کے سماجی و سیاسی، معاشرتی، ثقافتی نظام پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ فاتح قوم محکوم سے ان کا کلچر چھین کر انھیں اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ سب سے پہلے وہ لوگ ان کی زبان کی اہمیت ختم کر دیتے ہیں اور مفتوح قوم پر یہ احساس ڈالتے ہیں کہ وہ ہی برتر ہیں کیونکہ زبان ہی سب سے بڑا آلہ کار ہے کسی قوم کو اپنے قبضے میں کرنے کا اور وہ زبان تبدیل کرتے ہیں اور وہ اپنی حکمت عملیوں سے اپنی اقتدار کو وسعت دیتا جاتا ہے۔ ایسے عمل میں محکوم آبادی مزاحمت تک کرنے کا حوصلہ کھو دیتی ہے۔ اس طرح وہ قابض قوم کو اپنا آقا تصور کرتے ہوئے اپنی قسمت پر صابر وشاکر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

نو آبادیات میں طاقت اور اختیار کو برابر وسعت دینے کی انمٹ پیاس ہوتی ہے مگر یہ صرف سیاسی اطاعت میں اکتفا نہیں کرتی۔ یہ محکوم آبادی سے ثقافتی اطاعت شعاری کا تقاضا بھی کرتی ہے۔ چونکہ یہ تقاضا سیاسی اطاعت کے مقابلے میں بڑا ہے کہ سیاسی اطاعت میں نئے طرز حکمرانی کے خلاف بغاوت نہ کرنے کا عہد ہوتا ہے، جب کہ ثقافتی اطاعت شعاری کا مطالبہ انسانی وجود کے ان حصوں کو سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کرتا ہے جو صدیوں کے پھیر میں صورت پزیر ہوتے، ایک خاص شکل اختیار کرتے، اس کے تحت زندگی اور کائنات سے رشتوں کا نظام پیدا کرنے، علمی و تخیلی سر گرمیوں کو خاص سمت دیتے اور اجتماعی شناخت قائم کرتے ہیں۔ [۸]

دنیا کے ہر خطے میں بادشاہت، شہنشائیت اور سامراجی نظام طاقت کے زور پر قابض ہوتے رہے ہیں اور زمانہ قدیم سے لے کر آج تک ایک ملک دوسرے ملک پر اپنی حکمت عملیوں اور طاقت کا استعمال کر کے تسلط قائم کرتے رہے ہیں۔ یہ آبادکار دوسرے ملکوں پر قبضہ کرنے کے لیے یکساں نو آبادیاتی حکمت عملی اختیار نہیں کرتے بلکہ ہر دوسری جگہ نئی حکمت عملی اور طاقت کے تصورات الگ الگ ہوتے ہیں۔ نو آبادیات قائم کرنے کے لیے سب سے پہلے منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ پھر ہر ملک کے مقامی حالات اور زمینی حقائق کے مطابق پالیسیاں بنائی جاتی ہیں اور سامراجیت قائم کرنے کی مختلف تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں۔ یہی طاقت کی کشمکش اور مصنوعات کی منڈیوں کی تلاش نے نو آبادیاتی نظام کو جنم دیا۔

جب ہم کرہ ارض پر نو آبادکاری کی شروعات پر غور و فکر کریں تو انسان کی اولین تہذیبی مصروفیات کی ابتدائی حالتوں کو دیکھنا چاہیے کہ ابتدائی انسانوں نے اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے گروہ تشکیل دیئے، یہ گروہ آپس میں ایک دوسرے کی ذمہ داری ہوتے تھے اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھیں اپنی بقا کے لیے نئی نئی مہارتوں کی ضرورت پڑی۔ اسی ضرورت کے تحت انسانوں میں سوچنے کی صلاحیت پیدا ہوئی اور وہ زندگی گزارنے کے طریقے ایجاد کرنے لگا۔ خوراک انسان کی ابتدائی ضرورت ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی ضروریات تبدیل ہونے لگیں اور حصول ضروریات کے لیے گروہوں کا آپس میں اتحاد مجبوری بن گیا۔ [۹]

مطلب یہ کہ انسان کی بقا علیحدہ رہنے میں ناممکن ہے۔ اب مختلف گروہ اپنی ضروریات کے تحت جب آپس میں اکٹھے ہوئے تو ان سب کے درمیان نظم و نسق قائم رکھنے کے لیے ایک طاقت ور سردار کا ہونا ضروری تھا جو ہر گروہ کے فرد کی ضروریات کا خیال رکھتا تھا۔ آپس کے میل ملاپ اور پھیلاؤ سے پھر معاشرہ وجود میں آیا۔ اس طرح وقت

گزرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کے نظام میں وسعت آئی اور بادشاہ، غلامی، مذہب، ثقافت، سیاست، معاشرت اور مختلف ادارے بننے لگے۔ انسان منزل بہ منزل آگے بڑھتا گیا اور معاشرے مملکتوں میں جب تبدیل ہو گئے تو پھر طاقت اور ملکیت کی بنیاد پر طبقاتی نظام وجود میں آیا۔ اس نظام میں طاقت ور طبقہ کمزور طبقے پر حاوی تھا۔ یہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے کرتے دوسروں کے علاقوں پر قبضہ کرنے لگے۔ اسی طاقت کے غلبے کی خواہش نے نوآبادیاتی سوچ پیدا کی۔ سید سبط حسن رضوی لکھتے ہیں:

> سومیر اور بابل کے بیوپاریوں نے (اس دور کے) ان خطرات کی پرواہ نہ کی اور اناطولیہ، سندھ، کنعان، مصر اور ایران، مختصر یہ کہ اس وقت کی پوری مہذب دنیا کا استحصال کرتے رہے۔ خام مال کی خریداری اور مصنوعات کی فروخت ان کا بنیادی مقصد ہوتا تھا۔ دنیا کی اہم تجارتی منڈیوں میں ان کی نوآبادیاں قائم تھیں۔ [۱۰]

جدید نوآبادیات کا آغاز ۱۵۰۰ء میں اس وقت ہوا جب یورپی اقوام نے افریقہ اور امریکہ میں اپنی تجارتی منڈیوں کے لیے نئے سمندری راستے دریافت کیے اور اس عمل سے طاقت کا محور بری راستوں سے بحری راستوں میں بدل گیا۔ اس دور میں فرانسیسی، انگریزی، پرتگالی، ولندیزی، اسپینی قومیں ابھریں اور انھوں نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر فتوحات حاصل کرنا شروع کیا۔ اس طرح پوری دینا میں قبضے، فتوحات اور نوآبادیاں قائم ہونا شروع ہوئیں۔

زمانہ قدیم سے ہی ہندوستان بیرونی حملہ آوروں کے لیے کشش کا باعث رہا ہے۔ اس سلسلے میں آریاؤں کی آمد کو خاص اہمیت حامل ہے۔ یہ قوم وقتاً فوقتاً یہاں آکر آباد ہوتی رہی بلکہ سینکڑوں سال تک ان کے قبائل برعظیم میں آکر یہاں کی بودوباش اور زبان پر اثرات ڈالتے رہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کے جانثاروں نے مغرب میں ایشیا کوچک، شمالی افریقہ، ہسپانیہ اور مشرق میں عرب و عجم، افغانستان کو فتح کر کے وہاں اسلامی تعلیمات کو رواج دیا۔ اسلامی فتوحات کا یہ عظیم سلسلہ بنوامیہ کے دور حکومت میں کمال کو پہنچا اور اس طرح اسلامی سلطنت کی حدود سندھ وملتان تک پھیل گئی۔ مسلمان عرب فاتحین نے برصغیر میں اسلامی قانون نافذ کیا اور بہت سے غیر مسلموں کے سینوں کو اسلام کے نور سے منور کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خلافت عباسیہ کے زوال وانحطاط کے بعد بہت سی ریاستیں خود مختار ہو گئیں اور آپس میں برسرپیکار رہنے لگیں۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسری طاقتوں کو برعظیم میں عمل حاوی کا موقعہ ملا۔ [۱۱]

سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۰۱ء میں ہندوستان پر حملہ کیا اور پنجاب کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے غوری، خاندان غلاماں، خلجی، تغلق، خاندان سادات، لودھی اور مغل سلاطین حملہ آور ہوتے رہے اور برصغیر میں اپنی نو آبادیاں قائم کرتے رہے۔ برصغیر پاک وہند دریاؤں، پہاڑوں، صحراؤں کی سرزمین ہونے کے ساتھ قدرتی دولت سے مالا مال خطہ ہے اور یہ زمانہ قدیم سے ہی اپنی زرخیزی، شادابی اور قدرتی ذرائع رکھنے کی وجہ سے پوری دنیا کے حملہ آوروں کے لیے کشش کا باعث رہا ہے۔ بہت سے سیاح اس کے طلسم کے زیر اثر سیاحت کرنے پر مجبور ہوئے اور انھوں نے اپنے سفر ناموں میں اسکے حسن اور زرخیزی کے علاوہ یہاں کی تہذیب و معاشرت کو بھی عمدہ الفاظ میں سراہا ہے۔

سولھویں صدی عیسوی میں انگریز تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے اور انھوں نے اپنی چالاکی سے تجارتی مقاصد کی تکمیل کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے تجارتی حقوق حاصل کیے۔ اور انھوں نے مدراس اور سورت میں تجارتی کوٹھیاں بنائیں۔ بھگت سنگھ لکھتے ہیں کہ :

> انگریزوں نے ۱۶۱۲ء میں سورت کے مقام پر اپنی پہلی مستقل چھاؤنی قائم کی اور ہندوستان سے گرم مصالحہ، نفیس کپڑا وغیرہ یورپ لے جا کر دولت کمانے لگے۔ انگریزی حکومت کا سفیر (سر تھامس رو) بادشاہ جہانگیر کے دربار پہنچا اور اس نے ۱۶۴۱ء میں مدراس کے مقام پر اپنا تجارتی اڈا قائم کر لیا۔ ۱۶۶۵ء میں انگریز بمبئی پہنچ گئے۔ اس طرح مغل بادشاہوں سے رعایت لیتے ہوئے وہ ۱۶۹۰ء میں ہگلی دریا کے کنارے مچھیروں کے ایک گاؤں میں پہنچے اور تجارتی مرکز قائم کر لیا۔ یہی گاؤں بعد میں کلکتہ بنا۔ [۱۲]

شروع میں انگریزوں کو صرف ہندوستان میں تجارت سے دلچسپی تھی مگر اورنگزیب عالم کی وفات ۱۷۰۷ء کے بعد تخت نشینی کے حصول کے لیے مغل شہزادوں میں چھڑی خانہ جنگی نے ملک میں انتشار کی صورت حال پیدا کر کے مغل سلطنت کو کمزور کر دیا اور پھر اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نوابوں اور راجاؤں نے سلطنت کی اطاعت سے انکار کرتے ہوئے اپنی الگ الگ ریاستیں قائم کر لیں۔ جس سے مغل سلطنت کی شان و شوکت میں بہت کمی واقع ہوئی۔ مرکز کی کمزوری کے سبب ملک میں افراتفری اور انتشار پیدا ہوا، لوٹ کھسوٹ عام ہوا۔ بیرونی حملہ آور آئے دن مار دھاڑ اور لوٹ مچاتے۔ ان حالات کے متعلق ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

> ان حالات میں منصب داروں اور امراء نے اپنی حیثیت اور مراعات کو قائم رکھنے کے لیے اور اپنی جاگیروں سے زبردستی و تشدد کے ساتھ ٹیکس وصول کرنے کے لیے اپنی اپنی فوجیں رکھنا شروع کر دیں جو انکی ذات کے ساتھ وفادار ہوتی تھیں مگر یہ امراء اپنے فوجیوں کو پابندی سے تنخواہ نہیں دیتے تھے اور ان کی آمدن کے ذرائع مال غنیمت اور لوٹ مار ہوا کرتے تھے۔ تنخواہ کے مطالبہ پر ان سے کہا جاتا تھا کہ فلاں شہر اور گاؤں لوٹ لو۔ [۳۱]

ہندو پاک میں خانہ جنگی کی صورت میں بیرونی حملہ آوروں کو بھی لوٹ کھسوٹ کرنے کا موقع مل گیا جس سے امن و امان کی صورت حال خراب ہوئی اور لوٹ مار، ڈاکہ زنی کی وارداتیں عام ہونے لگیں اور معاشرہ خوف و ہراس میں مبتلا ہونے کے سبب سیاست و معیشت بھی تباہ و برباد ہو گئی۔ اس تمام صورت حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں نے ہندوستان کی اندرونی سیاست میں مداخلت شروع کر دی۔ اسی کشمکش کے نتیجے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں عسکری ضرورت کا احساس ہوا۔ اس صورت حال میں ایسٹ انڈیا کمپنی برطانوی حکومت کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئی کہ اگر کمپنی اپنے مفاد کا تحفظ چاہتی ہے اور ہندوستان میں منافع بخش کاروبار کرنے کی خواہش مند ہے تو اسے سیاسی اور عسکری معاملات میں حصہ لینا پڑے گا۔ اس طرح انھوں نے برطانوی سلطنت کو یہ باور کرایا کہ تجارتی مقاصد کے حصول کے لیے فوجی اور سیاسی غلبہ بہت ضروری ہے۔

برطانوی حکومت نے اس مطالبے کو منظور کرتے ہوئے کمپنی کو ہدایت کی کہ ہندوستان کے مقامی لوگوں کو فوجی تربیت دے کر فوج میں شامل کر لیا جائے اور انھیں تنخواہ، گھوڑا، علاج معالجے، رہائش اور پنشن کی سہولیات دی جائیں۔ اس طرح لوگوں نے بادشاہ کی بجائے کمپنی کا ملازم بننا پسند کیا اور یوں کمپنی کی فوج مقامی ریاستوں کی فوجوں سے ہر لحاظ سے بہتر اور مضبوط ہو گئی۔

انگریزوں کا اب تجارتی لین دین سے زیادہ ہندوستان کے سیاسی اور معاشی نظام میں کنٹرول بڑھنے لگا اور مختلف ریاستوں میں سازشوں کے ذریعے اقتدار کی لڑائیاں کرانا، ہندوستان کے مالی وسائل پر زیادہ سے زیادہ قبضہ کرنا اور لوگوں سے بھاری لگان وصول کرنا، یہ سب کمپنی کا معمول بن چکا تھا۔ جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) اور بکسر (۱۷۶۴ء) کی لڑائیوں نے انگریزوں کے لیے حاکمیت کے دروازے کھول دیے اور انھیں معلوم ہو گیا کہ اب ہندوستان میں ان کے مقابلے کے لیے ریاست میسور کے علاوہ کوئی قوت نہیں ہے اور پھر انگریزوں نے ہندوستان میں مکمل کامیابی حاصل

کرنے اور حکمران بننے کے لیے ریاست میسور (ٹیپو سلطان) اور نظام کے درمیان لڑائی کروائی۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل یوں رقم طراز ہیں:

> پلاسی کی فتح کے بعد بکسر کی لڑائی میں انگریزوں کی فتح نے مغلیہ حکومت یا شمالی ہند کو انگریزوں کا باج گزار بنادیا۔ اب محض جنوبی ریاست حیدر آباد (نظام) مرہٹے اور میسور کے حکمران حیدر علی ان کی راہ میں رکاوٹ تھے لیکن ان میں سے نظام نے انگریزوں کے ساتھ دوستانہ اور مفاہمانہ مراسم کو ترجیح دینے میں عافیت سمجھی۔ مرہٹے ان ہی دنوں پانی پت میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں اپنی متحدہ قوت کھو بیٹھے تھے اور جنوب میں سمٹی ہوئی ایک منتشر قوت کے طور پر باقی رہ گئے تھے ان دونوں کے مقابلے میں ٹیپو سلطان ایک تازہ اور توانا قوت کے طور پر ابھر رہا تھا۔ [۱۴]

کمپنی کے لیے جنگ پلاسی مالیہ وصول کرنے کا باعث بنی اور دوسرے علاقوں بہار، اڑیسہ اور بنگال میں وہ زیادہ مستحکم اور بااختیار ہو گئے جس کی وجہ سے انگریز سیاسی اور معاشی طور پر مضبوط ہو گئے۔ اس سے ہندوستان کی سیاست پر گہرے اثرات پڑے۔ انگریزوں نے ٹیپو سلطان کو نظام اور مرہٹوں کی مدد سے شکست دی اور پھر اس بڑے معرکے کو سَر کرنے کے بعد کمپنی کے راستے کی تمام رکاوٹیں ختم ہو گئیں تھیں۔ انھوں نے اپنی عیاری اور عسکری قوت سے ہندوستان کی اہم ریاستوں کو اپنے ماتحت کر لیا تھا۔

ان میں سے کئی ریاستیں ایسی بھی تھیں جن کا فوجی نظام کمپنی کے ذمہ تھا اور اس کے تمام اخراجات ریاست ادا کرتی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی فتوحات کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ تجارتی مراعات کے علاوہ بنگال میں ریونیو اکٹھا کرنے کا حق حاصل کرنے کے بعد بنگال کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا اور بنگال میں قحط کی صورت حال پیدا کر دی جس سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ لقمہ اجل بنے۔ [۱۵]

کمپنی کی بدعنوانیوں اور لوٹ مار کی کہانی جب سلطنتِ برطانیہ کے کانوں تک پہنچی تو برطانوی پارلیمنٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات کو سلطنت برطانیہ کی گرفت میں لانے اور اس کو اچھے طور پر چلانے کے لیے ۱۷۷۳ء میں ایک قانون "ریگولیٹنگ ایکٹ" پاس کیا۔ اس ایکٹ کے نافذ ہونے سے ہندوستان میں ایک نئے عہد (نوآبادیاتی) کا آغاز ہوا۔ علی عبداللہ یوسف کہتے ہیں کہ کہیں سے ہندوستان میں (نوآبادیاتی) تمدنی دور کا آغاز ہوا۔ اس

سے پہلے پیدا ہونے والے سیاسی اور اقتصادی ہنگامے انگریز بد نظمی کا عہد تھے۔ اہلِ ہند پر اس کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہو چکے تھے۔[۱۶]

ہندوستان اب مکمل طور پر برطانوی نو آبادیات میں شامل ہو چکا تھا اور اب اس پر دیر پا قابض رہنے کے لیے اور اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے عسکری اور سیاسی طاقت میں مزید اضافے کرنے کا سوچا گیا۔ انھوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے نئی پالیسیاں بنائی اور سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو اپنے ساتھ شامل کرنے کے لیے انھیں مراعات دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عیسائیت کو پھیلانے کے لیے انگلستان سے مشنری منگوائے تاکہ سب لوگوں کا مذہب ایک ہو جائے اور پھر انگریزی حکومت کو کسی بھی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ہندوستان میں کارپوریشن، میونسپل کمیٹیاں بنائیں، سڑکیں تعمیر کیں، ہندی نظام بنایا، برقی تار کا نظام بہتر بنانے کے ساتھ پولیس کا نظام بھی وضع کیا۔ ڈاکٹر خواجہ زکریا ان کے ترقیاتی کاموں کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ یہ سچ ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں نے سڑکیں بنائیں، ریل کی پٹریاں بچھائیں، تار برقی کا سلسلہ جاری کیا وغیرہ۔ مگر ان تمام برکات کے اصل مقاصد کچھ اور تھے ضمناً گوگوں کو کچھ اور سہولتیں بھی میسر آ گئیں۔[۱۷]

مسلمان طبقہ معاشی طور پر کمزور سے کمزور تر ہوتا گیا اور ہندوؤں نے انگریزوں کے ساتھ اپنی وفاداری ثابت کرتے ہوئے ملازمتوں اور تجارت میں آگے بڑھنے لگے اور وہ تمام شعبہ ہائے زندگی پر چھا گئے۔ نو آبادیاتی استحصال کی وجہ سے مسلمانوں کی زمین بنجر ہونے لگی اور ملازمتوں کے دروازے بھی ان پر بند کر دیے گئے کیونکہ انگریزوں نے ملازمتوں کا کوٹہ میں بھی ہندو مسلم تفریق کو ذہن میں رکھ کر ترتیب دیا تھا۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں میں احساسِ محرومی بڑھ گئی۔ انھوں نے فارسی زبان کی حاکمیت ختم کرنے کے لیے اردو کو سرکاری اور دفتری زبان کے طور پر رائج کیا جس سے مسلمانوں کا لسانی تفاخر اور احساس برتری ختم ہوا۔ نو آبادیاتی دور کا تجزیہ کرتے ہوئے ناصر عباس نیر کہتے ہیں:

> برصغیر کا یہ دور وہ نو آبادیاتی دور تھا جس میں ہندوستان میں انگریزوں کا تسلط مکمل ہو چکا تھا اور انگریز اپنے برطانوی تسلط کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے لیے یہاں کی آبادی کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھ رہے تھے۔ جس میں وہ دوسری قوتوں کی نسبت مسلمانوں کو اپنا سب سے بڑا حریف اور دشمن سمجھتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ وہ بطور حکمران تعلیم، سیاست اور ملکی وسائل میں مسلمانوں کو کسی قسم کی مراعات دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ [۱۸]

انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ مختلف حربے استعمال کیے۔ جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ لوگوں میں انکی اپنی تہذیب و ثقافت اور زبان سے بے زاری پیدا کی اور ان کو باور کرایا کہ ان کے زوال کا سبب خود ان کا قدیم نظامِ سیاست اور تہذیبی اقدار ہیں جو کہ جدید انگریزی نظام کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس طرح نوآبادیاتی نظام نے ہندوستانیوں کے رسم و رواج، زبان و ادب، تہذیب و ثقافت اور تعلیمی نظام پر اپنی گہری چھاپ لگانے کی کوشش کی۔ انگریزوں نے لسانی مسائل پیدا کیے۔ فارسی کو دفتری اور سرکاری زبان سے ہٹا کر اردو اور انگریزی زبان کو رواج دیا۔ جب فارسی کی حاکمیت ختم ہوئی تو مسلمان اپنی زبان اور ادبی روایات سے دور ہونے لگے۔ اب جو کبھی حاکم تھے وہ سپاہی بننے پر مجبور ہو گئے، انصاف کا عمل ختم ہو رہا تھا کیوں کہ مسلمان قاضیوں کو عدالتوں سے فارغ کر دیا گیا اور قوانین ایسے بنائے گئے جس میں حاکم اور محکوم کے لیے الگ الگ قوانین تھے۔ اس نظام نے انگریزی زبان اور آمرانہ قوانین لاگو کر کے خود کو ہندوستان میں مستحکم کیا۔

برطانوی حکومت جب دوسرے ملکوں (خاص کر امریکہ) میں اپنی نوآبادیاں قائم رکھنے میں ناکام ہو گئی تو انھوں نے اس کے متبادل کے طور پر ہندوستان کی سرزمین کو غذائی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے منتخب کیا اور لارڈ کارن والس کی اس تجویز پر ہندوستان میں دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام متعارف کروایا گیا۔ باری علیگ اس ضمن میں کہتے ہیں:

> انگلستان کو اب امریکہ کے بدل کی ضرورت تھی۔ وزارتِ انگلستان نے مشرق میں اس نقصان کو پورا کرنے کی ٹھانی۔ انگلستان کو وسعتِ سلطنت درکار تھی، امریکہ یا ہندوستان؟ اس سے کیا سروکار؟ امریکی نوآبادی نے اگر انگلستان سے آزادی حاصل کر لی تو کیا ہوا؟ انگلستان نے اب ہندوستان کے پاؤں میں زنجیریں ڈالنے کا عہد کر لیا اس ادارہ کی تکمیل کے لیے وہی شخص موزوں ہو سکتا تھا۔ جس نے امریکہ کو واشنگٹن کے حوالے کیا۔ کارن والس چونکہ جنگِ آزادی کو دبانے میں ناکام رہا تھا۔ اس لیے اسے ہندوستان میں برطانیہ کے لیے ایک وسیع سلطنت قائم کرنے کی غرض سے بھیج دیا گیا۔ [۱۹]

ہندوستان پر مکمل نو آبادی قائم کرنے کے بعد خوراک کی ضروریات پوری کرنے کے لیے زرعی نظام میں تبدیلیاں لائی گئیں۔ جدید مشینری کے استعمال کے ساتھ ساتھ نہروں کا جال بچھا دیا گیا۔ زمین داروں کو زمین کی ملکیت دینے کے علاوہ ہندوستان میں وراثتی جاگیر کا قانون بھی دیا۔ جس سے غریب کسانوں کا استحصال ہوا اور اس وجہ سے بنگال اور بہار میں "تیتومیر" اور "دودھو میاں" کی مشہور کسان بغاوتیں ہوئیں۔ یہ بغاوتیں اس لیے پیدا ہوئیں کہ انگریز اپنی پسند کی نقد آور فصلیں نیل، افیون اور پٹ سن کاشت کرواتے تھے جس سے خوراک میں استعمال ہونے والی فصلوں پر توجہ نہ دینے کی وجہ سے قحط کی صورت حال پیدا ہوئی اور بہت سے ہندوستانی موت کے منہ میں چلے گئے اس طرح کسان طبقہ بھی انگریزوں کے خلاف ہو گیا۔

دوسری طرف انگریزوں نے ہندوستانیوں کو اپنے سے کم تر، گھٹیا اور غیر مہذب قوم کہہ کر ان میں احساس کمتری پیدا کرنے کا بھی پروپیگنڈا کیا اور اپنے علوم و فنون کو ان پر تسلّط کیا۔ ایڈورڈ سعید کی رائے میں:

> نو آبادیاتی حکمران، مقامی باشندوں کے ماضی بعید سے دلچسپی یہ ثابت کرنے کے لیے ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا کلچر مردہ ہو چکا ہے، وہ معاصر دنیا میں کلچر سے محروم ہیں۔ مقامی باشندوں میں یہ نفسیاتی ایقان پیدا کرنے کے بعد انھیں مہذب بنانے کا منصوبہ شروع کیا جاتا ہے۔ [۲۰]

اس لیے انھوں نے ایسا تعلیمی نظام بنایا جس میں ہندوستانی لوگوں کو نام نہاد مہذب بنا کر یورپی مفادات کے قابل بنایا تھا۔ انگریزوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سکول و کالج کھولے اور فورٹ ولیم کالج انھیں مقاصد کی تکمیل کا شاخسانہ تھا۔ اس کے قیام کا مقصد ہندوستانی زبانوں کے فروغ کی بجائے انگریز افیسروں کو مقامی زبانوں سے آشنا کرانا تھا تاکہ وہ امور سلطنت بہتر طور پر انجام دیں سکیں۔ انھوں نے فارسی زبان کی اہمیت ختم کر کے انگریزی زبان کو فروغ دیا اور ہندوستانیوں کی ثقافت، زبان، ادب، اور تمدن سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ انیسویں صدی میں یورپ میں آزادی کے تصورات کو اجاگر کیا گیا اور فلسفہ، نفسیات اور سوشل ریفارمز کی بڑی تحریکیں چلائی گئیں۔ جمہوریت کو ضروری سمجھا گیا اور عورتوں کو ان کے حقوق و آزادی دی گئی۔ ایسی اصلاحات سے ایک نئی روح پیدا ہوئی جس میں ایک ایسے پلیٹ فارم کی کمی محسوس کی گئی جس کے ذریعے وہ انگریزوں سے اپنے مطالبات منوا سکیں۔ آل انڈیا کانگرس کی بنیاد رکھی گئی اور ایک باشعور طبقے نے اس جماعت کی قیادت سنبھالی۔ اس جماعت کے کوئی سیاسی مقاصد نہ تھے کیوں کہ اس پارٹی کے پہلے چارٹر میں مطالبات اور مسائل کا ذکر ہوا تھا اور چند اصلاحات کی خواہش بھی کی گئی تھی۔ ایک

طویل عرصے تک یہ جماعت مطالبات پیش کرتی رہی اور پھر بعد میں جب ہندوستان کے سیاسی اور سماجی رویے میں تبدیلی نظر آئی تو اس جماعت کا نام آل انڈیا نیشنل کانگرس رکھ دیا گیا۔ عبداللہ ملک لکھتے ہیں:

> انگریز نے انہی ضرورت کے لیے انڈین نیشنل کانگرس جو ایک انگریز افسر مسٹر ہیوم کے ذریعے قائم کی تھی لیکن جیسے جیسے یہ جماعت منظم ہوتی گئی اور ہندوستانیوں کے حقوق کے لیے اس کی آواز میں قدرے کھن گرج آنے لگی تو کچھ انگریز افسروں کو یہ بات کھلنے لگی۔ [۲۱]

ہندوؤں کو اس بات کی تربیت بھی دی گئی کہ کسی ایک پلیٹ فارم سے پیش کیے گئے مطالبات زیادہ پُر اثر اور قانونی ہوں گے۔ برطانیہ یورپ کا ایک عیسائی ملک تھا جس نے اپنا خرچ خود بنالیا تھا۔ بادشاہ چرچ آف انگلینڈ کا سربراہ ہوا کرتا تھا اور یہاں بہت سے حکومتی طریقہ کار رائج تھے۔ انگریزوں کے غیر مساویانہ سلوک نے انہی لوگوں میں رشوت ستانی میں بھی اضافہ کیا۔ اسی وجہ سے ان لوگوں نے مختلف باتیں بھی سیکھیں جو بعد میں ان کے کام آئیں اور وہاں کے لوگوں کو یہ احساس بھی ہوا کہ وہ اکثریت میں ہیں اور قدیم ترین تہذیبوں کے مالک ہیں اور یہ کہ انہیں انگریزوں سے لڑنا چاہیے۔

بیسویں صدی کے آغاز سے ہی برطانوی حکومت نے مشکلات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ بنگال میں انتظامی امور ٹھیک طریقے سے نہیں چل رہے تھے جس کے باعث اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ برطانوی حکومت کی بد انتظامی اور سرکاری نظم و نسق کی کمزوری کے باعث یہ فیصلہ لیا گیا تھا کہ ہندوؤں کے سخت ردِ عمل کی وجہ سے انہیں یہ فیصلہ واپس لینا پڑا۔ ۱۹۰۵ء میں جب تقسیم بنگال ہوا تو مسلمانوں کی خوشی کی انتہا نہ تھی کیوں کہ وہ اس فیصلے سے مستقبل میں معاشی و معاشرتی حالات میں بہتری کے آثار دیکھ رہے تھے لیکن ہندوؤں نے ہنگامے شروع کر دیے اور بالآخر برطانوی حکومت کو تقسیمِ بنگال کا فیصلہ واپس لینے کا اعلان کرنا پڑا۔ اسی بنا پر ہندو مسلم تضاد میں شدت آئی اور مسلم لیگ متحرک ہو گئی۔ اب ہندوستانی معاشرے میں مذہبی اور قومی تحریکیں بھی اپنی پوزیشن مضبوط کرنے لگیں اور سیاسیات کا لوگوں کی زندگی پہ گہرا اثر پڑنا شروع ہو گیا۔

انگریزوں نے اپنے مفادات کے حصول کے لیے اردو ہندی تنازع کو ہوا دی جس سے لسانی فسادات نے جنم لیا۔ اسی طرح لارڈ میکالے کے تعلیمی نظام سے ہندوستان میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جو سلطنت برطانیہ کے حکومتی امور میں مدد گار ثابت ہوا اور انھوں نے انگریزی نظام تعلیم کو اپنا کر ملازمتوں کے دروازے خود پر وا کیے۔ اس نازک موقع

پر سر سید احمد خان نے ہندوستان کے مسلمانوں کو جدید تعلیم حاصل کرنے کی تلقین کی اور مسلمانوں کو جدید علوم و فنون سے آراستہ کرنے کے لیے عملی کوششیں بھی کیں۔ سر سید احمد خان کی ردِ نوآبادیات کے حوالے سے یہی کوشش کم اہمیت کی حامل نہیں کہ انھوں نے مسلمانوں میں قومیت کا تصور پیدا کیا۔ [۲۲] احساس کمتری ختم کر کے ان کے اندر ایسا اعتماد پیدا کیا جو تقسیم ہند کا باعث بنا۔

ایڈورڈ سعید نے مغربی طاقتوں کے مشرق میں استبداد اور استعماری غلبے کو بڑی وضاحت اور دلائل کے ساتھ اپنی ایک فکر انگیز کتاب شرق شناسی (*Orientalism*) میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے مغربی سامراج کے سائے میں پنپنے والی شرق شناسی کی علمی و تحقیقی کاوشوں، تحریکوں اور مشرق کے بارے میں مغربی خیالات کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے مطابق مغرب نے مشرق پر غلبہ حاصل کرنے اور اپنے اس غلبے کو دوام بخشنے کے لیے مشرق کے بارے میں ایسا علم ایجاد کیا جس میں مشرق کو ہر لحاظ سے مغرب کے مقابلے میں بہت پس اور پس ماندہ کر کے دیکھا گیا ہے تا کہ اہلِ مغرب کی نظروں میں مشرق بے حیثیت، بے ترتیب، بد شکل اور کم علم رہے۔ ایسے علم کو انھوں نے شرق شناسی کے نام سے متعارف کروایا ہے اور ایڈورڈ سعید کے بقول شرق شناسی مفادات کا ایک تانا بانا ہے۔ [۲۳]

یہ مغربی ملوکیت کا حامی علم مشرقی قوموں کے ماضی اور حال کے اپنے سیاسی ایجنڈے کی روشنی میں نئی تعبیر کرتا ہے اور غلاموں کو غلامی پر رضامند رکھنے کے لیے نت نئے منصوبے تیار کرتا ہے۔ اہلِ یورپ نے اپنے نوآبادیاتی نظام کی تشکیلِ نو اور اسے مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے مشرق اور اسلام کے متعلق ایک گھٹیا اور کم تر تصور دنیا کے سامنے پیش کیا تا کہ مشرقیوں کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر کے انھیں ایک مغلوب قوم بنایا جائے اور پوری دنیا کو ان سے متنفر کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے خود کو ایک اعلیٰ تہذیب یافتہ قوم کہہ کر مشرقی قوم کی تربیت اور انھیں مہذب بنانے کی ذمہ داری لی۔ بقول ایڈورڈ سعید کہ شرق شناسی کھوئی ہوئی چیز یا مشرق کے بارے میں یورپی تخیل کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ یہ نظریاتی اور مستقل کام ہے جس کو باقاعدہ منصوبہ بندی سے شروع کیا گیا ہے اور جس میں نسل در نسل سرمایہ کاری کی گئی ہے۔ [۲۴]

مشرقی قوم سے متعلق اس قسم کے نظریات کے خاتمے کے لیے شرق شناسی کا علم ضروری تھا تا کہ سب سے پہلے مشرق کو اچھی طرح سے جان لیا جائے اور پھر اس پر مکمل طور پر قابض ہونے کے لیے، مشرق کے متعلق گھٹیا افواہیں اور ادب شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مغرب والوں نے نہ صرف سیاحت کی بلکہ بہت سے

لوگوں سے اس قسم کے کاموں کو کروانے پر مامور کیا گیا۔ مشرق کی اصطلاح مغرب والوں کی اختراع ہے اور انھوں نے اس لفظ کو نئے مفاہیم دیے اور اس لفظ کے درپردہ وہ خود کو مشرق کے بر خلاف لیتے تھے مگر ثابت یہ کرتے تھے کہ وہ اہلِ مشرق کے خیر خواہ ہیں۔ مشرق پر سب سے پہلے تحقیق کرنے ملک فرانس اور برطانیہ تھے۔ [۲۵]

یورپیوں کے نزدیک مشرق وہ ہے جو متعارف کروایا گیا ہے اور انھوں نے اس علم کو اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کیا۔ ایڈورڈ سعید نے شرق شناسی کے متعلق اپنی بحث کو مدلل بنانے کے لیے بہت سے شرق شناسی کی کتابوں کا تجزیہ بھی پیش کیا اور مغرب کی مشرق کے بارے میں سوچ کا احاطہ بھی کیا ہے۔ ایک جگہ ایڈورڈ سعید مغربی شرق شناسی لارڈ کرومر کا مشرق کے متعلق نظریہ یوں پیش کرتے ہیں:

دنیا مغربی لوگ ہیں، مشرقی بھی۔ اول الذکر حکومت کرتے ہیں اور ثانی الذکر کو لازماً محکوم ہونا چاہیے۔ اس کا عام فہم مطلب یہ ہے کہ مشرقی ممالک پر مغربی ممالک کو قبضہ کر لینا چاہیے۔ ان کے اندرونی معاملات کی سخت پابندی ہو اور ان کا تن من دھن کسی ایک یا کسی دوسری مغربی طاقت کے قبضہ میں ہو۔ [۲۶]

شرق شناسی میں ایڈورڈ نے نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی صورت حال میں مغرب کی سوچ کا محققانہ اور تنقیدی جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ان وجوہات کی بھی نشان دہی کی ہے جس سے مغرب میں مشرق کے بارے میں متضاد اور غلط قسم کے تصورات نے جنم لیا۔ وہ مشرقی قوموں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ ان سامراجی نظریات کو رد کر کے، اپنے ماضی کی مسخ تصویروں کو قبول نہ کریں بلکہ اپنے ماضی کی خود بازیافت کریں۔

ب۔ نوآبادیاتی عہد میں اردو سفر نامے

نوآبادیاتی عہد میں ذرائع آمدورفت میں آسانی پیدا ہونے سے لوگوں میں سفر کی جانب رغبت بڑھی اور انھوں نے دور دراز کے سفر اختیار کیے۔ ان میں مغرب کے سفر، دیار مقدسہ کے سفر، سیاسی و سفارتی سفر، علمی سفر اور تجارتی و تفریحی سفر شامل ہیں۔ ان اسفار سے واپسی پر تمام واقعات و مشاہدات کو سفر نامے کی صورت میں تحریر کرنے کا رواج بڑھا اور بہت سے سفر نامے تخلیق ہوئے۔ یہ عہد سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشرتی لحاظ سے بڑا اہم دور ہے۔ اس دور کے سفر ناموں کا مطالعہ دراصل اس عہد کے سیاسی و سماجی منظر نامے کا مطالعہ ہے۔

یوں تو ہندوستان میں نوآبادیاتی عہد کی ابتدا ستر ھویں صدی سے ہوئی لیکن ہندوستان کو ایک سلطنتِ برطانیہ کی باقاعدہ نوآبادیاتی حیثیت ۱۸۵۷ء کے بعد دی گئی اس کے بعد ہندوستان کے ادب پر مختلف الجہت اثرات اور بہت سی نئی اصناف متعارف کروائی گئیں اور زبان واسلوب میں بھی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔اس دور میں مقبول ہونے والی نثری اصناف میں سفر نامہ بھی شامل ہے۔ یہ سفر نامے مختلف قسم کے اور مختلف مقاصد کے تحت لکھے گئے تھے۔ذیل میں نوآبادیاتی عہد کے ان سفر ناموں کا اجمالی تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

ا۔دیار مقدسہ کے سفر:

مذہب انسانی زندگی کا اٹوٹ انگ ہے اور اس میں کچھ فرائض ایسے ہوتے ہیں جن کا ادا کرنا انتہائی ضروری ہے۔ہر عقیدے میں ادائیگی فرض کے طریقے مختلف ہیں جیسا کہ مسلمان دن میں پانچ بار نماز ادا کرنے کے لیے مسجد میں اکٹھے ہوتے ہیں، یہودیوں کے ہاں صرف اتوار کے دن بڑے اجتماعات منعقد ہوتے ہیں، سکھ اور ہندو دن میں ایک بار اپنی اپنی عبادت گاہوں میں جاتے ہیں۔اسی طرح عیسائی بھی گرجا گھر حاضری دیتے ہیں۔ان روز کے فرائض کے علاوہ بھی سال میں کچھ ایسے تہوار آتے ہیں۔ جنھیں ہر مذہب کے لوگ بڑے جوش و خروش اور عقیدے سے مناتے ہیں۔یہ تہوار نہ صرف بندے کا اپنے معبود کے سامنے سربسجود ہونا ثابت کرتے ہیں بلکہ ان سے لوگوں کو آپس میں میل ملاپ بھی بڑھتا ہے اور باہمی یگانگت، اخوت، بھائی چارہ اور اتحاد کا درس بھی دیتے ہیں۔ان تمام مذہبی فرائض کا اصل مدعا و مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ لوگوں میں اتفاق و محبت کا جذبہ بیدار ہو۔

بعض مذہبی فرائض کے لیے غیر ملکی سفر بھی کرنے پڑتے ہیں جیسا کہ فریضہ حج کے لیے مکہ و مدینہ، زیارت کربلا و عراق و شام جانا، اسی طرح سکھ بھی اپنے گرونانک کی یاترا کے لیے جاتے ہیں۔ان اسفار میں مسافروں کو بہت سی مشکلات سے گزرنا پڑتا تھا کیونکہ ابتدائی زمانوں میں سفری سہولیات ناپید تھیں۔لوگ قافلوں کی صورت میں مہینوں سفر کرتے تھے اور راستے کی صعوبتیں بعض اوقات جان لیوا بھی ثابت ہوتی تھیں۔اس لیے ان مقدس سفر پر جانے والے زائرین نے لوگوں کو راستے کی مشکلات سے آگاہ کرنے کے لیے شروع شروع میں معلوماتی گائیڈ بک لکھیں اور یہیں سے سفر نامہ لکھنے کا رجحان پروان چڑھا۔اب ان دیار مقدسہ کے سفر ناموں سے بہت سے معلومات مثلاً دعائیں، راستے کی تیاری کا سامان، وہاں کا موسم، ملک کا جغرافیہ، راستے کی مشکلات وغیرہ وغیرہ حاصل ہوتی ہیں۔اس

لیے یہ سفر نامے زائرین اور حجاج کرام کی راہنمائی میں بڑے مددگار ثابت ہوتے ہیں اب ہم ان دیار مقدسہ کے سفر ناموں کا سرسری کا جائزہ لیتے ہیں۔

نواب سکندر بیگم وائی بھوپال نے ۱۸۶۱ء میں سفر حج اختیار کیا اور تاریخ وقائع حج اس سفر کی یادگار ہے۔ اس سفر نامے کی اہمیت اس لحاظ سے بھی زیادہ ہے کہ یہ بھوپال کی خاتون حکمران کا پہلا سفر نامہ ہے۔ اس میں حج کے مقدس فریضہ کے علاوہ مختلف زیارت گاہوں کی تفصیلات بھی ملتی ہیں یہ سفر نامہ غیر مطبوعہ ہے اور اس کا ایک قلمی نسخہ رضالائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ اس سفر نامے کا ۱۸۷۰ء میں ترجمہ کیا گیا۔[۲۷]

سفر نامہ سعادت دارین حاجی فریدالدین نے ۱۸۷۱ء میں لکھا ہے۔ انھوں نے اپنے اس سفر نامے میں، سفر کی اہمیت، دوران سفر دواؤں کا استعمال، ضروری اشیاء اور زائرین کی رہنمائی کے لیے نقشے بھی شامل کیے ہیں۔ حاجی محمد زردار خان نے اپنے سفر نامے سفر نامہ حرمین میں حج کے واقعات کے علاوہ مختلف مقامات کے نقشہ جات اور آنحضور کے اسماء شریف بھی تحریر کیے ہیں۔ اس سفر نامے کو مطبع نول کشور نے ۱۸۷۳ء میں شائع کیا۔ منبع الحرمین مولوی محمد ایزد بخش کا دو جلدوں پر مشتمل حج نامہ ہے۔ اس کی پہلی جلد منبع الحرمین ۱۸۸۰ء اور دوسری جلد مفید الدارین کے نام سے ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئی مصنف نے یہ سفر نامہ لوگوں کو سفر حج اور آداب حج سے واقف کرانے کے نقطۂ نظر سے لکھا ہے۔

ایک سفر نامہ سید محمد جونپوری نے تبصرہ المومنین بلقب رفیق الزائرین کے نام سے ۱۸۸۲ء میں لکھا۔ انھوں نے اپنا یہ سفر نامہ روزنامچے کی ہیئت میں تحریر کیا۔ اس میں نجف شریف، کربلا مصلیٰ اور دیگر مقدس مقامات کو بیان کیا ہے۔

حاجی سید وزیر حسین کا سفر نامہ وکیل الغربا ۱۸۸۴ء میں منظر عام پر آیا۔ انھوں نے اپنے سفر حج کے حالات و واقعات کو لوگوں کی رہنمائی کے لیے شائع کیا تاکہ سفر حج پر جانے والے اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس میں مصنف نے ایک واقعہ اور مکہ و مدینہ کے حالات پر گہری نگاہ ڈالی ہے۔ سفر نامہ رہنمائے حجاج جیسا کہ نام سے ظاہر ہے حجاج کرام کی رہنمائی کے لیے منشی سید برکت علی نے ۱۸۸۴ء میں روزنامچہ تکنیک میں لکھا ہے۔ اس سفر نامے کو بڑی تحقیق اور تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

نواب محمد عمر خان سیر و سیاحت نے بڑے شوقین تھے انھوں نے زادِ غریب زائرین حج اور زیارات کے سیاحوں کی رہنمائی کے لیے ۱۸۹۰ء میں تخلیق کیا۔ نواب صاحب نے سفر نامے میں عراق و بغداد، روم و مصر اور عرب کی تاریخ کو پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ارکان حج اور اسلامی ملکوں کی سماجی و تہذیبی حالات کی عمدہ تصویر کشی بھی کی ہے۔

مولانا محمد حفیظ اللہ کا سفر نامہ عرب مطبع احمد پٹنہ نے ۱۸۹۲ء میں شائع کیا ہے۔ اس میں سفر نامہ نگار نے کافی تحقیق و جستجو کے ساتھ عربوں کی رسوم و عادات، حکمرانِ عربوں کا اپنی رعایا کے ساتھ اچھا برتاؤ بھی پیش کیا ہے۔ اس سفر نامے کو حج نامہ سے زیادہ عرب کا سیاحت نامہ کہا جا سکتا ہے۔

حاجی علیم الدین کا رسالہ حج حجاج کرام کے لیے ایک رہبر کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ پہلی بار ۱۸۹۲ء میں چھپا۔ یہ سفر نامہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ سفر نامہ زادالزائرین المعروف بہ معین الزائرین کے دو حصے ہیں اسے مرزا قاسم علی نے ۱۹۰۰ء میں تحریر کیا۔ اس میں انھوں نے مختلف زیارات مثلاً کربلائے معلیٰ، مشہد، نجف شریف، خراسان اور ہندوستان کے حالات کو تفصیلاً بیان کرنے کے علاوہ عربی اور فارسی کے اشعار کو بھی استعمال کیا ہے۔

خواجہ حسن نظامی اردو ادب میں بڑی حیثیت کے مالک ہیں انھوں نے دیگر تصانیف کے علاوہ سفر نامہ نگاری میں بھی اپنی قابلیت کا لوہا منوایا اور سفر نامے تخلیق کیے۔ ان کا حجاز مقدسہ کا سفر نامہ حجاز و مصر و شام جو انھوں نے فلسطین، شام، مصر اور عرب کی روحانی سیاحت کی اور فریضہ حج ادا کیا اور اس سفر کی روداد کو ۱۹۱۱ء میں لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

سفرِ حجاز مولانا عبدالماجد دریابادی کا حج نامہ ہے۔ اس سفر نامے کو ۱۹۲۹ء میں معارف پریس اعظم گڑھ نے مرتب کیا۔ یہ سفر نامہ مصنف کی وارداتِ قلبی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ منشی امیر احمد علوی نے ۱۹۳۲ء میں سفرِ سعادت کے نام سے اپنے حج کے واقعات کو قلمبند کیا ہے۔ سفر نامہ نگار نے باریک بینی سے سعودی حکومت اور وہاں کے سماجی و اندرونی کیفیتوں کا اظہار بھی کیا ہے۔

محمد حفیظ الرحمن حفیظ نے اپنے سفرِ حج کی قلبی واردات کو سفر نامہ حجاز کے نام سے ۱۹۳۲ء میں تحریر کیا۔ یہ سفر نامہ اپنی صداقت اور عقیدت کا عمدہ فن پارہ ہے۔ اسی طرح محمد شریف امرتسری کا سفر نامہ حج

حاجیوں کے لیے ایک مختصر سی گائیڈ بک طرز کا سفر نامہ ہے جس میں انھوں نے اپنے حج کے تاثرات کو روایتی انداز میں بیان کیا ہے۔

پیر محمد غوث قریشی نے اپنے مریدین کی تبلیغ و رہنمائی کے لیے اپنی حج بیتی سفر نامہ غوثیہ کے نام سے لکھی۔ اس میں ہدایت و ضروریات سفر کے علاوہ ارکانِ حج اور احکامِ حج تفاصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ پیر محمد غوث کا یہ حج نامہ لکھنے کا مقصد تبلیغِ دین اور حج کے احکام سے آشنائی کروانا تھا۔ سر گزشت حجاز مرزا عبدالحلیم بیگ کا لکھا ہوا سفر نامہ ہے۔ اس سفر کی جذباتی کیفیت کو ۱۸۹۵ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے چھپی۔ اس کو صرف ایک حج گائیڈ کی ذیل میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور حج گائیڈ کی طرز کا سفر نامہ سبیل الرشاد ڈاکٹر عبدالمجید صدیقی نے ۱۹۳۶ء میں آراستۂ قلم کیا۔ اس سفر نامے میں مقصدیت غالب ہے اور روحانی زاویہ دب گیا ہے کیونکہ اسے انجمن پنجاب کراچی نے حجاج کرام کی رہنمائی کے لیے شائع کیا ہے۔ سفر نامہ نگار محمد حفیظ الرحمن کا سفر نامہ راہِ وفا ایک منظوم سفر نامہ ہے۔ انھوں نے اپنا سفر مقدس زیارت گاہوں کے مراکز شام، فلسطین، عراق، مصر سے شروع کر کے حجاز مقدسہ پر ختم کیا اور اس روحانی داستان کو ۱۹۳۸ء میں قریشی بک ڈپو علی گڑھ کے تعاون سے شائع کیا ہے۔ محمد حفیظ الرحمن نے حقیقت کو وجدانی صورت دی ہے اور یہ سفر نامہ منظوم سفر ناموں میں اہمیت رکھتا ہے۔

نواب صادق بہاول پور جب حجاز کے سفر پر روانہ ہوئے تو محمد عزیز الرحمن عزیز نواب صاحب کے حاجی کیمپ کے نگران تھے اور نواب صادق کے قریب ہونے کی بنا پر انھیں حج کے حالات و واقعات قلمبند کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی تو اس طرح محمد عزیز الرحمٰن نے اپنے قلم سے مقاماتِ مقدسہ کا احوال بیان کیا۔ اس سفر نامے کے شروع میں نواب خاندان کی تاریخ اور تعریف بیان کی ہے اور یہ سفر نامہ ۱۹۳۵ء میں چھپا۔

مولانا غلام رسول مہر کے سفر نامے کو ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری نے ڈھونڈ کر ۱۹۳۰ء میں مرتب کیا۔ ان کے سفر نامے میں قدیم عمارتوں اور تاریخی مقامات کے ذکر کے ساتھ ساتھ کعبہ شریف اور مکہ کے مضافات کے نقشے بھی ہیں۔

بیگم صغرا ہمایوں حیدر آباد دکن کی ایک روشن خیال خاتون تھیں۔ انھوں نے انیسویں صدی میں بہت سے

کارہائے نمایاں انجام دیے اور وہ انجمن خواتین دکن کی رکن ہونے کی وجہ سے ہمیشہ عورتوں کی فلاح اور حقوق کے لیے کوشاں رہیں۔ انھوں نے تعلیمِ نسواں اور بیداریٔ نسواں کی تحریک میں فعال کردار ادا کیا ہے۔ بیگم صغرا نے متعدد سفر کیے اور پھر سفر نامے بھی تخلیق کیے۔ ان سفر ناموں میں سے سفر نامہ عراق بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں وہ زیارات کے سفر کے تجربات و مشاہدات کو باطنی کیفیت کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ یہ سفر نامہ ۱۹۱۵ء میں عورتوں کو بیرونی ممالک کی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ زیارات کی تفصیل کو آشکار کرتا ہے۔

بیگم نشاط النساء اردو ادب کے نامور شاعر حسرت موہانی کی شریکِ حیات تھیں۔ بیگم حسرت ایک تعلیم یافتہ اور آزاد خیال خاتون ہونے کی وجہ سے زندگی کے ہر سفر میں اپنے شوہر کے ہم قدم رہیں۔ انھوں نے برصغیر کی جدوجہد آزادی میں مولانا حسرت موہانی کے ساتھ مل کر خدمات انجام دیں۔ انھوں نے بہت سے سفر کیے اپنے ان اسفار کی روداد کو سفر ناموں سفرِ حجاز اور سفر نامہ عراق میں بیان کیا ہے۔

محمودہ عثمان حیدر نے اپنے شوہر سیّد عثمان حیدر کے ساتھ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۲ء تک کے مشرقِ وسطیٰ کے سفر کو اپنے سفر نامہ مشاہداتِ بلادِ اسلامیہ میں پیش کیا ہے۔ یہ سفر نامہ مقدس زیارت گاہوں کے بارے میں بڑی اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔

اسی طرح راحیل شروانیہ نے اپنے مقدس سفری کوائف کو سفر نامہ بلاد مقدس (۱۹۲۹ء) اور بیگم عزلت صاحبہ نے سفر نامہ عراق (۱۹۱۰ء) میں اپنی باطنی کیفیات اور مشاہدات و حالات کو پیش کیا ہے۔

۲۔ علمی سفر نامے:

اردو ادب میں اب تک جو بھی سفر نامے تخلیق کیے گئے ہیں وہ مختلف موضوعات کے اور مختلف مقاصد کے تحت کیے گئے اسفار کا احوال پیش کرتے ہیں جیسا کہ بعض صرف سیر و سیاحت، کچھ کا مقصد مقاماتِ مقدسہ کی زیارت، کچھ تجارت، کچھ سفر سیاسی نوعیت کے تھے اور کچھ علمی خزانوں کی تلاش میں دوسرے ملکوں کی خاک چھانی گئی۔ ان مقاصد کے تحت بہت سے لوگوں نے دوسرے خطوں کا سفر اختیار کیا اور پھر سفر ناموں کی صورت میں اپنی یادداشتیں لوگوں کے سامنے پیش کیں۔

نوآبادیاتی عہد میں مغرب سے اکتسابِ علم کرنے کی روایت کو تقویت ملی اور دیگر مشرقی ممالک کے سفر علمی مقاصد اور اپنے ملک و ملت کی تعمیرِ نو اور بھلائی کے لیے کیے گئے۔ اس لیے ہر سفر نامے میں واقعات و حالات کی صداقت کے ساتھ ساتھ علمی طلب بھی نظر آتی ہے۔ سفر نامہ نگار بیرونِ ملک جب کسی علمی و ادبی شخصیت اور علمائے کرام سے ملاقات کرتا ہے تو ان کی اخلاقی اور علمی گفتگو اور زندگی کو بھی سفر نامہ میں پیش کر دیتا ہے تاکہ دوسرے بھی ان کے علمی کاموں اور کتب خانوں سے واقف ہوں۔ اس ذیل میں ہم سفر ناموں کا جائزہ لیں گے۔

سفر نامہ مسافرانِ لندن سر سید احمد خان کے علمی اور تحقیقی سفر کی روداد ہے۔ انھوں نے یہ سفر اپنے بیٹے سید محمود کے ہمراہ کیا اور یہ سفر نامہ ۱۸۶۹ء میں چھپا۔ سر سیّد نے سفر کرنے کا اصل مقصد انگلستان کے نظامِ تعلیم، معاشرت، تہذیب سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد انھیں اپنے ہم وطنوں سے متعارف کروانا تھا۔ اُن کا یہ سفر علمی سفر تھا اور انھوں نے ایسی معلومات جمع کرنے کی کوشش کی جو ہندوستان کے لوگوں کے علمی تقاضے پورا کر سکے۔

سر سیّد احمد خان کا ایک اور سفر نامہ سفر نامۂ پنجاب ہے جسے ۱۸۸۴ء میں سید اقبال علی نے مرتب کیا۔ یہ سفر نامہ سر سید کی تقاریر پر مشتمل ہے جو انھوں نے پنجاب میں مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں کی تھیں۔ وہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں تاکہ وہ زندگی کے میدان میں کسی طور پیچھے نہ رہیں۔ ان کا سفر نامہ پنجاب قومی و علمی مفاد کو پیش کرتا ہے۔

مولانا محمد حسین آزادؔ کا سیرِ ایران ان کی دلچسپ تقریر اور روزنامچے پر مشتمل ہے۔ ان کا سفر نامہ، ان کی وفات کے بعد آغا طاہر نبیرہ نے ۱۸۸۶ء میں مرتب کیا۔ مولانا نے علمی مقاصد کے لیے ۱۸۸۵ء میں ایران کا سفر کیا اور سات ماہ کی سیاحت کے بعد لاہور آنے کے بعد سفر کی روداد ایک جلسے میں سنائی اور آزادؔ کی تقریر بڑی دلچسپی سے سنی گئی۔ مولانا آزادؔ نے ایران کا سفر لغت کی تیاری کے سلسلے میں، کتابوں کی تلاش میں کیا۔ اس لیے انھوں نے وہاں بہت سے علماء سے ملاقاتوں کے علاوہ ایران کے مختلف کتب خانوں سے بھی معلومات اور کتابیں اکٹھی کیں۔ اس حوالے سے اس سفر کی نوعیت علمی تھی اور سفر نامے سے یہ تمام باتیں آشکار ہوتی ہیں۔

علمی سفر کے حوالے سے مولانا شبلی نعمانی کا سفر نامہ روم و مصر و شام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ سفر نامہ ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا۔ مولانا نے یہ سفر خالص علمی اور تعلیمی مقصد کے تحت کیا۔ اس سفر نامے میں

انھوں نے وہاں کی تحریکوں اور اداروں کے متعلق تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ مولانا شبلی مختلف جامعات گئے اور وہاں کے علماء و فضلاء سے ملاقات بھی کیں۔ ترکی کے نظامِ تعلیم کا بھی جائزہ لیا۔ ان تمام حالات و واقعات کی تفصیل کو بیان کیا۔ مولانا عبدالحیؒ نے ۱۸۹۴ء میں علم دینی کی غرض سے سفر کیا تھا اور ان کے سفر نامے میں دہلی کے گرد و نواح کی تاریخی عمارتوں کے متعلق، اس دور کی ممتاز علمی ہستیوں سے ملاقات کرنے اور علمی معاملات پر تبادلۂ خیال کرنے کا تفصیلی ذکر پایا جاتا ہے۔ زمانۂ تحصیل عطیہ فیضی رحمین اُس سفر کی یادگار ہے جب وہ سرکاری وظیفے پر تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے گئی تھی۔ یہ سفر نامہ اُن کے خطوط سے مرتب شدہ ہے جو عطیہ نے اپنی بہن زہرہ بیگم کو لکھے تھے اور زہرہ بیگم نے ان خطوط کو سلسلہ وار سفر نامے کی صورت میں تہذیب نسواں میں برصغیر کی خواتین کے لیے شائع کرواتی رہیں۔ کتابی صورت میں ۱۹۲۲ء میں شائع کیا گیا اور یہ سفر نامہ ڈائری کی تکنیک میں ہے۔

محمد بدر السلام فضلی کو ٹوکیو یونی ورسٹی کی طرف سے اردو اور فارسی کا پروفیسر مقرر کیا گیا اور محمد بدر السلام اپنے تدریسی فرائض کی انجام دہی کے لیے جاپان میں قیام پذیر رہے تو انھوں نے اپنے اس تجربے میں دوسروں کو شامل کرنے کے لیے اپنا سفر نامہ "حقیقت جاپان" ۱۹۳۰ء میں تخلیق کیا۔ سید سلمان ندوی نے ۱۹۳۳ء میں افغانستان کا سفر کیا اور سیرِ افغانستان کے نام سے سفر نامہ لکھا۔ ان کے اس سفر کا مقصد افغانستان میں تعلیمی اصطلاحات کا جائزہ اور علمی اکابرین سے ملاقاتیں کرنا تھا۔ اس لحاظ سے یہ سفر نامہ تعلیمی نوعیت کا ہے اور انھیں مشاہدات و واقعات کا بیان اس سفر نامے میں ملتا ہے۔

آغا محمد اشرف نے اپنے سفر نامے دیس سے باہر ۱۹۳۹ء میں لکھا جب وہ لندن یونی ورسٹی میں استاد کے فرائض انجام دینے گئے تھے۔ وہاں ان کا قیام تقریباً چار سال رہا۔ آغا محمد اشرف نے روایتی اور رسمی سفر نامے سے انحراف کرتے ہوئے سفر کے حالات و واقعات کو پہلے مضامین کی صورت میں شائع کیا اور بعد میں انھیں اکٹھا کر کے سفر نامے کی صورت دی۔ یہ مضامین سفر نامے کے ابواب لگتے ہیں۔ انھوں نے اپنے تعلیمی تجربات کو جاندار اسلوب میں پیش کیا ہے۔ مولوی عبدالخالق تبلیغ کی غرض سے برما گئے اور سفر نامہ برہما میں اس علاقے کے مذہبی اعتقادات، رسوم و رواج اور تاریخی و معاشرتی معلومات کو سچائی سے بیان کیا ہے۔

۳۔ سیاسی یا سفارتی سفر نامے:

برصغیر پاک و ہند میں انگریزوں کی آمد نے مغل سلطنت اور ملکی سیاست پر بڑے گہرے اثرات ڈالے۔ ان کی سیاسی چالوں نے کئی سو سالوں کی مغلیہ بادشاہت کو آہستہ آہستہ کمزور کر کے اپنے لیے راستہ ہموار کیا اور وہ کچھ ہی عرصے میں تخت و تاج کے بلا شرکت غیرے مالک بن گئے۔

پورے ملک کے اختیارات سنبھالنے کے بعد انھوں نے ملک میں نئی اصلاحات نافذ کرنے کے ساتھ ترقیاتی کاموں کا بھی جال بچھا دیا، نہری نظام، ڈاک خانے، ریلوے نظام، تعلیمی نظام، حتیٰ کہ تمام نظامِ زندگی کو متاثر کیا۔ ملک میں اپنے خیر خواہ پیدا کرنے کے لیے جاگیریں تقسیم کیں، ملازمتیں دیں اور بھاری رقوم کے عوض سیاسی مقاصد کے لیے لوگوں کو استعمال کیا۔ اس طرح جب آقا اور غلام اپنے اپنے مفادات کی ڈور میں بندھے ہوں تو تعلقات کی نوعیت کیا ہوتی ہے وہ ہم سب جانتے ہیں اور سیاسی کھیل برصغیر کی سرزمین پر کھیلا جانے لگا۔

امورِ سلطنت کی انجام دہی کے لیے انگریزوں کا آنا جانا شروع ہوا مگر کچھ سیاح ہندوستان کے جادوئی سحر میں سیاحت پر مجبور ہوئے۔ ان حالات کے برعکس برصغیر سے جن لوگوں نے سفر کیا وہ سیاحتی نوعیت کا یا پھر زیادہ تر سیاسی مقاصد سے بھرپور تھا۔ یہ لوگ سلطنت برطانیہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر لندن گئے اور اکابرینِ سلطنت سے ملاقاتیں کیں۔ انگلستان کی زندگی کا بغور مشاہدہ کیا اور وہاں کی ایک چیز مثلاً تہذیب و تمدنی زندگی، وہاں کے عجائبات و ترقیاں، سڑکوں بازاروں کی رونقیں، صنعت و حرفت وغیرہ کا معائنہ کیا اور اپنے سفر ناموں میں ان سب تجربات و واقعات کو پیش کیا۔

ہندوستان سے سیاح جب بیرونی ممالک سفارتی نمائندہ بن کے یا کسی اور سیاسی مقصد کے تحت گئے تو انھوں نے وہاں کی ہر چیز کو اپنے وطن سے بڑھ کر پایا اور وہ اس سے مرعوب ہوا یا احساس کمتری میں مبتلا ہوتا ہے اور ایسے سفر ناموں میں یا تو ستائشی انداز پایا جاتا ہے یا پھر وہ اپنی، ہر چیز کا موازنہ اس ملک سے کرنے لگتا ہے اور یوں دوسرے ملکوں کا رہن سہن، رسم و رواج، جغرافیہ، تاریخ، اور زندگی کے ایک ایک زاویے کو سیاح سفر نامے کی زینت بناتا ہے۔

ریاست جھجر کے نواب خاندان سے تعلق رکھنے والے نواب کریم خان ۱۸۳۹ء میں بہادر شاہ ظفر کے ایک مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں، ان کے سفیر کی حیثیت سے لندن گئے اور انھوں نے اپنے روز کے معمول کو ڈائری میں

باقاعدگی سے لکھااور پھر اس کو وطن واپسی پر سفر نامے کی شکل دی۔ ان کے سفر نامے میں امراء سلطنت، وزراو حکماء سے ملاقاتوں کے علاوہ سیاسی سرگرمیوں کی روداد بھی ملتی ہے۔

محمد حسین آزاد ۱۸۶۵ء میں سیاسی مشن پر سیاحت پر گئے۔ وہ ایک سرکاری وفد میں شامل تھے جنھیں انگریز حکومت نے وسط ایشیائی ممالک کے حالات دریافت کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ یہ سفر چونکہ سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے کیا گیا تھا اس لیے اس سفر کے حالات کو مولانا آزاد نے صیغۂ راز میں رکھا۔ اس سفر کے سیاسی مقصد کے متعلق اس سفر نامہ کے مرتبہ آغا محمد اشرف لکھتے ہیں:

> اس وقت روس کی فوجیں ترکستان سے گزرتی ہوئی ہندوستان کی شمالی سرحدوں کی طرف بڑھ رہی تھیں اور وسط ایشاء کی اسلامی ریاستیں پکے ہوئے پھل کی طرح اس آندھی کے سامنے گرتی جاتی تھیں۔ انگریزوں کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ زارِ روس کے لشکر ہندوستان کی سرحدوں پر آن پہنچیں گے۔ [۲۸]

اس سفر کے دوران مولانا آزاد بہت سی مشکلوں اور تکلیفوں سے بھی گزرے۔ مولانا کے اس سفر کی یادوں کو آغا محمد اشرف نے مرتب کر کے اس سفر نامے کو انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت کے نام سے ہمدرد اکادمی کراچی سے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا ہے۔

سید فدا حسین کا سفر نامہ تاریخ افغانستان ان کی دورانِ انگریزی ملازمت مہم جوئی کی داستان ہے۔ وہ انگریزی افواج میں بھرتی ہونے کیوجہ سے کابل پر چڑھائی کی مہم میں شامل تھا اپنے اس سفر کے حالات کو انھوں نے روزنامچے کی تکنیک میں ۱۸۵۲ء میں تحریر کیا ہے۔

مسیح الدین علوی کا سفر نامہ سفیر اودھ خالصتاً سیاسی سفر کی رودادپر مشتمل ہے۔ ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ نے انہیں اپنا سفر مقرر کر کے اپنی والدہ، بھائی اور ولی عہد کے ساتھ انگلستان روانہ کیا اور اسی سفر کے دوران انہوں نے حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کی۔ اس سفر نامے میں مسیح الدین علوی سیاسی مشین کی تکمیل اور اس سے متعلقہ امور میں مصروف رہے۔

مولانا جعفر تھانسیری کا کالاپانی ان کی سیاسی قید کی داستان ہے۔ مولانا جعفر سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین کے سرگرم رکن تھے۔ انگریزوں نے انہیں اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے، اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے

مقدمہ چلایااور انہوں نے انگریزوں کا حریت پسندوں پر کئے گئے مظالم اور جزیرہ کے رسم ورواج، جغرفیہ، تاریخ اور تہذیب و معاشرت کو بیان کیا۔

نواب حامد علی خان ریاست رام پور کے نواب خاندان میں سے تھے۔ اس کے ساتھ وہ حکومت انگلستان کے بھی خیر خواہ تھے۔ انہیں انگلستان کے دورے کی دعوت حکومت برطانیہ کی جانب سے دی گئی تھی اور انہیں سفری مراعات بھی انگریز سرکار کے مہمان کی حیثیت سے دی گئی۔ اس سفر سے واپسی کے بعد انہوں نے ۱۸۸۴ء میں اپنا سفر نامہ سیر حامدی تحریر کیا۔

شاہ بانو کا تعلق ریاست بھوپال کے نواب خاندان سے تھا اور انہیں نواب سلطان جہاں بیگم کے ساتھ ۱۹۱۱ء میں یورپ جانے کا موقع ملا اور یہ لوگ حکومت انگلشیہ کے مہمان خصوصی بنے۔ ان کے اعزاز میں محل میں اور لوگوں کے ساتھ انہیں بھی مدعو کیا گیا اور ان کو خاص لوگوں سے بھی ملوایا گیا۔ شاہ بانو بیگم کو آزادانہ گھومنے کی آزادی نہ تھی بلکہ اس سفر نامے کے زیادہ تر کوائف نواب سلطان بیگم نے فراہم کیے تھے اور انہوں سے سفر نامہ ترتیب دیا۔

حکومتِ برطانیہ نے ۱۹۲۱ء ہندوستان سے تحریک خلافت کے رہنماؤں کا ایک وفد صلاح و مشورے کے لیے بلایا توان میں قاضی عبدالغفار بھی شامل تھے۔ وہ اپنے سفر نامے نقش فرنگ میں انگلستان کی سیر و سیاحت کے علاوہ مدبرین سے ہونے والی گفتگو کی تفصیلات بھی بیان کرتا ہے۔ ان کا یہ سفر نامہ ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔

کابل میں سات دن سیاسی نوعیت کا سفر نامہ ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کو ۱۹۱۵ء میں شیخ الہند سید حسین احمد نے افغانستان بھیجا۔ انہیں ایک سیاسی منصوبہ دے کر کابل روانہ کیا گیا اور تمام امور خفیہ رکھنے کا حکم تھا۔ چنانچہ ان کے اسلوب پر آزادروی کا فقدان ہے۔ اس لیے ان کا سفر نامہ صرف سیاسی نصب العین اور حکومتی ارکان سے ملاقات کو بیان کرتا ہے۔ اس سفر نامے پر خود نوشت سوانح کا انداز نمایاں ہے۔

شوکت عثمانی ایک سیاسی شخصیت تھے اور وہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے سر گرم تھے۔ اس جدوجہد میں شامل ہونے کیوجہ سے انگریزوں کے عتاب کا شکار ہوئے۔ اس سے بچنے کے لئے وہ بھاگ کر روس چلے گئے۔ اس سفر میں انہیں بہت سی مشکلات کو بھی برداشت کرنا پڑا مگر روس کی سرزمین شوکت عثمانی کے نظریات سے ہم آہنگ تھی۔ اس لیے انہوں نے بڑے ستائشی انداز سے روس کی بود و باش، رسم ورواج اور معاشرت کو دیکھا ہے۔

خواجہ احمد عباس ایک ادیب و صحافی تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۸ء میں ورلڈ یوتھ کانفرس میں نمائندگی کے لئے نیویارک کا سفر کیا اور لوگوں تک اپنے تجربات پہنچانے کے لئے مسافر کی ڈائری تخلیق کیا۔ اس میں انہوں نے ہر ایک منظر اور چیز کو ایک ادیب کی آنکھ سے دیکھا اور پرکھا ہے جو ان کے اس سفر نامے میں سیاسی عقائد اور نظریات کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ اس کا شمار سیاسی سفر ناموں میں ہوتا ہے۔

سر رضا علی برصغیر کی اہم شخصیت میں شمار ہوتے تھے۔ اور ان کے انگریز حکومت سے گہرے مراسم ہونے کی وجہ سے سرکاری حثیت سے یورپ کا سفر اختیار کرنے کا موقع ملا۔ اس طرح کے ایک سفر ۱۹۲۵ء میں وہ ایک سرکاری وفد کے ساتھ جنوبی افریقہ گئے۔ ان کا سفر نامہ اعمال نامہ انہی اسفار پر مشتمل ہے۔ اس میں افریقہ کی سر زمین سیاسی حالات اور ان کی اپنی ذات کا بیان ہے۔

۴۔ تجارتی یا تفریحی سفر نامے:

ابتدائی عہد کے سفر نامے دیکھ کر سیاحوں کی ہمت اور حوصلہ مندی کی داد دینا پڑتی ہے۔ کیونکہ اس وقت ذرائع آمد و رفت محدود ہونے کی بناء پر سیاح بڑے بڑے مصائب سے دوچار ہوتا تھا اور ان کا سفر مہینوں جاری رہتا تھا۔ دورانِ سفر بہت سی تکالیف سے دوچار ہوتا تھا مگر ایک سیر و سیاحت کا شوقین ان تمام مشکلات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے نئی زمینوں کی دریافت میں آگئے ہی بڑھتا جاتا تھا اور نئے منظروں کو سامنے پاکر اس کی خوشی دیدنی ہوتی اور وہ اس خاص کیفیت میں دوسروں کو شامل کرنے کے لیے سفر نامہ تخلیق کرتا۔

پنڈت کنھیالال نے ۱۸۴۷ء میں برطانوی سیاح کی بطور گائیڈ سیاحت میں مدد کی تھی۔ ونژیم سیاحت کے شوقین تھے، اسے ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو کشمیری زبان اور وہاں کے رسم و رواج جانتا ہو تو پنڈت کنھیا کو انہوں نے ان تمام خصوصیات پر پورا اترنے کی وجہ سے اپنے لیے بطور گائید منتخب کیا اور کشمیر کی سیاحت کے دوران یہ ان کے ساتھ رہے اور واپسی پر اس کو سیر کشمیر کے نام سے قلم بند کیا۔

منشی امین چند نے ۱۸۵۰ء میں ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کی اور ۱۸۵۹ء میں اپنا یہ سفر نامہ امین چند شائع کیا۔ اس سفر نامے کے دو حصے میں جس میں انہوں نے تمام شہروں کی تاریخ اور حالت کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ شیخ محمد ریاض الدین امجد نے اپنے سفر نامے میں شاہ جہاں پورے دہلی کا دس روزہ سفر کے واقعات کے

بیان کیا ہے۔ انہوں نے اس میں دہلی کے بازاروں، تاریخی عمارتوں، مزاروں، اور معتبروں کے علاوہ مرزا غالب سے ہونے والی ملاقات کا بھی ذکر کیا ہے۔

موج سلطانی شہزادہ مرزا رئیس بخت کا سفر نامہ ہے۔ آپ بہادر شاہ ظفر کے پوتے تھے اور سیاحت کے بے حد شوقین تھے۔ انہوں نے اپنے سفر نامے میں ہندوستان کی مختلف شہروں کی سیاحت کو بیان کیا گیا۔ ان کا یہ سفر نامہ ۱۸۸۴ء میں مطبع منشی نول کشور سے شائع ہوا۔ مرزا رئیس بخت کے سفر نامے میں بہت سے عمارتوں، مقبروں، راجاؤں کی تفصیلات پائی جاتی ہیں۔ اس سفر نامے میں مصنف نے اپنی تصویر کی بھی شامل کیا ہے۔ ان کی یہ تصویر اس زمانے کی فن مصوری کے رجحان کا پتہ دیتی ہے۔

نواب بسم اللہ خان نے ۱۸۹۱ء میں ہندوستان کے بہت سے شہروں کا سفر کیا اور اس سفر کے حالات و مشاہدات کو سفر نامہ حضور عالی کے نام سے تحریر کیا۔ نواب صاحب ریاست رادھن پور گجرات کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے اپنے سفر نامے میں دیگر تفصیلات کے علاوہ مشہور مقامات کی تصویریں اور نقشے بھی دیئے ہیں۔

سفر نامہ سیر ریاستیں مرزا کاظم برلاس نے جزیرہ لنکا کے سفر کے واقعات کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے اپنے سفر نامے کا آغاز حمد سے کرنے کے بعد جزیرہ کے متعلق ضروری معلومات فراہم کی ہے۔ ان کا یہ سفر نامہ نہایت مختصر مگر معلومات میں جامع ہے۔

نواب حاجی محمد علی خان ریاست محمد گڑھ کے نواب تھے اور سیاحت کے شوقین تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت سے ملکوں کے سفر کیے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ سفر میں گزرا۔ نواب محمد عمر نے اپنے اسفار کو اپنے ان سفر ناموں سفر نامہ رئیس اور سفر نامہ ارژنگ چین میں خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ سفر نامہ برہما میں عبدالخالق خان نے برما کی سیاحت کو پیش کیا۔ انہوں نے وہاں کافی عرصہ بسر کیا اور وہاں کی زبان سیکھی۔ ان کا سفر نامہ اس ملک کے حالات، مذہب، آب و ہوا، قوم، خوراک اور رسم و رواج کو بیان کرتا ہے۔ یہ سفر نامہ پانچویں بار ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔ نواب محمد علی خان یورپ سے ہوتے ہوئے مصر، شام، استنبول، اسکندریہ اور الجیریہ گئے اور اس سفر سے واپسی پر اپنے دوستوں کے اصرار پر سفر نامہ لکھا۔ جس میں انہوں نے عام فہم واقعات بیان کیے اور مبالغہ سے اجتناب کیا ہے۔ واقعات کو بیان کرتے ہوئے مزاح کی چاشنی بھی شامل کر دیتے ہیں۔

عجائبات فرنگ اردو ادب کا سب سے پہلا سفر نامہ ہے جس سے یوسف خان کمبل پوش نے ۱۸۴۷ء میں یورپ کی سیاحت کے بعد لکھا۔ سیر وسیاحت کا شوق انہیں یورپ لے گیا اور انہوں نے یہ تمام سفر اپنے من کی ترنگ کے ساتھ کیا۔ یوسف خان نے اس سفر نامے میں یورپی تہذیب و معاشرت کو بے حد سراہنے کے ساتھ ساتھ اپنے ملک سے موازانہ بھی کیا ہے۔ ان کا انداز تحریر تصنع اور بناوٹ سے مبرا تھا۔

مولوی محمد سمیع اللہ خان نے ۱۸۸۰ء میں اپنے ساتھیوں حمید اللہ خان، حامد علی خان، محمد رفیع کے ہمراہ لندن کا سفر کیا اس میں انہوں نے لندن کی زندگی کے بہت سے اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ ان کا یہ سفر نامہ لندن ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا۔ آئینہ سکندری میں بابو اماشنکر نے انگلینڈ، جرمنی اور فرانس کے حالات بیان کیے ہیں۔ یہ سفر نامہ ۱۸۸۷ء میں منظر عام پر آیا اس میں انہوں نے یورپی طرز زندگی کی مکمل تصویر کشی کی۔

مرزا نثار علی بیگ کو یورپ کی سیاحت کا بے حد شوق تھا کیونکہ وہ وہاں کی طرز معاشرت دیکھ کر یہ اندازہ لگانا چاہتے تھے کہ کن وجوہات کی بناء پر یورپ دوسروں ملکوں پر سبقت لے گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے انگریز دوستوں سے ملاقات بھی کرنا چاہتے تھے۔ دوران سفر انہوں تمام حالات کو ڈائری میں لکھا اور وطن واپسی پر ۱۸۹۰ء میں سفر نامہ یورپ کے نام سے شائع کیا۔

ڈاکٹر شاہ علی سبز واری کا سفر نامہ خوفناک دنیا ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا۔ انہیں سیر وسیاحت کے علاوہ شکار کرنے کا بھی شوق تھا۔ اس مقصد کے علاوہ تجارت کی غرض سے بھی افریقہ گئے۔ وہاں انہوں نے جنگلوں میں مہم جوئی کی اور اپنی اس والہانہ کیفیت میں دوسروں کو شامل کرنے کے لیے سفر نامہ لکھا۔

نازلی رفعیہ سلطان ۲۵ اپریل ۱۹۰۸ء کو نواب سر سیدی احمد خان بہادر، عطیہ بیگم فیضی، علی اصغر بیگ فیضی، سردار سیدی حسن اور ڈاکٹر ہاشم لکھانی کے ہمراہ یورپ کی سیاحت پر روانہ ہوئیں۔ انہوں نے تقریباً چھ ماہ وہاں قیام کیا اور ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۸ء میں وطن واپس آئے۔ نازلی بیگم کا سفر نامہ سیر یورپ یورپ سے لکھے گئے خطوط ہیں۔ جو انہوں نے اپنے عزیزوں کو برصغیر میں لکھے۔ اور ان خطوط کو زہرہ بیگم فیضی نے تاریخ وار مرتب کر کے سفر نامے کی صورت میں شائع کیا۔

سفر نامہ قسطنطنیہ میں محمد حمید ارشد خان سے بلند جنگ نے نہ صرف اپنے سفری احوال کو بیان کیا ہے۔ بلکہ اپنی باطنی کیفیات کو بھی اچھے لفظوں میں سمو کر پیش کیا ہے۔ ان کے انداز تحریر پر خوشی اور سرشاری کی کیفیت چھائی ہوئی ہے۔ انہوں نے یہ سفر مختلف ملکوں کی سیاحت کی عرض سے کیا۔ روزنامچہ سیاحت میں خواجہ غلام الثقلین نے اپنے سفر روس، عراق، قسطنطنیہ ایران اور عرب کو بڑی بے تکلفی سے بیان کیا ہے۔ خواجہ صاحب کی نگاہیں ان چیزوں کا بھی مشاہدہ کرتی ہے۔ جنھیں ایک عام انسان غیر ضروری یا غیر اہم سمجھ کر چھوڑ جاتا ہے۔ اس میں انہوں نے چھوٹی سے چھوٹی بات کا ذکر کیا ہے۔

قاضی ولی محمد کسمنڈوی نے ۱۹۲۴ء میں اندلس کا سفر کیا اور سفر نامہ اندلس ان کے تجربات اور واردات قلبی کا بیان ہے۔ اس میں مصنف نے ماضی کی تاریخ کو بھی ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ صغریٰ بیگم ہمایوں اپنے خاوند بیرسٹر سید ہمایوں کے ساتھ یورپ کی سیاحت پر گئی۔ انہوں نے وہاں یورپی تہذیب و معاشرت کا بغور مشاہدہ کیا اور جو کچھ دیکھا اسے اپنے سفر نامہ یورپ میں بیان کیا۔ اس کے علاوہ ابھی انھوں نے سفر نامے تخلیق کیے ہیں۔ پنڈت ٹھاکردت کا سفر نامہ سیر یورپ خطوط کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ انہوں نے ۱۹۲۴ء میں مغربی ممالک فرانس، سوئزلینڈ ار لندن کی سیر کی۔ ان کا یہ سفر نامہ ان کے یادگار سفر کی داستان ہے۔

یقوب علی عرفانی نے یورپ اور بلاد اسلامیہ کو مذہبی نقطہ نظر سے دیکھا اور دکھ اور افسوس کی کیفیت سے دوچار ہوئے۔ ان کا سفر نامہ مشاہدات عرفانی ان کی اندرونی کیفیت کا ترجمان ہے۔ وہ پورے سفر نامے میں تاسف کی کیفیت میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ اور ایک سچے سیاح کی آزادروی سے کوسوں دور ہیں۔ مرزا حسین احمد بیگ رکن میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ جب وہ ایک بیماری میں مبتلا ہوئے تو تبدیلی آب و ہوا کے لئیے اپنے دو بھائیوں کے ساتھ ۱۹۳۰ء میں ممالک غیر کی سیاحت پر روانہ ہوئے۔ انہوں نے اس سفر میں قاہرہ، سوئزرلینڈ، کولمبو، بیت المقدس، وحی آنا، برلن، پیرس اور لندن کی ایک ایک چیز کو دیکھا اور چھوٹی سے چھوٹی جزیات کو سفر نامے میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس سفر میں مرزا احمد حسین نے تمام خوش رنگ چیزوں پر نظر رکھی اور سب کو خوش دلی سے بیان کیا ہے۔

سیاحت نامہ کے مصنف نواب محمد ظہیر الدین حیدرآباد رکن کے نواب تھے۔ سیاحت کا شوق انہیں ۱۹۳۳ء میں امریکہ اور یورپ لے گیا۔ اس سفر نامے میں انہوں نے یورپ کی سماجی زندگی کے علاوہ وہاں کے پارکوں،

تھیٹروں، بازاروں کے بارے میں لکھا ہے۔اس سفر نامے میں زبان وبیان کی سادگی، روانی اور حقیقت بیان کی ہے۔ نواب لیاقت جنگ بہادر نے یہ سفر سیاحت سے زیادہ تجارتی اور صنعتی دیکھنے اور ان سے تجارتی مراسم بڑھانے کی غرض سے یورپ گئے تھے۔انہوں نے اس سفر نامے میں اپنے مقصد کو اسلوب پر غالب نہیں آنے دیا بلکہ اس سفر نامے سے مسرت اور تحسیر کا احساس جھلکتا ہے۔

عشرت علی صدیقی نے ۱۹۴۴ء میں سیاحت کی غرض سے روس کا سفر کیا اور روسی تہذیب و معاشرت کے ساتھ ساتھ وہاں کی عملی زندگی کو بھی آشکار کیا۔انہوں نے اس سفر نامے لینن گراڈ تا سمر قند میں اپنے بھرپور مشاہدے سے وہاں کی ایک ایک چیز کو سمیٹا ہے۔ان تمام سفر نامہ نگاروں میں خواتین کی خاصی تعداد بھی شامل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ دی نیو انٹرنیشنل ویبسٹرز کمپری ہنسیو ڈکشنری آف انگلش لینگویج (*The New International Webster's comprehensive Dictionary of the English Language*)، ۲۰۰۶ء، (انسائیکلوپیڈیا ایڈیشن)، جلد ۱، Naples: Trident Reference Publishing۔

۲۔ آکسفورڈ ایڈوانس لرنرز ڈکشنری (*Oxford Advance Learners Dictionary*)، ۲۰۰۴ء، ۷ ایڈیشن۔

۳۔ لانگ مین ڈکشنری آف انگلش لینگویج (*Longman Dictionary of English Language*)، ۱۹۸۴ء، ص ۲۸۸۔

۴۔ کِی کنسپٹس اِن پوسٹ کولونیل لٹریچر (*Key Concepts in Post Colonial Literature*)، نیویارک: پال گریو میک میلین (Palgrave Macmillian)، ۲۰۰۷ء۔

۵۔ دی انسائیکلو پیڈیا امریکن (*The Encyclopedia Emerican*)، انٹرنیشنل ایڈیشن، ص ۸۸۔

۶۔ ناصر عباس نیر، مابعد نو آبادیات اردو کے تناظر میں، (کراچی: اوکسفرڈ یونی ورسٹی، ۲۰۱۳)، ص ۷۔

۷۔ ایڈورڈ سعید، ثقافت اور سامراج، مترجم: یاسر جواد، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۰ء)، ص ۲۰۔

۸۔ ناصر عباس نیر، مابعد نو آبادیات، ص ۸۔

۹۔ عبدالوحید، عالمی جنگوں کا انسائیکلوپیڈیا، (لاہور: نگارشات، ۲۰۰۷ء)، ص ۴۲۔

۱۰۔ سید سبط حسن، ماضی کے مزار، (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۷ء)، ص ۱۱۹۔

۱۱۔ نصیر احمد ناصر، اسلامی ثقافت، (لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۸۴ء)، ص ۱۰۱۔

۱۲۔ بگہ بھگت سنگھ،پنجاب کی سیاسی جدوجہد،مترجم: یاسر جواد،(لاہور: فکشن ہاؤس،۲۰۰۳ء)، ص۱۱۔

۱۳۔ مبارک علی،تاریخ اور سیاسیات، (لاہور: فکشن ہاؤس،۲۰۰۵ء)، ص۶۳۔

۱۴۔ معین الدین عقیل،فتح نامہ ٹیپو سلطان،(لاہور: گنج شکر پرنٹرز)،۱۹۹۹ء، ص۱۴۔

۱۵۔ محمد مجیب،تاریخ، تمدن ہند،(لاہور: پروگریسو بکس،۱۹۸۶ء)، ص۲۲۔

۱۶۔ یوسف علی عبداللہ،انگریزی ادب میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، (لاہور: دوست ایسوسی ایٹس،۲۰۰۳ء)، ص۳۸۔

۱۷۔ خواجہ زکریا،اکبر الہٰ آبادی: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ،(لاہور،۲۰۰۳ء)، ص۲۔

۱۸۔ ناصر عباس نیر،مابعد نو آبادیات، ص۲۲۔

۱۹۔ باری علیگ،کمپنی کی حکومت، (لاہور: سویرا آرٹ پریس،۱۹۶۹ء)، ص۱۰۴۔

۲۰۔ ایڈورڈ سعید،شرق شناسی(*Orientialsim*)،مترجم: محمد عباس،(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۲۰۱۲ء)، ص۴۔

۲۱۔ ملک عبداللہ،پاکستان کی بنیادی حقیقتیں اور پاکستانی فوج کی ابتدا،(لاہور، ۱۹۸۸ء)، ص۳۶۔

۲۲۔ مولوی عبدالحق،سرسید احمد خان: حالات و افکار،(کراچی: انجمن ترقی اردو،۱۹۵۹ء)، ص۱۰۴۔

۲۳۔ ایڈورڈ سعید،شرق شناسی، ص۴۔

۲۴۔ ایضاً، ص۷۔

۲۵۔ ایضاً، ص۲۰۔

۲۶۔ ایضاً، ص۴۱۔

۲۷۔ قدسیہ قریشی،اردو سفرنامے انیسویں صدی میں ، ص۷۷۔

۲۸۔ آغا محمد اشرف،سیرِ ایران،مشمولہ: اردو ادب میں سفرنامہ،انور سدید،(لاہور: قومی پریس، ۱۹۸۷ء)، ص۱۵۱۔

باب سوم

نوآبادیاتی عہد کی خواتین سفر نامہ نگار:

علمی، سیاسی و سماجی پس منظر

باب سوم

نو آبادیاتی عہد کی خواتین سفر نامہ نگار

برطانوی عہدِ حکومت میں جب ذرائع آمد و رفت میں اضافہ ہوا اور سالوں کا سفر مہینوں میں ہونے لگا تو سفر کے رجحان نے تقویت پائی اور ہندوستان کے لوگوں نے سفرِ حج کے علاوہ زیارت و سیاحت کی جانب رختِ سفر باندھا۔ چنانچہ گزشتہ صدیوں کے مقابلے میں بیسویں صدی کے نصف اوّل میں یہ رجحان زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں برطانوی سامراج کے مکمل تسلط کے بعد نہ صرف یہاں کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی نظام میں تبدیلیاں رونما ہوئیں بلکہ تعلیم کی جانب بھی اس قدم نے خصوصی توجہ دی جس کی وجہ سے ہندوستان کے لوگوں میں تعلیم کا رجحان بڑھا۔ خصوصاً سر سیّد کی اصلاحی تحریک نے اس تعلیمی رجحان کی جانب مسلمانوں کو متوجہ کیا اور انھیں جدید تعلیم حاصل کرنے کی طرف مائل کیا۔ ان تمام تبدیلیوں کے اثرات ہندوستانی عورتوں پر بھی مرتب ہوئے اور وہ جدید تعلیم کے لیے کوشاں ہوئیں۔ معاشرے میں تعلیم کی ترقی کی وجہ سے بیداری آئی اور خواتین کو اپنے محدود دائرے سے نکل کر ایک وسیع اور کھلی فضا میں اپنی صلاحیتوں کو منوانے کا موقع ملا۔ اب انھیں گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر دوسرے خطوں اور ملکوں کی جب سیاحت نصیب ہوئی تو ان خواتین نے اپنے مشاہدات و تجربات میں دوسرے لوگوں کو شریک کرنے کے اسی سفر کے احوال کو تحریری صورت دی تو خواتین کے کئی سفر نامے سامنے آئے۔

اردو میں خواتین کے اولین سفر نامے انیسویں صدی کے اواخر میں لکھے گئے لیکن بیسویں صدی میں خواتین نے کثرت سے سفر نامے لکھے۔ اس میں حج کے سفر نامے، مقامی سفر نامے، زیارت گاہوں کے سفر نامے اور یورپ کے سفر نامے شامل ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواتین نے سفر کرنے کے ساتھ ساتھ سفر نامہ تحریر کرنے پر بھی خصوصی توجہ دی۔ اب ہم درج ذیل سفر نامہ نگار خواتین کے علمی، سیاسی و سماجی حالات و پس منظر کا جائزہ لیں گے۔

ا۔نواب سکندر جہاں بیگم

ہندوستان میں جہاں بہت سے نامور لوگ پیدا ہوئے وہاں بعض عورتیں بھی اس بلند مقام و مرتبہ پر پہنچیں کہ جنہیں آج کئی صدیاں گزرنے کے بعد بھی دنیا قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ان عظیم ہستیوں میں ایک نام نواب سکندر بیگم کا بھی ہے۔

نواب سکندر بیگم ۱۳؍اگست ۱۸۱۸ء بمطابق ۱۲۳۳ھ کو بھوپال میں پیدا ہوئیں۔[۱] ان کے والد نواب نظر محمد خان کا ان کے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا جبکہ سکندر بیگم ابھی ایک سال تین ماہ کی تھیں۔ انھوں نے ۱۱ نومبر ۱۸۱۹ء کو ایک حادثہ کی وجہ سے وفات پائی۔[۲] انھوں نے اپنی شفیق اور مدبرانہ صلاحیتوں کی مالک ماں (قدسیہ بیگم) کے زیرِ سایہ تربیت پائی اور اس کے ساتھ اُس عہد کے مشہور علماء اور باکمال اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لیے تمام علوم و فنون کے الگ الگ اساتذہ مقرر تھے۔ دیگر فنون کے علاوہ بیگم سکندر کو فن سپہ گری میں بھی مہارت کمال حاصل تھی۔ وہ بڑی بہادر اور جری خاتون تھیں۔ شیر کا شکار ان کا محبوب شوق تھا۔ پولو کھیلنا بھی انھیں پسند تھا جبکہ شمشیر زنی میں بھی انھیں مہارت حاصل تھی۔[۳] انھیں مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن پاک بھی ترجمے کے ساتھ پڑھایا گیا جس کا اثر نواب بیگم کی شخصیت پر بہت زیادہ پڑا۔ اس کا ثبوت وہ تحریریں اور تقریریں ہیں جس میں وہ برجستہ آیاتِ قرآنی حوالے کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔ نواب سکندر بیگم کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے ان کی والدہ (قدسیہ بیگم) اپنے ایک خط میں گورنر جنرل کو تحریر کرتی ہیں کہ میں نے سکندر بیگم کی تعلیم میں بڑی کوشش کی ہے اور وہ عقل و فراست رکھتی ہیں اس لیے انہیں بغیر کسی مداخلت کے ریاست سپرد کیا جائے۔[۴] نواب قدسیہ بیگم اپنی اکلوتی بیٹی کو مسند ریاست پر فائز دیکھنا چاہتی تھیں مگر نواب نظر محمد خان (والد سکندر بیگم) کی وصیت یہ تھی:

> نظر محمد خان نے میجر ہنری پولیٹیکل ایجنٹ بھوپال اور شہزاد مسیح کو یہ وصیت کی تھی کہ میرے بعد میری بیگم حکومت کریں اور اراکینِ سلطنت مثل میرے ان کی اطاعت کریں، میری بیٹی سکندر بیگم کی شادی ہونے پر ان کا شوہر نواب بھوپال کہلائے۔[۵]

نواب قدسیہ بیگم نے اپنے شوہر کی وفات کے بعد نظامِ حکومت سنبھالی جس میں ان کی مدد کچھ وفادار وزراء سلطنت نے کی۔ ان کے دورِ حکومت میں ریاست بھوپال میں بہت سے ترقیاتی کام ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں

نے خواتین کی تعلیم و بہبود کے لیے بھی عملی اقدامات کیے۔ بیگم قدسیہ کے ذمہ ایک فرض یہ بھی تھا کہ وہ ریاست بھوپال کے لیے کوئی قابل حکمران تلاش کریں اور پھر بالآخر ایسٹ انڈیا کمپنی اور اراکینِ ریاست کے مشورہ کے بعد انھوں نے اپنی بیٹی سکندر بیگم کے عقد کے لیے نواب نظر محمد خان کے بڑے بھائی نواب امیر محمد خان کے چھوٹے بیٹے جہانگیر محمد خان کا انتخاب کیا اور نسبت طے کر دی۔ اس وقت جہانگیر محمد خان کی عمر تقریباً آٹھ یا نو سال تھی۔ قدسیہ بیگم نے ان کی تعلیم و تربیت کے لیے قابل اساتذہ مقرر کیے اور انھوں نے کوشش کی کہ جس طرح سکندر بیگم کی تعلیم ہوئی ہے اسی طرح جہانگیر خان کی بھی اعلیٰ تعلیم اور تربیت ہو اور پھر ۱۹۳۵ء میں دونوں کی شادی تو ہو گئی مگر اختلافات کی ایک ایسی سرد جنگ شروع ہوئی جو ۱۸۴۴ء میں نواب جہانگیر کی وفات کے بعد ہی ختم ہوئے۔

نواب جہانگیر خان کی وفات کے بعد نواب شاہ جہاں بیگم ۲۱ جنوری ۱۸۴۵ء میں رئیسہ فرماں روا کی حیثیت سے تخت نشین ہوئیں، مگر اس کے ساتھ ہی جو شرط نواب سکندر بیگم کے لیے مقرر تھی وہ ان کے لیے بھی قائم رہی کہ جس کے ساتھ نواب شاہ جہاں کی شادی ہو گی وہی شخص امیر ریاست ہو گا۔ نواب شاہ جہاں ابھی کم سن تھیں تو اس لیے نواب فوجدار محمد خان جو نواب سکندر بیگم کے ماموں اور نواب غوث محمد خان کے بیٹے تھے، مختار ریاست مقرر ہوئے۔

ان کے زمانہ مختاری میں ریاست کے نظم و نسق میں بد نظمی، انتشار اور سازشیں پیدا ہونے لگیں تو نواب سکندر بیگم نے ان خطرات کو محسوس کیا جو اس صورت حال سے سامنے آنے والے تھے۔ "انھوں نے ریاست کے تحفظ کے لیے اعتراض و احتجاج بلند کیا اور بالآخر جنوری ۱۸۴۷ء میں خود مختار قرار دی گئیں۔[۶] اب اس کے بعد نواب سکندر بیگم نے اپنے دلائل و براہین کی قوت سے آئندہ کے لیے حکومت برطانیہ سے یہ طے کرایا کہ نواب شاہ جہاں بیگم ریاست کی فرماں روا ہوں گی اور ان کے شوہر برائے نام نواب ہوں گے۔ ۱۵ محرم ۱۲۶۳ھ کو نواب سکندر بیگم مختار ریاست اور نواب شاہ جہاں بیگم کی مسند نشینی ریاست کی رسمیں اکٹھی ادا ہوئیں۔[۷] حکمران ریاست بننے کے بعد نواب سکندر بیگم اپنی قابلیت، شب و روز محنت، بیدار مغزی اور فرماں روائی کے مخصوص اوصاف کی وجہ سے تمام مالی و ملکی انتظام و امور کو بہتری کی جانب لائیں۔ انھوں نے فوجی نظام کی اصلاح کرنے کے ساتھ ساتھ فوجی تربیت اور اسلحہ خانہ کی طرف خصوصی توجہ دی۔ نواب سکندر بیگم کی اپنی ریاست کے لیے کی گئی خدمات کے بارے میں امین زبیری لکھتے ہیں:

پولیس کو باقاعدہ بنایا۔ زراعت پیشہ رعایا کو سود خوروں کے ہاتھوں سے نجات دی۔ شہر کی آراستگی پر توجہ کی اور عالی شان عمارات بنائیں۔ تمام ضروری قوانین نافذ فرمائے اور عدالتیں قائم کیں۔ ملک کی پیمائش کر کے بندوبست کیا اور مالگذاری کے قواعد مقرر کیے۔ عام تعلیم کے لیے ہر گاؤں میں اردو، ہندی کے مدرسے قائم کیے، شہر خاص میں عربی، فارسی، انگریزی اور دستکاری و صنعتی تعلیم کے مدرسے جاری کیے۔ رفاعِ عام کے کاموں سے ان کو بہت دلچسپی تھی۔ سب سے پہلے انھوں نے ہی ریاست میں مدارس اور شفاخانے جاری کیے اور بیرون ریاست بھی امداد دینے کا سلسلہ قائم کیا۔[۸]

انھوں نے اپنی مدبرانہ صلاحیتوں سے کام لے کر بھوپال کو ترقی دی اور ساتھ ساتھ اپنے حقوق و وراثت کی جدوجہد بھی کرتی رہیں کیونکہ وہ مسند ریاست کی اصل حقدار تھیں (نواب نظر محمد خان کی بیٹی تھی) مگر وہ مختار ریاست کے طور پر امور انجام دیتی رہیں۔ آخر کار یکم مئی ۱۸۶۰ء بمطابق ۱۲۷۶ء کو ۴۳ سال کی عمر میں، ۱۱ سال مختار ریاست رہنے کے بعد فرمانروائے بھوپال اور اپنے باپ کی جانشین قرار دے دی گئیں۔ طیبہ بی نے نواب سکندر کی ہمت و استقلال کو ان الفاظ میں سراہا ہے:

> سکندر بیگم فطرتاً امن دوست، صلح پسند تھیں۔ اونہوں نے بھوپال اور اہل بھوپال کی اصلاح کو اپنی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد قرار دیا تھا۔ اس لئے اونہوں نے کسی مشکل کی پرواہ نہ کی اور خدا کی مدد اور اپنی ہمت پر بھروسہ کر کے ان تمام رکاوٹوں اور مشکلات پر فتح پر فتح پائی جو ان کی راہ میں حائل تھیں۔[۹]

سکندر بیگم کی فہم و فراست، حسن تدبیر اور محنت شب و روز ریاست بھوپال کو استحکام بخشا۔ انھوں نے حکمران ریاست بننے کے بعد پوری ریاست کا دورہ کیا، لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور انگریز عمائدین سے سامنے تقاریر کیں۔ وہ غالباً ہندوستان میں پہلی خاتون تھیں جنھوں نے مجمع میں تقاریریں کیں۔[۱۰] اور غدر کے بعد ان کو جی۔ سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا۔ ان کی کوششوں کی وجہ سے جامع مسجد دہلی میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے کی اجازت ملی اور اسے مسلمانوں کے لیے کھول دیا گیا۔ انھوں نے ہندوستان کی تمام ریاستوں سے پہلے بھوپال ریاست میں فارسی کی بجائے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا اور اردو زبان و ادب کی سرپرستی بھی کرتی رہیں۔

نواب سکندر بیگم نے امور سلطنت میں استحکام لانے کے بعد حج بیت اللہ کا ارادہ کیا اور ریاست کے تمام انتظامات کے لیے ایک کونسل آف ایجنسی قائم کر کے نواب شاہ جہاں کو اس کا صدر نامزد کیا۔ کونسل کی کاروائی کے

لیے ایک ضابطہ کار مقرر کر کے اپنی والدہ نواب قدسیہ بیگم کے ہمراہ ۶ جنوری ۱۸۶۴ء کو حج کے لیے روانہ ہوئیں۔ ان کے ہمراہ تقریباً ایک ہزار مرد و زن کا قافلہ تھا۔ نواب سکندر بیگم کو حکمران ہندوستان میں سے سب سے پہلے حج کی سعادت حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا۔[۱۱] اس سے پہلے صرف سلطنت تیموریہ کی تاریخ میں گلبدن بیگم (جو کہ اکبر اعظم کی بہو تھیں) کو اس فرض کو بجالانے کی ہمت ہوئی تھی۔ سفر حج کے دوران سکندر بیگم نے ہر چیز کو بڑی سنجیدگی اور غور و حوض سے مشاہدہ کیا اور روزنامچہ لکھتی رہیں اور بعد میں اس کو یادداشت تاریخ وقائع حج کے نام سے تحریر کیا۔

نواب سکندر بیگم حیرت انگیز صلاحیتوں کی مالک اور ایک خاص قسم کے دل و دماغ کی خاتون تھیں۔ وہ اپنی ذہانت اور کمال قابلیت سے ہر کسی کو متحیّر کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھیں۔ انھوں نے ریاست کے شفاخانوں کو وسعت دی۔ سڑکیں، کنویں، تالاب اور مسافروں کے لیے سرائیں بنوائیں، باغات لگائے اور کئی خوبصورت عمارتیں بھی تعمیر کروائیں۔ ان کے دور میں خزانہ بھر گیا اور ریاست قرض سے سبکدوش ہوئی۔

نواب سکندر بیگم محنتی، جفاکش، دلیر و مدبر حکمران ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سلیقہ مند اور ماہر خاتون خانہ بھی تھیں۔ انھیں سلائی کڑھائی میں بھی دلچسپی تھی۔ ایسی باہمت اور قابل حکمران بھوپال نے باون سال کی عمر میں ۳۰ اکتوبر ۱۸۶۸ء بمطابق ۱۲ رجب ۱۲۸۵ھ کو وفات پائی۔

۲۔ نواب سلطان جہاں بیگم

نواب سلطان جہاں بیگم جی سی ایس آئی۔ جی سی آئی سی۔ سی آئی جی بی ای سابق فرمانروائے بھوپال، ہندوستان کے پٹھان حملہ آوروں کے ایک نامور خاندان کی اولاد تھیں۔ وہ چوتھی ایسی خاتون تھیں جنھوں نے ریاست بھوپال پر بڑی شان و شوکت سے حکمرانی کی۔ نواب سلطان جہاں ۲۷ ذیقعد ۱۲۷۶ھ بمطابق ۱۹ جولائی ۱۸۵۸ء کو ایوان موتی محل میں پیدا ہوئیں۔[۱۲] آپ کے والد کا نام نواب امراؤ دولہ باقی محمد خان اور والدہ نواب شاہ جہاں بیگم تھیں۔ جس سال آپ پیدا ہوئیں، اسی سال آپ کی نانی نواب سکندر بیگم مختار ریاست اور والدہ شاہ جہاں بیگم کو رئیسہ بھوپال تسلیم کر لیا گیا۔ نواب سکندر بیگم کو حکومت برطانیہ نے ۱۸۵۷ء کے غدر میں انگریزوں کے ساتھ تعاون کے صلہ میں ۱۸۷۱ء میں ایک پورا پرگنہ بیرسیہ ان کو دی اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ان کو "اسٹار آف انڈیا" کا تمغہ اور خلعت عطا کی

تھی۔[13] نواب سکندر بیگم اپنی کامیابیوں اور تمام اعزازات کو سلطان جہاں کی نیک بختی سمجھتی تھیں۔ انھوں نے آپ کی پیدائش پر خوب دل کے ارمان پورے کیے اور چھ ماہ تک ریاست میں جشن ہوتا رہا اور غربا و مستحقین میں خیرات و انعامات تقسیم کیے گئے۔ وہ آپ کی پیدائش کو سات بیٹوں کی پیدائش سے زیادہ عزیز سمجھتی تھیں۔ نواب سکندر نے بڑی فیاضی سے عقیقہ کی رسم ادا کی اور سلطان جہاں نام رکھا۔ نواب سلطان جہاں کی عمر جب پانچ سال کی ہوئی تو بڑی دھوم دھام سے ان کی بسم اللہ کی رسم ادا کرنے کے بعد باقاعدہ تعلیم کا آغاز کر دیا گیا۔ نواب سکندر بیگم نے ولادت کے چند ماہ بعد ہی ان کی پرورش کی تمام تر ذمہ داری خود لی اور ان کے سونے، اٹھنے، کھانے، پینے، سواری اور سیر کرنے کا ایک ضابطہ تحریر کیا۔ اسی طرح ان کی تعلیم کے لیے وقت اور اساتذہ کا انتخاب کیا۔ ہر مضمون کے لیے الگ الگ اساتذہ مقرر کیے اور ان سے رپورٹ خود طلب کر لیتی تھیں۔ نواب سلطان کی تعلیم کا جو ضابطہ طے کیا گیا وہ ملاحظہ کیجیے۔

ٹائم ٹیبل (قبل ظہر)

"۵ بجے سے صبح ۶ بجے تک	ہوا خوری
۶ بجے سے ۷ بجے تک	ناشتہ
۸ بجے سے ۱۰ بجے تک	کلامِ مجید
۱۰ بجے سے ۱۱ بجے تک	سرکار خلد نشیں (سکندر بیگم) کے ساتھ کھانا کھانا۔
۱۱ بجے سے ۱۲ بجے تک	چھٹی

بعد ظہر

۱۲ بجے سے ۱ بجے تک	خوش نویسی کی مشق
۱ بجے سے ۳ بجے تک	انگریزی
۳ بجے سے ۴ بجے تک	فارسی
۴ بجے سے ۵ بجے تک	حساب
۵ بجے سے ۳۰۔۵ بجے تک	بانک یا پشتو (اکثر ایک دن پشتو اور ایک دن بانک کی مشق ہوتی تھی)
۳۰۔۵ بجے سے ۶ بجے تک	سواری اسپ (گھڑ سواری)
۶ بجے سے ۷ بجے تک	کھانا کھانا

۸ بجے — سونے کو خواب گاہ میں چلے جانا۔ [۱۴]

سلطان جہاں بیگم کے لیے جن بہترین اساتذہ کا بندوبست کیا گیا تھا ان کے نام اور مضامین درج ذیل ہیں۔

حافظ سید محمد سورتی	کلام مجید
مولوی جمال الدین خان مدار المہام (وزیر اعظم)	ترجمہ قرآن مجید و تفسیر
مولوی رضا علی الملقب بہ شریں رقم	خوش نویسی
منشی حسین خاں ماسٹر	انگریزی
مولوی حسین شاہ بخاری	فارسی
مولوی ایوب صاحب	فارسی
پنڈت لُنپت رائے (گرو جی)	حساب
سید امیر علی پھکیت	بانک
حقداد خاں استاد	شہ سواری
آخوند صاحب	پشتو [۱۵]

نواب سلطان کو قرآن مجید، تفسیر، حدیث، خوش خطی، فارسی، عربی، انگریزی اور پشتو کی تعلیم کے علاوہ آبائی فنون سپہ گری بھی سیکھائے جانے لگے۔ آپ مصوری سے خاص دلچسپی تھی جو بعد میں بھی قائم رہی۔ انھوں نے اس فن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے اپنی ریاست میں پارسی مصور خواتین کو بلایا اور ان سے اس فن کی مشق سیکھی اور اس کے بعد آپ بڑی مہارت سے تصاویر بنا لیتی تھیں۔ غرض کہ ان کے لیے اس تمام تعلیم کا اہتمام کیا گیا جو ایک کامیاب حکمران کے لیے ضروری تھی۔ ۱۳۰۴ھ میں آپ کے والد کا انتقال ہوا اور اس کے تھوڑے عرصے بعد جب آپ کی عمر دس سال تھی تو آپ کو اپنی نانی نواب سکندر بیگم کی جدائی برداشت کرنا پڑی اور تمام تر ذمہ داری آپ کی والدہ نواب شاہ جہاں کے سر آگئی اور انھیں فرماں روائے ریاست اور سلطان جہاں کو باقاعدہ ولی عہد ریاست تسلیم کر لیا گیا۔ اگرچہ آپ کی عمر کم تھی مگر اس تقریب میں بھرے دربار میں شکریے کی ایک تقریر کی جس کو سن کر ان کی جرأت اور قابلیت پر تمام لوگوں نے حیرت کا اظہار کیا۔ نواب سلطان جہاں اپنی نانی کی وفات کے بعد اپنی تعلیم کے سلسلہ میں یوں رقم طراز ہیں:

تعلیم کا جو نظام معین تھا اس میں درہمی و برہمی ہوگئی۔ خوشخطی کی مشق بالکل جاتی رہی۔ اگرچہ قرآن مجید گیارہ (۱۱) سال ہی کی عمر میں ختم ہو چکا تھا مگر دور کرتی تھی اور مولوی جمال الدین خاں صاحب بہادر مدار المہام ایک گھنٹہ ترجمہ اور تفسیر پڑھاتے تھے۔ مولوی محمد ایوب صاحب بھی ایک گھنٹہ تعلیم فارسی دیتے تھے۔ دو گھنٹے انگریزی تعلیم ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ میری روبکاری میں صدود احکام کے لیے دو کاغذات بھی پیش ہوتے تھے جن کی نسبت سرکار خلد مکان کا خاص حکم ہوتا تھا۔ [۱۶]

نواب سکندر جہاں نے اپنی نواسی کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی تھی۔ وہ ان کی انگریزی تعلیم کو بہت ضروری جانتے ہوئے یورپین اساتذہ سے ان کا امتحان دلواتی اور انگریزوں سے گفتگو بھی کرواتی تاکہ ان کی زبان دانی میں مہارت پیدا ہو۔ ڈاکٹر رضیہ حامد نواب سلطان جہاں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں لکھتی ہیں:

سلطان جہاں بیگم کی ذکاوت اور ذہانت کو سکندر جہاں بیگم کی تربیت نے جلا بخشی۔ انھوں نے جلد ہی اردو، فارسی، پشتو اور انگریزی میں مہارت حاصل کر لی۔ نشانہ بازی، گھڑ سواری میں باکمال استادوں کی زیرِ نگرانی مشاق ہو گئیں۔ فنون سپہ گری اور تیر اندازی سے سلطان جہاں پوری طرح واقف ہو گئیں تھیں۔ [۱۷]

نواب سکندر جہاں نے اپنی نواسی کی تربیت کرتے ہوئے ایک حکمران کے اوصاف کے ساتھ ایک خاتون کے اوصاف اور ذمہ داریوں کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا اور انھیں امورِ خانہ داری، دستکاری، کشیدہ کاری کی تعلیم بھی دی تھی۔ سلطان جہاں کی شادی کے لیے نواب سکندر بیگم نے نہایت دور اندیشی کے ساتھ اپنی زندگی میں ہی جلال آباد کے ایک فاطمہ خیل کے قبیلہ کے ایک لڑکے احمد علی خان ولد باقی محمد خان کا انتخاب کر لیا۔ وہ انھیں نواب سکندر بیگم اپنے ہمراہ بھوپال لے کر آئیں اور اپنی زیرِ نگرانی اس کی تعلیم و تربیت شروع کر دی۔ اس وقت احمد علی خان کی عمر آٹھ سال تھی اور وہ خوش رو، خوش وضع اور خوش اخلاق تھے۔ نواب سکندر نے ابھی سلطان جہاں کی نسبت طے کر کے باقاعدہ کوئی رسم نہیں کی تھی کہ ۳۰ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو ان کا انتقال ہو گیا اور بعد میں بہت سے لوگوں کا سلطان جہاں سے پیغام عقد آیا مگر باہم صلاح مشورے سے سلطان جہاں کا عقد احمد علی خان سے ہو گیا۔ اس وقت سلطان جہان ۱۶ سال اور احمد علی خان ۱۸ سال کے تھے۔ [۱۸] اس شادی میں دو کروڑ روپے حق مہر اور چالیس ہزار روپے سالانہ کی جاگیر دولہا کو دی گئی۔ اس تقریب پر ساڑھے چھ لاکھ روپے کا خرچ آیا تھا۔

نواب سلطان جہان کے پانچ بچے پیدا ہوئے جن میں دو لڑکیاں اور تین لڑکے تھے۔ نواب شاہ جہاں کی وفات (۱۹۰۱ء) کے بعد باقاعدہ طور پر جب امور سلطنت آپ کو حاصل ہوا تو آپ نے ریاست کا انتظام سنبھالتے ہی دیکھا کہ قحط اور سابقہ بد نظمی کی وجہ سے ریاست کی حالت نہایت ابتر ہے۔ خزانہ تقریباً خالی تھا۔ یہ دیکھ کر آپ نے اپنے شوہر کے مشورے سے نہایت قابلیت کے ساتھ انتظام کرنا شروع کیا لیکن ابھی ریاست ملے، پورے سات ماہ بھی نہ گذرے تھے کہ نواب احمد علی خان کا انتقال ہو گیا۔ آپ کے لیے یہ صدمہ نہایت سخت اور یہ وقت بڑی آزمائش کا تھا۔ آپ کو ابھی تنہا ہی ریاست کی ذمہ داری اٹھانا تھی۔

جو لوگ آپ کی قابلیت سے ناواقف تھے اور سمجھتے تھے کہ انتظام ریاست نواب احمد علی سنبھال رہے ہیں۔ انھیں نواب کی وفات سے ریاست کی اصلاح سے مایوسی ہونا شروع ہو گئی مگر کچھ ہی عرصہ بعد نواب سلطان جہاں نے ریاست کو ترقی دے کر یہ ثابت کر دیا کہ اصل محنت اور صلاحیت انھی کی تھی۔ نواب سلطان جہاں بے حد بیدار مغز اور معاملہ فہم حکمران تھیں۔ اگرچہ صدمہ بہت بڑا تھا اور اس کے علاوہ وزیر ریاست نے بھی اپنی بزرگی کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا تھا لیکن پھر بھی آپ کا حوصلہ پست نہ ہوا اور آپ نے تن تنہا ریاست کے کام نہایت سرگرم اور مستعدی سے سرانجام دیے۔ متعدد اضلاع کے دورے کیے، رعایا کی اصل حالت اپنی آنکھوں سے دیکھی اور ان کی مشکلات کو فوری طور پر دور کیا۔ اس سلسلہ میں نواب سلطان بیگم لکھتی ہیں:

> میں نے اپنے دوروں میں یہ بھی التزام رکھا تھا کہ مشاجر اور کاشت کاروں کی عورتوں سے بے تکلفانہ ملاقات کروں کیونکہ علاوہ اس کے مجھے صحیح صحیح حالات کا علم حاصل ہو ان کو مجھ سے باتیں کرنے اور ملنے میں ایک خاص خوشی ہوگی جس گاؤں سے میری سواری کا گذر ہوتا تھا جوق در جوق عورتیں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو گود میں لئے ہوئے راہگذر پر اپنے رواج کے مطابق پانی کا برتن لے کر کھڑی ہو جاتیں۔ [۱۹]

نواب سلطان بیگم نے ریاست کے تمام شعبوں کی طرف توجہ دی۔ سب سے پہلے اس کی مالی حالت کو جدید طریقے کے مطابق چلایا جس کی بدولت پہلے ہی سال میں تقریباً تین لاکھ اور دوسرے سال ساڑھے چھ لاکھ آمدنی میں اضافہ ہوا اور اخراجات کی زیادتی کو دیکھتے ہوئے بعض فضول دفاتر بند کر دیے۔ قوانین، پولیس، عدالتیں اور وکیلوں کی تہذیب و اصلاح پر بھی توجہ دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست بھوپال کی عدالتوں کے وقار میں اضافہ ہوا۔ انھوں نے

ریاست میں ذرائع آب پاشی پر توجہ دی اور ڈھائی کروڑ کی لاگت سے اس کا محکمہ قائم کیا۔ ایک چیز جس کی طرف نواب بیگم نے سب سے زیادہ توجہ دی وہ تعلیمی نظام ہے کیوں کہ آپ خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں اور تعلیم کی افادیت سے بہت اچھی طرح آگاہی رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کی پُرزور حامی بھی تھیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ تعلیم نسواں کے لیے وقف کیا۔ انھوں نے اپنی ریاست میں سلطانیہ سکول، مدرسہ وکٹوریا، مدرسہ بلقیسی، برجیسہ کنیا پاٹ شالہ، مدرسہ سکندری، صنعتی مدرسہ، نرسنگ اسکول، مدرسہ طبّی آصفیہ ان کے علاوہ پورے ہندوستان میں خواتین کی کوئی ایسی تحریک نہ تھی جہاں ان کی رسائی نہ ہوئی ہو اور ہندوستانی کی کوئی مفید اسلامی انجمن یا درس گاہ ان کے فیض سے محروم ہو۔ ان کی تعلیمی کاوش کے بارے میں و۔اصاحبہ یوں رقم طراز ہیں:

> ہر ہائنیس نے جاگیر داروں اور شاہی خاندان والوں کو تعلیم کا شوق دلانے کے لیے بے انتہا جد وجہد کی۔ ہر موقع پر تعلیم کی نصیحت کے علاوہ عطیات، انعامات اور عطائے وظائف کے ذریعہ ان کی تالیف قلب کی اور ایسے طریقے بھی اختیار کئے جن سے ایک حد تک وہ تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہو گئے۔[20]

ریاست کے ان تمام ترقیاتی اور بہبود کے کاموں کے ساتھ ہی آپ اپنا وقت علمی و ادبی مشاغل کے لیے بھی نکالتی رہیں اور انھوں نے چالیس سے زائد کتابیں تصنیف کیں جو بے حد شوق اور دلچسپی سے پڑھی گئیں۔ ان تصانیف میں اپنی اور اپنے خاندان کی سوانح عمریاں کے علاوہ معیشت، معاشرت، حفظان صحت، علوم و فنون، تاریخ و سیر، خانہ داری، تربیت اولاد، دستکاری وغیرہ پر کتابیں لکھیں۔ آپ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی چانسلر رہیں۔ سیرت نبوی ﷺ کے لیے علامہ شبلی کو گراں قدر امداد دی۔ سیرت عائشہؓ، سیر الصحابیات اور سیرت الصحابہؓ بھی ان کی مالی امداد سے شائع ہوئیں۔ انجمن ترقی اردو دار العلوم دیوبند اور دوسرے دینی اور علمی مدارس کی کھلے دل سے معاونت کرتیں رہیں۔

نواب سلطان جہاں اپنے اہل و عیال کے ہمراہ یورپ گئیں اور ان کی بہو شاہ بانو نے اس سفر کی روداد کو نواب بیگم کے مشورے اور یادداشتوں سے سیاحت سلطانی کے نام سے شائع کیا۔ اس سفر کے علاوہ انھوں نے فریضہ حج بیت اللہ ادا کیا اور بلادِ اسلامیہ کی بھی سیاحت کی۔ نواب سلطان جہاں کے تخلیقی کارنامے یہ ہیں۔

تزک سلطانی (۱۳۲۸ھ)

بھوپال اور حکمران بھوپال کی تاریخی اور سوانحی حالات پر مشتمل ہے۔

گوہرِ اقبال (۱۹۱۳ء)

اس کتاب میں نواب سلطان جہاں نے اپنے ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۸ء تک کے تاریخی و سوانحی حالات قلم بند کیے ہیں۔

اختر اقبال (۱۹۱۴ء)

یہ کتاب گوہر اقبال کا دوسرا حصّہ ہے۔ اس میں ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۳ء تک کے حالات کا بیان ہے۔

حیات قدسی (۱۳۳۲ھ)

یہ فرمانروا بھوپال نواب قدسیہ بیگم کی سوانح عمری ہے۔

حیات سکندری (۱۹۳۰ء)

نواب سکندر بیگم کی سوانح عمری ہے۔

تذکرہ باقی (۱۹۱۵ء)

نواب باقی محمد خان امراؤدولہ، والد نواب سلطان کی سوانح عمری۔

افضال الرحمٰن (تاریخ سنِ اشاعت و مطبع درج نہیں)

اس رسالہ میں نواب بیگم نے قرآن مجید، بسم اللہ، سورۃ فاتحہ، درود پاک کے فضائل احادیث مبارکہ سے بیان کیے ہیں۔

سیرت مصطفیٰ (۱۹۱۹ء)

اس کتاب میں وہ تمام تقاریر شامل ہیں جو نواب سلطان نے رسول کریم کی سیرت مبارکہ پر کیں تھیں۔

خطبات سلطانی (۱۹۱۳ء)

نواب سلطان جہاں کی تقاریر پر مشتمل ہے۔

سلک شہوار (۱۹۱۹ء)

اس کتاب میں تعلیم و مسائلِ نسواں سے متعلق تقاریر ہیں۔

ہدیہ الزوجین (۱۹۱۵ء)

یہ کتاب امورِ خانہ داری پر مشتمل ہے اور یہ کئی حصوں میں شائع ہوئی۔

حفظِ صحت (۱۹۱۵ء)

صحت و تندرستی کے اصول بیان کیے ہیں۔ امورِ خانہ داری کا دوسرا حصّہ ہے۔

معیشت (۱۹۱۶ء)

امورِ خانہ داری کا تیسرا حصّہ ہے اور اصول خانہ داری پر مشتمل ہے۔

معاشرت (۱۹۱۱ء)

یہ معاشرت کے اصول و قواعد پر مشتمل ہے۔

تندرسی (۱۹۱۶ء)

یہ اصولِ صحت پر مشتمل ہے اور لڑکیوں کو صحت کی حفاظت کے اصول سکھانے کے لیے لکھی ہے۔

بچوں کی پرورش (۱۹۲۱ء)

خواتین کے لیے بچوں کی تعلیم و تربیت کے اصول بیان کیے ہیں۔

مقصدِ ازدواج (۱۹۲۰ء)

اس میں شادی سے متعلق تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

فرائض النساء (۱۹۲۱ء)

اس میں مختلف عنوانات کے تحت خواتین کے فرائض پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تربیت اطفال (۱۹۲۸ء)

بچوں کی تربیت کو بیان کیا گیا ہے۔

عفت المسلمات (۱۹۱۸ء)

قرآن و حدیث کی روشنی میں خواتین کے پردہ کے متعلق بیان ہیں۔

درس حیات (سن ندارد)

اس کتاب میں اولاد کی تعلیم و تربیت، اصولِ خانہ داری، اصول معاشرت اور لڑکیوں کی ضروری تعلیم کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

اخلاق کی پہلی کتاب (۱۹۲۴ء)

بچوں کی اخلاقی تربیت کے لیے لکھی گئی ہے۔

اخلاق کی دوسری کتاب (۱۹۲۵ء)

بچوں کی تربیت کے متعلق لکھی گئی ہے۔

اخلاق کی تیسری کتاب (۱۹۲۵ء)

بچوں کی اخلاقی تربیت کے لیے چھوٹے چھوٹے مضامین پر مبنی ہے۔

باغ عجیب (تاریخ سنِ اشاعت و مطبع درج نہیں)

یہ کتاب دو حصّوں پر مشتمل ہے اور بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔اس کا موضوع بھی اچھے اخلاق ہیں۔

مطبخ کنگ جارج (۱۹۳۱ء)

یہ خواتین کے لیے ہے اور اس میں مختلف چیزیں بنانے کی تراکیب ہیں۔

ہدایات سلطانی (۱۹۱۳ء)

یہ کتاب نواب سلطان جہاں کے دورِ حکومت میں بنائے گئے قوانین پر ہے۔

ہدایات باغبانی (۱۳۴۱ء)

باغبانی کے متعلق احکام ہیں۔

نٹنگ بننے کا پہلا رسالہ (۱۹۱۶ء)

خواتین کے لیے سلائی کڑھائی پر مبنی ہے۔

مذکورہ بالا تمام تصانیف کے بارے میں معلومات بیگمات بھوپال سے لی گئی ہیں۔ [۲۱]

نواب سلطان جہاں کو تصنیف و تالیفات کا بے حد شوق تھا اور اس کے لیے انھوں نے ایک خاص شعبہ قائم کیا ہوا تھا۔ جس میں ملک کے نامور لوگوں کی خدمات حاصل کی گئی تھی۔ نواب بیگم تمام تصنیفات کے مسوّدوں پر نظر ثانی کرتیں تھیں اور وہ ہندوستانی خواتین میں سب سے بڑی کثیر التصانیف خاتون ہیں۔ [۲۲]

ہر ہائینس کو اپنی والدہ شاہ جہاں بیگم کی طرح فنِ تعمیر کا بھی شوق تھا۔ اس لیے آپ نے اپنی ریاست میں کئی

عالیشان پبلک اور ذاتی عمارتیں تعمیر کروائیں۔ اس کے علاوہ حرفتی سکول، یتیم خانے بھی قائم کیے۔ یہاں سے بچیوں کی شادیاں بھی سرکاری خرچ سے کی جاتیں تھیں۔

ان تمام حیثیتوں کے علاوہ آپ کی عظمت کا سبب آپ کے محاسن اخلاق تھے۔ آپ طبعاً نہایت رحم دل، فیاض، خلیق، درد مند اور ملنسار تھیں۔ ایک ریاست کی فرماں روا ہونے کے باوجود آپ کے مزاج میں انکساری پائی جاتی تھی۔ وہ دوسروں کی خطاؤں کو در گزر کر دیتیں اور بسا اوقات محض چشم پوشی ہی اصلاح کے لیے ضروری سمجھتی تھیں۔ نواب سلطان بیگم نہ صرف اپنی رعایا کے ہر طبقے کے ساتھ مساوات کا خیال رکھتیں بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ نہایت فراخ نظری اور رواداری کا برتاؤ کرتی تھیں۔ ان تمام صفات کے علاوہ وہ نہایت صابر اور مستقل مزاج خاتون تھیں۔ ان کے کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے جسے بیان کرنے کے لیے کئی کتابیں تخلیق ہو سکتی ہیں۔ سر زمین بھوپال کا یہ درخشاں ستارہ اپنی روشنی بکھیر کر ۱۲ مئی ۱۹۳۰ء کو اہلِ ہند کو سحرِ جاوداں عطا کر کے دوسرے جہاں کی مسافرت پر روانہ ہو گیا۔ نواب سلطان جہان کو ان کی وفات کے بعد "فردوس آشیاں" کا لقب دیا گیا۔ [۲۳]

۳۔ نواب بیگم سربلند جنگ بہادر (اختر حمید)

آپ اردو زبان کی ادیبہ اور شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ تحریکِ نسواں کی ایک متحرک رکن بھی تھیں۔ نواب بیگم کا اصل نام اختر حمید سلطان خانم تھا اور آپ نواب سردار الملک مرحوم کی بڑی بیٹی تھیں۔ [۲۴] اختر حمید کی تعلیم و تربیت خانگی طور سے ہوئی اردو، فارسی، عربی کے علاوہ انگریزی میں بھی مہارت حاصل کی۔ [۲۵] اور آپ کی شادی نواب حمید اللہ خان سربلند جنگ بہادر سے ہوئی۔ نواب حمید اللہ خان مولوی محمد سمیع اللہ خان کے بڑے بیٹے تھے۔ مولوی سمیع اللہ (۱۸۳۴ء۔۱۹۰۸ء) سرسید تحریک کے سرگرم و فعال رکن ہونے کے ساتھ ساتھ سر سیّد احمد خان کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ سر سیّد احمد خان اور مولوی محمد سمیع اللہ خان میں خاندانی قرابت بھی پائی جاتی تھی۔

نواب حمید اللہ خان (۱۸۶۴ء۔ ۱۹۵۲ء) مدرستہ العلوم علی گڑھ کے پہلے طالب علموں میں سے تھے۔ انھوں نے لندن سے سول سروس کے امتحان کے ساتھ بیرسٹری کی ڈگری بھی حاصل کی۔ بعد ازاں وہ ریاست حیدر آباد دکن میں چیف جسٹس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ انھیں حکومتِ برطانیہ کی جانب سے سربلند جنگ بہادر اور افضل العلما کا خطاب ملا۔ [۲۶]

بیگم سربلند جنگ نے اپنے عہد کی روایات کے مطابق اپنانام ہمیشہ مخفی رکھااور اپنے شوہر کے نام کو قلمی طور پر استعمال کیا۔ اس وجہ سے راقمہ کو ان کے اصل نام کو ڈھونڈنے میں کافی دقت کا سامنا رہا۔ کیوں کہ ہر سفر نامے کی تاریخ کی کتابوں میں بیگم سربلند جنگ ہی درج تھا۔ اب تک کسی بھی محقق نے یہ کوشش نہیں کی تھی کہ ان کے اصل نام اور کوائف کے متعلق معلومات حاصل کی جائیں۔ جس کی وجہ سے کافی تگ ودو کے بعد اور مختلف رسائل وتذکرے کھنگالنے کے بعد نہ صرف اس مصنفہ کے سوانحی حالات دریافت ہوئے بلکہ دیگر سفر نامہ نگار خواتین کے سلسلہ میں بھی ایسی ہی مشکلات سے دوچار ہوناپڑا۔ بیگم سربلند جنگ بہادر کی تاریخ پیدائش کے متعلق معلومات کی عدم دستیابی کی وجہ سے اگر نواب حمیداللہ خان کی تاریخ ولادت سے قیاس کریں تو نواب بیگم تقریباً ۱۸۶۰ء۔ ۱۸۷۰ء کے دورانیہ میں پیدا ہوئی ہوں گی۔

یورپ کی سیاحت کے دوران آپ نے بہت سے لوگوں سے انگریزی اور عربی زبان میں گفتگو بھی کی ہے۔ جس سے اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ بیگم صاحبہ ان زبانوں کو بولنے پر قدرت رکھتی تھیں۔ کافی عرصہ سے آپ کے دل میں بیت اللہ شریف کی آرزو تھی جو کہ ۱۹۰۹ء میں پوری ہوئی اور آپ نواب حمیداللہ خان کے ساتھ اس سفرِ حجاز پر روانہ ہوئیں۔ حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد آپ دونوں یورپ کی سیاحت سے بھی لطف اندوز ہوئے اور اس سفر کی یادداشت آپ محفوظ کرتی رہیں۔ بعد میں اسے کتابی صورت میں دنیا عورت کی نظر میں (۱۹۱۰ء) میں شائع کیا۔

آپ ایک مصنفہ ہونے کے ساتھ اچھی شاعرہ بھی تھیں اور اپنے شوہر کے نام سے لکھتی تھیں۔ آپ کی شاعری کے بارے میں پرنس آف ویلز سے کی گئی گفتگو سے بھی پتہ چلتا ہے۔ جیسا کہ ایک جگہ سفر نامے میں وہ لکھتی ہیں:

> پھر کہا کہ ! مجھ کو تمہاری وہ نظم جو تم نے میرے متعلق لکھی تھی یاد ہی اسکو تم ترجمہ کر کے دے سکتی ہو؟ میں نے کہا ضرور ضرور یہاں سے ہندوستان جاتے ہی ترجمہ کر کے بھیجدونگی۔ [۲۷]

بیگم سربلند جنگ برصغیر پاک وہند کی خواتین کی ناگفتہ بہ تعلیمی حالت پر رنجیدہ رہیں اور خواتین کے جلسوں میں اپنی تقاریر کے ذریعے انھیں تعلیم کی جانب مائل کرتی نظر آتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ تعلیم کا اصل گہوارہ گھر ہے۔ گھر

سے ہی تعلیم کا آغاز ہوتا ہے اس لیے لڑکیوں کو تعلیم کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔[۲۸] بیگم سر بلند جنگ کی تعلیم سے متعلق شاعری بطور نمونہ ملاحظہ کیجیے۔

جو کرتے نہیں ہیں نگہہ بات پر
لگائے خیالوں کو ہیں گھات پر
اثر کس طرح ہووے اونمیں بھلا
ضلالت نے دیں راہیں اونکی بھلا
لڑکپن میں جانچا نہیں ہوش کو
جوانی کو کہو یا فراموش سو
بڑھاپے نے جو سر ہلایا ذرا
لگے تھر تھرانے وہیں خوب سا
کہ آہ حسرتا ہم نے تعلیم میں
نظر کچھہ نہ کی گھر کی تفہیم میں
اسی پر کیا مختتم یہہ کلام
جو آگے کو باقی رہے والسّلام[۲۹]

بیگم سر بلند جنگ اس عہد کی ایک فعال اور سر گرم خاتون تھیں۔ آپ رسالہ عصمت میں مضامین بھی لکھتی رہیں اور یہاں موقع ملتا تو وہ خواتین سے تقریر کے ذریعے بھی مفید باتیں سمجھنے کی کوشش کرتیں۔ جیسا کہ جنوری ۱۹۳۸ء کے شمارہ عصمت میں ایک تقریر کی نقل درج ہے جو انھوں نے خواتین دہلی کے جلسہ میں کی تھی۔ اس سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> آپ میں سے بہت سی خواتین نے بچشم خود دیکھا ہوگا کہ غیر قوم کی لیڈیز ہمارے متوسط درجہ کی بہنوں کو نمائش کے ذریعہ صنعت و حرفت اور دوسری چیزیں خود کر کے دکھاتی ہیں۔ غور کیجیے کیا یہ ہماری بہنوں کے لیے شرمناک نہ تھا۔ ہمارے ملک ہند کی ہر ہر بی بی بجائے خود دل ودماغ بخوبی رکھتی ہے لیکن افسوس تربیت کامل نہ ہونے کی وجہ سے جہالت نے بدنام کر رکھا ہے اب ہم کو ضرور متوجہ ہو کر فسٹ ایڈ کی صفائی رکھنا بچوں کی

پرورش ان کو خوش مزاج صحت ور بنانا عمدہ کھانا پکانا، لباس قطع کرنا، شب و روز کا جدا جدا لباس پہننا اور خود دیکھ بھال کرنا سیکھنا اور سیکھانا چاہتے۔[۳۰]

بیگم سربلند ہندوستان کے ایک روحانی پیشوا جناب حضرت مولانا مولوی محمد قیام الدین عبدالباری صاحب کے حلقہ مریدین میں شامل تھیں اور اُن سے بہت عقیدت رکھتی تھیں۔ اپنے سفر نامہ دنیا عورت کی نظر میں میں وہ اپنے پیرومرشد کے متعلق یوں رقم طراز ہیں۔

ایک عرئضہ اپنے پیرومرشد جناب مولانا مولوی محمد قیام الدین عبدالباری صاحب قبلہ کی خدمت اقدس میں لکھا۔ یہ حضرت میرے پیرومرشد جناب مولانا الحاج مولوی محمد عبد الوہاب صاحب قبلہ کے چھوٹے صاحبزادے ہیں اور بہت ہی سچے پیر ہیں۔ آج ان کا ثانی دوسرا نہیں۔ ان سے بھی اجازت حج بیت اللہ کی لے لی تھی۔[۳۱]

انھوں نے سفرِ حجاز اور سفرِ یورپ اپنے شوہر نواب حمید اللہ خان کے ساتھ کیا۔ اس سفر کی یادوں کو نواب سربلند جنگ نے بھی سیرِ قسطنطنیہ کے نام سے ۱۹۱۰ء میں شائع کیا۔

۴۔ نازلی رفیعہ سلطان

نازلی رفیعہ سلطان اردو سفر نامہ نگاری میں نمایاں مقام رکھتیں ہیں۔ وہ ۱۹ فروری ۱۸۷۴ء کو بمبئی میں پیدا ہوئیں۔[۳۲] ان کی والدہ کا نام امیر النساء بیگم جو کہ اُس وقت کی ایک بہت اچھی شاعرہ اور ناول نگار بھی تھیں۔ ان کی یادگار تصانیف میں قصائد و غزلیات پر مشتمل دیوان اور ایک ضخیم ناول "نادر بیان" ہے۔[۳۳] اس کے علاوہ امیر بیگم کی منظوم دعاؤں کا مجموعہ "آمین" ہے جسے ان کی سب سے بڑی بیٹی زہرا بیگم نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ امیر النساء کی شادی فیض حیدر کے بیٹے حسن علی سے ہوئی جو کہ ترکی میں کاروبار کرتے تھے۔

نازلی بیگم نے جس ماحول میں پرورش پائی اس میں عام مسلمان گھرانوں کی نسبت پڑھنے لکھنے کا رواج زیادہ تھا۔ نازلی کے آباؤاجداد میں طیب جی خاندان اپنے عہد کا ایک بڑا ممتاز گھرانہ تھا اور ۱۸۲۵ء میں ان کی فرم "طیب جی اینڈ کو" کے نام سے بمبئی کے کاروباری حلقوں میں پہچانی جاتی تھی۔[۳۴] طیب علی نے بھائی میاں کے سب سے بڑے

بیٹے ہونے کی وجہ سے ان کی مالی مشکلات میں ان کا ہاتھ بٹایا اور اسی تگ و دو میں طیب علی واجبی سی تعلیم حاصل کر سکے، مگر وہ تعلیم کی اہمیت سے واقف تھے۔ اسی لیے انھوں نے بعد میں خود محنت کر کے عربی، اردو اور انگریزی زبان سیکھی اور اپنی اولاد کو بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ بھیجا۔ طیب علی نے ایک مذہبی رسالہ گلبنِ ہدایت تحریر کرنے کے علاوہ اپنے خاندانی حالات و واقعات قلم بند کرنے کے لیے کتاب اخبار قبیلہ طیّبی کی بھی بنیاد رکھی جس میں خاندان کے ہر فرد کو سختی سے اپنے اپنے واقعات و تاثرات لکھنے کی تاکید کی تھی۔ اس طرح انھوں نے خاندانی تاریخ مرتب کرنے کا منفرد انداز اختیار کیا۔[۳۵] ڈاکٹر معین الدین عقیل نے طیب جی کی اس خود نوشت سوانح کو اردو کی اوّلین سوانح مانا ہے اور اسے زبان و اسلوب کے لحاظ سے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں شامل کیے جانے کا پوری طرح مستحق بھی قرار دیا ہے۔[۳۶]

نازلی رفیعہ بیگم کے نانا شجاع الدین، طیب جی کے سب سے بڑے بیٹے تھے اور وہ اپنے والد کے وسیع کاروبار کو، جس کی شاخیں ہاروے، فرانس اور کراچی میں قائم تھی اور وہ اس کاروبار کو سنبھالتے تھے۔ شجاع الدین کا شمار کراچی کے اہم تاجروں میں کیا جاتا تھا۔ ان کی بیگم درۃ الولی ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔[۳۷] شجاع الدین کی اکلوتی بیٹی امیر النساء جو کہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑی اچھی شاعرہ اور ادیبہ بھی تھیں۔ ان کے اشعار ان کے خاندانی اخبار "کتاب اخبار قبیلہ شجاع الدین طیّبی" اور ان کے خطوط میں بھی ملتے ہیں۔

نازلی بیگم امیر النساء کی منجھلی صاحبزادی ہیں۔ ان کی تین بیٹیاں زہرا بیگم فیضی، نازلی بیگم اور عطیہ فیضی ہیں اور یہ تینوں اردو ادب کی نامور ادیبہ ہیں۔ امیر النساء کا ادبی ذوق نازلی بیگم کو بھی ورثہ میں ملا اور انھوں نے بھی ساری زندگی لکھنے لکھانے کا کام جاری رکھا۔ وہ تہذیب نسواں اور دیگر رسائل میں مضمون نگاری کرتی رہیں۔

نازلی رفیعہ بیگم نے ۱۸۸۶ء میں نواب صاحب جنجیرہ سر سیّدی احمد خان سے شادی کی۔ نواب صاحب بھی ایک مہذب اور تعلیم یافتہ انسان تھے۔[۳۸] انھوں نے اپنی ریاست میں تعلیم کو عام کرنے کے لیے بہت سی کوششیں کیں اور نازلی بیگم سے شادی کے بعد انسانی فلاح و بہبود کی اور پھر اسی جد و جہد میں اور تیزی آ گئی۔ نازلی نے یورپ سے واپسی کے بعد ریاست جنجیرہ میں لڑکیوں کے لیے ایک سکول قائم کرنے کے ساتھ اپنے خاندانی احوال لکھنے کے لیے اخبار نامہ احمدی بھی جاری کیا۔

بیگم نازلی باشعور، تعلیم یافتہ اور خواتین کی بڑی ہمدرد تھیں۔ انھوں نے یورپ سے واپسی کے بعد برصغیر کی خواتین کو تعلیم سے آشنا کیا اور ان میں بیداری پیدا کرنے کے لیے ایک جلسہ منعقد کیا۔ اس میں انھوں نے اہلِ یورپ کے طرزِ معاشرت، فنون، تعلیمی نظام اور رہن سہن سے آگاہ کیا۔ نازلی بیگم عورتوں کی تعلیم اور بیداری کے لیے ہمیشہ کوشاں رہیں۔ وہ عورتوں کے لیے ویسی ہی تعلیم چاہتی تھیں جیسی مردوں کے لیے ضروری ہے تاکہ عورت بھی کسی کی محتاج نہ رہے بلکہ ضرورت پڑنے پر اپنے ہاتھوں سے سب کچھ کر سکے۔ جب وہ یورپ گئیں تو وہاں کی ترقی سے بے حد متاثر ہوئیں خصوصاً عورتوں کو زندگی کے ہر شعبے میں بڑھا ہوا دیکھ کر برصغیر کی عورت کی تنزلی انھیں دکھ دیتی تھی۔ لندن میں قیام کے دوران نازلی بیگم نے ایک شاندار دعوت دی جس میں دیگر معززین کے ساتھ علامہ محمد اقبال نے بھی شرکت کی اور نازلی بیگم کی دستخطوں کی کتاب پر دستخط کرنے کے ساتھ علامہ اقبال نے یہ شعر فی البدیہہ تحریر کیے۔

اے کہ تیرے آستانے پر جبیں گستر قمر
اور فیض آستاں بوسی سے گل برسر قمر
روشنی لے کر تری موجِ غبارِ راہ سے
دیتا ہے لیلائے شب کو نور کی چادر قمر
کاروان قوم کی مجھ سے ہے زینت اس طرح
جس طرح گردوں پہ صدرِ محفلِ اختر قمر

جس عہد اور ماحول میں نازلی بیگم سفر نامہ تحریر کر رہی تھیں، وہ عہد برصغیر کے مسلمانوں کے زوال وانحطاط کا عہد تھا۔ مغلیہ حکومت کے خاتمے اور برطانوی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی مسلمانوں کی پستی کا آغاز ہو گیا تھا۔ ایسے کٹھن وقت میں بہت سے ممتاز لوگ مسلمانوں کو اس زوال سے نکالنے کے لیے اپنے اپنے میدان میں کام کر رہے تھے۔ ایسے حالات میں چند خواتین بھی اس میدان میں اتریں اور انھوں نے طبقہ نسواں کو معاشرے کا ایک اہم رکن سمجھتے ہوئے، ان کی تعلیم و تربیت، اخلاق و عادات کو درست کرنے اور ان کے اندر جذبہ علم و فن اور جذبہ تحریک و عمل بیدار کرنے کے لیے عملی کوششیں کیں۔ نازلی بیگم بھی ساری زندگی اسی مقصد کی بجاآوری کے لیے کوشاں رہیں۔ انھوں نے عورتوں کو بیدار کرنے کے لیے نہ صرف تقاریر کیں بلکہ مختلف رسالوں میں مضامین بھی لکھے۔ وہ جب

یورپ کی سیاحت کے دوران ترکی گئیں تو انھیں ان کی خدمات کے صلے میں سلطان عبد الحمید کی جانب سے "نشانِ شفقت" کے تمغے سے نوازا گیا۔[۳۹]

نازلی بیگم کو اردو سفر نامہ نگاری کے میدان میں نمایاں مقام حاصل رہا ہے۔ انھوں نے ۱۸۰۸ء میں نواب سر سیّدی، اپنے بھائی علی اصغر اور عطیہ فیضی کے ہمراہ یورپ کے مختلف ممالک کا سفر اختیار کیا اور ان کا سفر نامہ سیرِ یورپ ان کے خطوط سے مرتب شدہ ہے جو انھوں نے قیامِ یورپ کے دوران اپنے عزیزوں اور خاص کر اپنی بہن زہرا فیضی کو لکھے تھے۔ ان خطوط کو زہرا بیگم نے برصغیر کی خواتین کی معلومات کے لیے سلسلہ وار عصمت میں شائع کیا اور بعد میں اس سفری احوال کو ۱۸۰۸ء میں کتابی صورت میں شائع کروایا۔ اپنے اس سفر نامے کی اشاعت کے سلسلے میں بیگم نازلی دیباچے میں لکھتی ہیں:

> اصل میں یہ خطوط ہیں جو میں نے اپنے بزرگوں کے نام سیرِ یورپ کے حالات لکھے ہیں۔ اس میں نہ عبارت آرائی ہے نہ قافیہ پیمائی۔ صاف سیدھی عبارت ہے، وہاں کے حالات، طرزِ معاشرت، تدبیر المنازل، بعض امور سیاسیہ، تجارت، ہنروری، اقسام فنون کی کثرت، تہذیب، طریقہ تعلیم، دربار کے آداب، جو میں جتنا سمجھ سکی اپنی زبان میں اپنے اہلِ وطن کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔[۴۰]

نازلی رفیعہ سلطان کا اردو ادب میں سب سے بڑا کارنامہ ان کا سفر نامہ سیرِ یورپ ہے۔ اس سفر نامے کی اشاعت کا سب سے بڑا مقصد بیداریٔ نسواں اور تعلیمِ نسواں تھا تا کہ اس کے مطالعے سے پسماندہ اور کم پڑھی لکھی خواتین حصولِ تعلیم کی کوشش کریں۔ یہ سفر نامہ تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۲۴ تصویریں بھی شامل ہیں۔ اس سفر نامے کا انتساب انھوں نے اپنی والدہ امیر النساء کے نام کیا ہے۔ یورپ کے مختلف ممالک کا سفر نازلی بیگم نے اپنے شوہر نواب سر سیّدی احمد خان کے ساتھ سیاحت کی غرض سے کیا تھا اور وہ کچھ مہینوں کی سیر و سیاحت کے بعد وطن واپس آ گئے۔

نازلی بیگم کی ازدواجی زندگی زیادہ دیر خوشگوار نہ رہ سکی اور اس میں اختلافات، نواب صاحب کی اولادِ نرینہ کی خواہش کی غرض سے کی جانے والی شادی کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ ان اختلافات کو دور کرنے کے لیے بہت سے لوگوں نے کوششیں کیں اور بعد میں نواب صاحب نے بھی نازلی بیگم کو منانے کی بہت کوشش کی مگر نازلی بیگم نے انکار کرتے ہوئے ۱۹۱۵ء میں نواب صاحب سے الگ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس ایک اختلاف کی وجہ سے نہ صرف نازلی بیگم

کی ازدواجی زندگی کو نقصان پہنچا بلکہ اس وجہ سے بھائیوں اور بہنوں میں بھی دُوری بڑھ گئی۔ اس دکھ کی کیفیت کو نازلی بیگم یوں بیان کرتی ہیں۔

> اگر ہمارے بھائی ہم کو اس عزت اور courtesy سے پیش نہیں آتے ہیں جس کے ہم مستحق ہیں اور خدا کی مہربانی سے دنیا ہم کو دیتی ہے تو بہتر ہے کہ ہم دور رہیں۔۔۔۔۔ میرے دل پر اس کا نہایت رنج اور صدمہ ہے کہ نواب صاحب نے مجھ سے اس قدر بے اعتنائی کی مگر میرے دو بھائیوں نے بدستور ان سے ملنا جلنا قائم رکھا۔ میرے اس مصیبت کے وقت میں میری دلی اور سچی ہمدردی میری دو بہنیں رہیں اور رحمین رہے۔ باقی کل خاندان کی بے غیرتی کا ایسا نقش میرے دل پر جما ہے کہ عمر بھر نہ بھولوں گی۔ [۴۱]

ان حالات کی وجہ سے نازلی بیگم کی آخری زندگی کراچی میں بڑی تنگ دستی اور کسمپرسی میں گذری اور ان کی دیکھ بھال کیپٹن وحید کیا کرتے تھے جو ان کے رشتہ دار نہیں تھے۔ [۴۲] اور بالآخر وہ ۱۹۶۸ء میں شدید بیماری سے لڑتے ہوئے انتقال کر گئیں اور انھیں کراچی میں سپردِ خاک کیا گیا۔

۵۔ بیگم عطیہ فیضی

بیگم عطیہ فیضی کو اردو زبان وادب میں اہم مقام حاصل ہے۔ وہ برصغیر پاک و ہند میں مسلمان خواتین کے تشخص کے تحفظ، حقوق و بیداری نسواں اور تعلیم نسواں کی جدوجہد کرنے والی خواتین میں شمار ہوتی تھیں۔ وہ ایک شعلہ بیان مقرر، حصولِ علم کے لیے کوشاں، بے دار مغز رکن تحریک نسواں اور سب سے بڑھ کر وسیع النظر اور بااصول خاتون تھیں۔ ان کے ادبی کارہائے نمایاں کی جرات مندیوں کی داستان متاثر کن ہے کہ ان کی بے باکی، خوداعتمادی اور ذہانت سے اردو ادب کی دو بڑی شخصیت مولانا شبلی نعمانی اور ڈاکٹر محمد اقبال بہت متاثر رہے۔

اگرچہ اردو ادب میں تخلیقی کام کے حوالے سے عطیہ فیضی کا کام کچھ زیادہ نہیں مگر اس وجہ سے نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ ان کے ہاں انیسویں صدی کے جدید اور انقلابی سوچ کے مضبوط حوالے ملتے ہیں۔ بیگم عطیہ بیک وقت کئی محاذوں پر لڑنے والی شخصیت تھیں۔ وہ ایک وقت میں اصلاحِ معاشرہ، ادب، حصولِ علم، حقوق و تعلیمِ نسواں کے میدان میں سرگرم عمل رہیں۔ ان کی زندگی مختلف زاویوں میں بٹی ہونے کی وجہ سے وہ اپنی مکمل توجہ تخلیقی ادب کی

جانب نہ دے سکیں اور اردو ادب ان کی تخلیقات سے محروم رہ گیا مگر انگریزی زبان میں ان کی تصانیف ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی اہمیت ابتدائی دور کی خواتین سفر نامہ نگاروں اور مضمون نگاروں کی فہرست میں اہم ہے۔

عطیہ فیضی ۱۸۷۷ء کو استنبول کے قریب ایک مقام آطہ میں پیدا ہوئیں۔[۴۳] ان کے والد حسن علی فیضی کاروبار کے سلسلہ میں استنبول میں مقیم تھے۔ عطیہ بیگم نے باقاعدہ کسی مدرسہ یا کالج سے تعلیم نہیں پائی مگر ان کو انگریزی زبان پر اتنا عبور ہے کہ گویا ان کی مادری زبان ہو۔ ان کی قابلیت کا سہرا ان کی والدہ امیر النساء بیگم کے سر ہے جو اپنے عہد کی ایک پڑھی لکھی اور روشن خیال خاتون تھیں۔ وہ کئی کتابوں کی مصنفہ تھیں جن میں نادر بیان ایک ناول ہے جو کہ ایک انگریزی ناول سے ماخوذ ہے۔[۴۴] امیر النساء کو شاعری کا ملکہ بھی حاصل تھا اور ان کی شاعری کے نمونے خطوط کے علاوہ اخبار قبیلہ طیبی میں ملتے ہیں۔ ان کی منظوم دعاؤں کا مجموعہ آمین اور قصائد و غزلیات پر مشتمل ایک دیوان ان کی بڑی بیٹی زہرا بیگم نے شائع کیے۔[۴۵]

عطیہ فیضی کے آباؤاجداد کا تعلق کاٹھیاواڑ اور سورت کی ریاستوں کے درمیان خلیج کیمبے (Combay) کے ایک سرے پر واقع ساحلی ریاست کیمبے سے تھا اور یہ خاندان مذہبی لحاظ سے سلیمانی بوہرہ کی جماعت سے تھا۔ بیگم عطیہ کے جدِامجد طیب علی ۱۸۰۳ء میں بھائی میاں کے گھر پیدا ہوئے۔[۴۶] جو کہ پیشے کے لحاظ سے تاجر تھے اور بمبئی میں ان کا وسیع کاروبار تھا مگر اچانک لگنے والی آگ نے ان کے تمام اثاثے کو جلا کر راکھ کر دیا۔ یہ دور بھائی میاں پر بڑا کٹھن اور صبر آزما تھا۔ اس وقت طیب علی کی عمر تقریباً آٹھ سال تھی اور وہ اپنے باپ بھائی میاں کے ساتھ مل کر بمبئی میں پھیری لگا کر اشیا فروخت کرتے تھے تاکہ خاندان کی ضروریات کو پورا کیا جا سکے۔ طیب علی بچپن سے ہی بڑے ذہین اور محنتی تھے مگر معاشی تنگ دستی کی وجہ سے وہ تعلیمی سلسلہ برقرار نہ رکھ سکے۔

طیب جی نے اپنی مستقل مزاجی، ذہانت اور کاروباری سوجھ بوجھ سے کچھ ہی عرصے میں "طیب جی اینڈ کمپنی" کے نام سے ایک فرم قائم کرلی۔[۴۷] طیب علی کو خود تو تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ ملا مگر تعلیم کے زبردست حامی اور روشن خیال تھے اسی وجہ سے انھوں نے اپنی اولاد کو تعلیم کی بہترین سہولیات فراہم کیں اور اپنے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ بھیجا۔ طیب جی کی علم پروری کی بنا پر ڈاکٹر میمونہ دلوی نے بمبئی میں طیب خاندان کو اردو کے سرپرست خاندانوں میں شامل کیا ہے۔[۴۸]

طیب جی چوں کہ تعلیم سے خصوصی لگاؤ رکھتے اور تعلیم کی اہمیت سے بھی آگاہ تھے اس لیے انھوں نے اپنے مذہبی فرقے کی ترقی میں بھی بڑااہم کردار ادا کیااور سلیمانی فرقہ کے حق میں ایک رسالہ گلبن ہدایت کا بھی تحریر کیا۔[۴۹] اس کے علاوہ انھوں نے اپنے خاندان کی تاریخ اور حالات لکھنے کے لیے "کتاب اخبار قبیلہ طیبی" جاری کیا جس میں تمام افراد کو اپنے روزانہ کے معمولات لکھنے کی تاکید کی تھی۔ اس طرح طیب جی نے اپنی اس کتاب میں اپنی خودنوشت سوانح لکھنی شروع کی اوران کو اردو ادب کی پہلی خودنوشت سوانح لکھنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل اس خودنوشت کو اردو ادب کی اولین خودنوشت سوانح عمری قرار دیتے ہیں۔[۵۰]

عطیہ فیضی کے نانا شجاع الدین طیب علی کے سب سے بڑے بیٹے تھے جو اپنے والد کا کاروبار سنبھالتے تھے۔ ان کی اکلوتی بیٹی امیر النساء کی شادی حسن علی بن فیض حیدر سے ہوئی۔ حسن علی کے والد فیض حیدر بھائی میاں کے چھوٹے بیٹے اور طیب جی کے بھائی تھے۔ حسن علی فیضی ترکی میں کاروبار کرتے تھے اور ان کا کاروبار بہت سے ممالک میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ وہ سلطان عبدالعزیز اور سلطان عبدالحمید کے مشیر کے منصب پر بھی فائز تھے اور ترک دربار میں انھیں حسن آفندی فیضی کے نام سے جانا جاتا تھا۔[۵۱]

عطیہ فیضی علم موسیقی کی ماہر تھیں اوران کی علم موسیقی کے علاوہ دیگر تصانیف درج ذیل ہیں۔

۱۔ Indian Music (1914)

۲۔ The music of India (1925)

۳۔ Sangeet of India (1942)

۴۔ Iqbal (1947)

عطیہ بیگم نے ہندوستان کی موسیقی کی خصوصیت کو یورپ سے متعارف کرایااور وہ ایشیا کی پہلی عورت ہیں جنھوں نے دنیا کی سب سے پرانی یونی ورسٹی (ساربونی یونی ورسٹی) میں ہندوستانی موسیقی پر لیکچر دیئے اور غیر معمولی شہرت حاصل کی۔[۵۲] ۱۹۲۶ء میں عطیہ فیضی نے آرٹ سرکل کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے نے زندگی اور آرٹ کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں جو خدمات انجام دیں انھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ۱۹۲۶ء میں جب بمبئی آرٹ کی نمائش ہوئی جہاں ریاست حیدرآباد کی مصوری کے اعلی نمونوں کے علاوہ عطیہ فیضی کی مصوری کے

نمونے بھی دکھائے گئے تھے۔اس کے علاوہ ۱۹۳۷ء میں "اکیڈمی آف اسلام" کی بنیاد بھی رکھی۔ عطیہ فیضی کے قائم کردہ ان دو اداروں نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی اور ان اداروں کو برنارڈ شا، کلارابٹ، کیلی کرسی وغیرہ جیسی شخصیتوں کی شرکت کا فخر حاصل ہے۔ [۵۳]

انھوں نے یورپ کے بہت سے شہروں میں مختلف موضوعات پر بھی لیکچر دیے اور جرمنی کے شہر برلن میں انھیں ان کی خدمات کے صلے میں سفیر افغانستان نے "تمغہ امانیہ" عطا کیا۔اس کے علاوہ جب وہ ۱۹۰۸ء میں اپنی بہن نازلی بیگم کے ساتھ یورپ کی سیاحت پر گئیں تو دورہ ترکی میں سلطان عبدالحمید خان نے "تمغہ شفقت نشان" دیا جو صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہے اور انھیں ان کی خدمات کے صلے میں دیا جاتا ہے۔ بقول عطیہ بیگم: ہم دونوں بہنوں کو اوّل اور دوسرے درجوں کے شفقت نشان ملے۔ سب ہیرے، زمرد اور یعقوت (یاقوت) جڑے ہوئے۔ [۵۴] عطیہ فیضی کے بارے میں بیگم برلاس اپنی رائے کا یوں اظہار کرتی ہیں۔

> عطیہ فیضی مشہور و معروف ہستی ہیں اور اس وقت کی بیدار مغز خواتین میں سے ہیں جو مشکل سے انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں۔ یہ وہ نازک وقت تھا جب عورت نے ترقی نہیں کی تھی وہ محض گھر کی چار دیواری میں جہالت کی چادر اوڑھے بقید حیات تھیں۔ موصوفہ نے بڑی ہمت اور حوصلہ سے ان سنگ لاخ چٹانوں کو ہموار کر کے ترقی کے میدان میں دوڑ لگائی اور کامیابی حاصل کی۔ آپ مصنفہ ہیں اور آرٹ و موسیقی آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔ خواتین کی تعلیم کی زبردست حامی، سوشل ورک سے بڑی حد تک دل چسپی رکھتی ہیں۔ سیاحت میں بھی دو قدم آگے رہی ہیں۔ کہتی تھیں دنیا کا کوئی کونہ نہیں چھوڑا ملک در ملک ہر قسم کی معاشرت کا عمیق مطالعہ کیا اور بے تعداد لیکچر بھی دیئے۔ [۵۵]

عطیہ بیگم کی ۵ دسمبر ۱۹۱۲ء میں رحمین سے شادی ہوئی [۵۶] جو ایک مشہور آرٹسٹ تھے۔ان کی مصوری کے شاہکار نمونے نیشنل گیلری کراچی کے علاوہ پیرس، فرانس کی آرٹ گیلری کے لیے حاصل کیے گئے تھے۔ [۵۷] ان دونوں کی پہلی ملاقات ریاست جنجیرہ میں نازلی بیگم کی رہائش گاہ پر ہوئی۔ رحمین وہاں محل کی آرائش و زیبائش کرنے کی غرض سے آتے تھے اور عطیہ بیگم رحمین کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کے فن سے بھی بہت متاثر ہوئیں۔ دونوں کی قربت رفتہ رفتہ بڑھی اور رحمین نے بالآخر رشتہ بھیجا جو کہ قبول کر لیا گیا۔ شادی کے بعد رحمین فیضی نے زندگی کے

ہر موڑ پر عطیہ فیضی کا ساتھ دیا اور وہ سماجی کاموں میں بھرپور طریقے سے حصّہ لینے لگیں۔ ضیاالدین برنی ان دونوں کے تعلقات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ان کے (رحمین) تعلقات اپنی بیوی عطیہ بیگم کے ساتھ انتہائی محبت کے اور شریفانہ تھے۔ وہ گھر میں عورت کی بالادستی کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ سکون کی زندگی اسی طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ عورت مرد سے افضل ہے اس لیے کہ اس کے بغیر آدم کی زندگی نامکمل تھی۔ [۵۸]

عطیہ بیگم پہلی مرتبہ ۱۹۰۶ء میں انگلستان گئیں اور وہ یورپ جا کر تعلیم حاصل کرنے والی پہلی مسلمان خاتون تھیں۔ انھیں انگریز حکومت نے وظیفہ دے کر یورپ کے سفر پر روانہ کیا اور اس سفر کی روداد کو عطیہ بیگم نے اپنی خود نوشت زمانہ تحصیل میں بیان کیا۔ اس سفر کے علاوہ انھوں نے اپنی بڑی بہن نازلی بیگم کے ہمراہ ۱۹۰۸ء میں یورپ کا سفر کیا۔ یہ سفر بھی بڑا خوشگوار تھا۔ اس سیاحت میں انھوں نے مختلف لوگوں سے ملاقاتیں بھی کیں۔ اس سفر کی روداد کو ان کی سب سے بڑی بہن زہرا بیگم فیضی نے سیرِ یورپ کے نام سے شائع کیا۔

عطیہ فیضی کو لڑکیوں کی تعلیم سے خصوصی دل چسپی تھی اور وہ انگریزی طرز کی تعلیم اور تعلیمی ادارے قائم کرنا چاہتی تھی جس میں اسلامی تعلیم کا بھی خیال رکھا جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ۱۹۲۸ء میں بمبئی میں مسلمان لڑکیوں کے لیے ایک پرائمری ماڈل سکول قائم کیا جس میں اردو، قرآن مجید اور انگریزی کو لازمی مضمون کے طور پر متعارف کروایا۔ جس کے نتائج سے متاثر ہو کر انھوں نے ایسے سکولوں کی مزید شاخیں قائم کرنا چاہیں۔ عطیہ فیضی نے انجمنِ نسواں کی بنیاد بھی ڈالی جس کے مقاصد میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ہندوستان کے ہر شہر اور قصبہ میں لڑکیوں کے سکول قائم کیے جائیں۔ [۵۹] عطیہ فیضی جس کام میں ہاتھ ڈالتی اس کو کامیاب بنا کر چھوڑتی تھیں۔ وہ اپنی پوری زندگی میں مصروف کار نظر آتی ہیں۔ کبھی وہ عورتوں کی تعلیم کی اسکیموں کی جانب متوجہ ہوئیں، کبھی موسیقی کو پھیلانے کے لیے کوشاں رہیں، کبھی وہ باغبانی کی اہمیت پر تقریریں کر رہی ہیں تو کبھی سیاست ان کا پسندیدہ موضوع بنتی ہے۔ وہ ایک دلیر اور بے باک خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنی جوانی بڑے شاہانہ انداز میں بسر کی اور قیامِ پاکستان کے بعد کراچی آ گئیں۔ آخری عمر میں حالات اور بیماری نے تنگ دست کر دیا اور اسی حالت میں ۴ جنوری ۱۹۶۷ء کو کراچی میں وفات پائی۔

۶۔ بیگم صغرا ہمایوں

جن خواتین نے ہندوستان میں تعلیم نسواں کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیاان میں صغرا ہمایوں کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف تعلیم نسواں کی حامی تھیں بلکہ حقوق نسواں اور آزادی نسواں کے لیے بھی انھوں نے آواز بلند کی۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے عورتوں کی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کے لیے بہت سی کوششیں کیں۔ وہ تحریک نسواں کی سرگرم رکن تھی۔ انھوں نے ہندوستانی خواتین کو بیدار کرنے اور ان کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ اسی بنا پر شاد عظیم آبادی نے اپنے بعض مکتوبات میں انھیں ''سرتاج خاتون ہند'' کہا ہے۔ [۶۰]

صغرا ہمایوں کا اصل نام صغرا [۶۱] اور تخلص حیا [۶۲] تھا۔ وہ ۱۸۸۴ء میں صفدر علی مرزا کے ہاں پیدا ہوئیں۔ [۶۳] ان کا تعلق حیدر آباد کے ایک اعلیٰ خاندان سے تھا ان کے دادا ترکی النسل تھے جو آصف جاہ ثانی کے عہد میں حیدر آباد آکر سکونت پذیر ہو گئے تھے اور وہاں انھوں نے شمشیر سازی کا ایک کارخانہ بھی قائم کیا تھا۔ [۶۴] صغرا ہمایوں ایک کھاتے پیتے اور تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئی اس گھرانے کا مغل دورِ حکومت میں ایک خاص مقام و مرتبہ تھا۔ اس خاندان میں تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ صغرا ہمایوں کے والد صفدر علی مرزا بھی حیدر آباد کے ایک مشہور و معروف ڈاکٹر تھے۔ [۶۵] وہ ایک ماہر طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سی تصانیف کے مصنف تھے جن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

شہزادہ یوسف و حکیم بلوہر

یہ کتاب فلسفہ پر مشتمل ہے اور یہ فلسفہ الہیات و حکمت کا خزانہ ہے۔

نعمت عشق

یہ نثری رسالہ تصوف و عرفان پر ہے۔

رسالہ علاج ہیضہ اور رسالہ حفظانِ صحت

یہ دونوں کتابیں طب پر مشتمل ہیں۔

بیگم صغرا جس زمانے میں پیدا ہوئیں اس وقت ہندوستانی عورتیں گھر کی چار دیواری تک محدود تھیں اور انھیں رسمی تعلیم حاصل کرنے کی آزادی نہ تھی۔ ہندو گھرانوں میں لڑکیوں کو مدرسوں میں بھیجنے کا رواج تھا مگر مسلمان گھرانوں میں عورتوں کی تعلیم صرف گھر پر ہی قرآن اور فارسی کی چند کتب تک تھی۔ باقاعدہ مشنری سکولوں میں جانے کی ممانعت تھی۔ ان کی تعلیم اور آزادی پر ہندوستانی تہذیب و معاشرت نے پہرے لگائے ہوئے تھے اور مسلمان گھرانوں میں عورتوں کی تعلیم کی سختی سے ممانعت تھی۔ لڑکیوں کے لیے صرف سلائی و کڑھائی کو کافی سمجھتے ہوئے ان کے لیے سکولوں کا انتظام نہ تھا اور شرفا اپنی بیٹیوں کو سکولوں میں بھیجنا بے حیائی تصور کرتے تھے۔ ایسے حالات میں صغرا ہمایوں کی تعلیم و تربیت گھر پر ہی ہونے لگی ان کے لیے گھر پر ہی استاد کا انتظام کر دیا گیا۔ صغرا ہمایوں چونکہ بچپن سے ہی بڑی چست و چالاک اور پڑھنے کی شوقین تھی انھوں نے تعلیمی سلسلہ کو بڑے ذوق و شوق سے جاری رکھا اور اپنے علم میں برابر اضافہ کرتی رہیں۔ ان کی شادی پٹنہ کے ایک معزز نواب گھرانے میں ہوئی۔[۲۶] ان کے شوہر سیّد ہمایوں مرزا پیشہ کے لحاظ سے بیرسٹر تھے۔ مرزا ہمایوں خود بھی صاحب ذوق تھے اور ادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے انہوں نے بہت سی تصانیف تخلیق کیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

کرشمہ و تقدیر

یہ کتاب تین سو صفحات پر مشتمل ہے اور دہریہ اس کے مطالعہ سے واجب الوجود کا قائل ہو جاتا ہے۔

آثار صنادید دکن

قدیم عمارات کے تاریخی حالات دلچسپ پیرائے میں بیان کیے ہیں۔

مختصر تاریخ جاپان

اس میں جاپان کے تاریخی احوال کے ساتھ ساتھ جغرافیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

حالات ابن رشد

اس کتاب میں ابن رشد کے حالاتِ زندگی بیان کیے ہیں۔

(مذکورہ بالا تصانیف کی تفصیل صغرا ہمایوں کے سفر نامے کے آخری صفحات سے لی گئی ہیں)[۲۷]

سیّد ہمایوں مرزا اپنے عہد کی بہت بڑی شخصیت تھے۔ ان کا پیشہ تو قانون تھا مگر وہ علمی و ادبی سرگرمیوں میں خود بھی سرگرم تھے اور بیگم صغرا کا بھی ان کے علمی و ادبی کاموں میں ساتھ دیتے تھے۔ وہ خود بھی سیاحت کے شوقین تھے اور بیگم صغرا کے ساتھ بہت سے ملکوں کی سیر کی۔ اس سیاحت کے دوران صغرا ہمایوں نے دوسرے ملکوں کی

تہذیب و معاشرت، سیاست، ثقافت اور تعلیم نسواں کا بغور مشاہدہ کیا اور انھوں نے اس بات کا شدت سے احساس کیا کہ ہندوستانی عورت زندگی کے میدان میں باقی قوموں سے بہت پیچھے ہیں۔ وہ عورتوں کی فلاح اور انھیں ان کے حقوق کا احساس دلانے کے لیے تعلیم نسواں اور انجمن خواتین دکن کی روح رواں بنی۔ انھوں نے بہت سی تحریکوں میں شمولیت بھی اختیار کی۔ عورتوں کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے کئی جگہوں پر سکول قائم کیے۔ نصیر الدین ہاشمی صغرا کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں۔

> صغرا ہمایوں کا سب سے بڑا کارنامہ ہندوستان کی مسلمان عورتوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کرنا اور انھیں اپنے حقوق کے لیے منظم کرنا، اس مقصد کے لیے انھوں نے نہ صرف ایک تحریک شروع کی بلکہ ان تمام تحریکوں کی حمایت بھی کی جو اس مقصد کے لیے چلائی جارہی تھیں۔ انھوں نے ہمایوں نگر میں ایک زنانہ اسکول قائم کیا۔ [۶۸]

بیگم صغرا ہمایوں درد مند دل رکھنے والی ایک سماجی کارکن تھی انھوں نے ساری زندگی حقوق نسواں کی جنگ لڑی۔ انھیں مسلم خواتین کی ترقی اور بہبود سے بڑی دلچسپی تھی۔ انھوں نے پورے ہندوستان کی خواتین کو بیدار کرنے کے لیے بہت سے مضامین لکھے اور بہت سے رسائل کی ایڈیٹر رہیں۔ صغرا کی سرپرستی میں لاہور سے مجلہ ''تہذیب النسواں'' کا اجرا ۱۸۹۸ء میں ہوا تھا۔ آزادی نسواں، تعلیم نسواں کی حامی خاتون تھی۔ [۶۹]

انھوں نے عورتوں کی زبوں حالی کو دور کرنے اور انھیں تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کی کوششیں کیں۔ ان کا خیال تھا کہ عورتوں اور مردوں کے درمیان کچھ زیادہ فرق نہیں لیکن بدقسمتی سے ہمارے معاشرے نے عورتوں کو جاہل اور مجبور بنا رکھا ہے۔ اگر عورت کو بہتر تعلیم و تربیت دی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بھی مردوں کی طرح زندگی کے ہر میدان میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ نہ کر سکیں۔ انھوں نے مسلمان عورتوں میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی اس مقصد کے لیے انھوں نے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ انھوں نے بہت سے سفرنامے، ناول اور مضامین شائع کیے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ مقالاتِ صغرا بھی شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور ایک عرصہ تک حیدر آباد سے رسالہ النساء کی ادارت سنبھالی اور زیب النساء (لاہور) کی بھی آپ ایڈیٹر رہیں۔ [۷۰] بیگم ہمایوں اپنے عہد کی ایک مشہور مصنفہ، سماجی اور تعلیمی تحریک کی

سر گرم رکن تھیں انھوں نے تعلیم نسواں کی ترقی میں نہ صرف عملی اقدام کیے بلکہ خواتین میں شعور بیدار کرنے کے لیے کثرت سے مضامین بھی لکھے جن کی تفصیل کچھ یوں ہیں۔

خوشی، خوشامد، بی بی کا خط، سنگھار، کشمیر کی سلک فیکٹری، خط وکتابت، ٹیکسلا اور اس کا نواح، حور کی نظر، دستر خواں پر، ایرانی مہمان داری، پرانے کاغذوں کی دیکھ بھال، ہمایوں نگر کا حجام، مرد کے فرائض، گردہ کی پتھری کا علاج، میاں بیوی کے خطوط، ایک نیک بی بی کی وفات، کفایت شعاری، بننا بگڑنا، بسم اللہ کی رسم، لندن کا طریقہ خیرات، عورت اور اسلام، یوگنڈہایم، لندن کا چڑیاگھر، بیت المعذورین جرمنی، زبان اردو، گورستان لندن، جرمنی کا ورزش خانہ، سوچ، تیر کے شکار پر انعام، قطب شاہی عمارات،، آپ امیر ہیں میں غریب، بی بی کا خط، دشمنی، میر اسنگ مزار، مصیبت زدگان، خواتین ہند کا کلام، جرمنی میں شادی۔ (یہ تمام مضامین بالا تہذیب نسواں اور عصمت سے لیے گئے ہیں)[۴۱]

صغرا بیگم نے اپنی ان تمام تحریروں کے ذریعے عورتوں کی تعلیمی و معاشرتی اصلاح کی کوشش کی۔ ایک طرف تو انھیں تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی تو دوسری طرف اپنے مضامین اور تقاریر کے ذریعے ان کے اندر پیوستہ سماجی و معاشرتی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے ہندوستانی مسلمان عورتوں کو یہ باور کرایا کہ تعلیم ہی وہ واحد حربہ ہے جس سے انسان تمام برائیوں کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ اسلام میں تعلیم کی اہمیت سے آگاہ کیا اور سمجھانے کی کوشش کی کہ تعلیم کسی مخصوص طبقہ اور مخصوص جنس کے لیے نہیں ہے بلکہ سب کے لیے یکساں ہے، عورتوں کو اس کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ عورت نسلوں کو پروان چڑھاتی ہے۔ بیگم صغرا ہمایوں کی خدمات کے متعلق طیبہ خسرو کہتی ہیں کہ صغرا بیگم کی اولوالعزمی اور عورتوں کے مسائل سے گہری دلچسپی اور لگاؤ نے لاکھوں پردہ نشین خواتین کے اندھیرے راستے میں اُجالے پیدا کر دیئے۔ ان میں عام بیداری پیدا کر دی کہ وہ خود اپنی منزل پہچان سکیں۔[۴۲]

صغرا ہمایوں نے ہندوستانی معاشرے کے فرسودہ رسم و رواج کے خلاف قلمی اور عملی جہاد کیا۔ انھوں نے مسلمان عورتوں کو تعلیم کی اہمیت سے روشناس کرانے کے لیے بہت سی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ناول اور سفر نامہ نگاری میں بھی ان کا ایک خاص مقام و مرتبہ ہے۔ انھیں سیر و سیاحت کا بے حد شوق تھا اور واپسی پر انھوں نے بہت سے سفر نامے تخلیق کیے مثلاً سفرنامہ یورپ، سفرنامہ عراق، سفرنامہ پونا و مدراس ، سیر بہار و بنگالہ ،روزنامچہ سفربھوپال، آگرہ ،دہلی ،کے حالات ، ہمارا کاٹھیاوار کا سفر ، سیاحت جنوبی ہند، سفرنامہ مدراس و والیٹر اور رہبر کشمیر وغیرہ۔

یہ تمام سفر نامے بیگم صغرا کے اسفار کی یادگار ہیں،ان سفر ناموں میں حقوق نسواں کے لیے کوشاں نظر آتی ہیں۔سفر ہند انھوں نے مختلف کانفرنسوں میں شرکت کے لیے اختیار کیے کیونکہ وہ انجمنِ خواتین دکن کی سر گرم رکن تھیں۔ان مقامی سفر ناموں میں انھوں نے ہند کی تہذیب و معاشرت،تاریخ،اور جغرافیہ کو بڑے سہل انداز میں بیان کیاہے۔بیگم صغرا کو چونکہ سیاحت سے بے حد دلچسپی تھی اور یہ شوق انھیں یورپ کی سیاحت پر لے گیا۔اس سفر سے واپسی پر انھوں نےسفر نامہِ یورپ شائع کیا۔یہ سفر نامہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اس میں انھوں نے ہالینڈ، جرمنی،اٹلی،فرانس اور لندن کااحوال بڑی تفصیل کے ساتھ قلم بند کیا۔اس سفر نامے میں وہ مغربی چکاچوند سے متاثر نظر آتی ہیں۔ان سفر ناموں کے علاوہ ان کی حسب ذیل تصانیف ہیں۔

مشیر نسواں

اسم با مسمیٰ، علم وہنر کا خزانہ ہے۔اس ناول پر انھیں طلائی تمغہ عطاہوااور یہ ناول ہندوستانی معاشرت کو اجاگر کرنے میں اہمیت کا حامل ہے۔

سرگزشت ہاجرہ

یہ خواتین کے لیے لکھا گیا اصلاحی ناول ہے۔اس میں انھوں نے عورتوں کی تعلیم و تربیت اور ازواجی زندگی کے کامیابی کے اصولوں کو بیان کیاہے۔بیگم صغرا نے اپنے تمام ناول اصلاحی مقصد کے تحت لکھے۔وہ اپنے ناولوں میں عورتوں کے گھریلو مسائل آشکار کر کے ان کا حل بھی بتاتی ہیں۔

موہنی

اس ناول میں ایرانی تہذیب و معاشرت میں مافوق الفطرت عناصر کو شامل کر کے بیان کیا گیا ہے اس پر داستانوی رنگ غالب ہے۔

تحریر النساء

صغرا ہمایوں کی یہ تصنیف انشائیہ نگاری وانشاپردازی پر مبنی ہے۔یہ اس فن پر سب سے پہلی تصنیف ہے۔

سفینہ نجات

یہ تصنیف نوحہ جات پر مشتمل ہے۔

مجموعہ نصائح

آوازِ غیب۔ گلشن ترنم۔ نصیحت کے موتی۔ بی بی طوری کا خواب۔

سالانہ رپورٹ انجمن خواتین دکن

یہ کتاب انجمن کے عملی کارناموں اور بیگمات کی تقریروں پر مشتمل ہے۔

(مذکورہ بالا تمام تصانیف کی تفصیل صغرا ہمایوں کے سفر نامہ یورپ کے آخری صفحات سے لی گئی ہیں) [۳۲]

صغرا ہمایوں نہ صرف اپنے عہد کی ایک ممتاز سفر نامہ نگار اور ناول نگار تھی بلکہ خدا نے انھیں بے شمار صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ ایک وقت میں صحافی، مضمون نگار، اچھی مقرر، سماجی کارکن، ناول نگار، سفر نامہ نگار اور شاعرہ بھی تھیں۔ انھوں نے الگ الگ اصناف میں طبع آزمائی کی اور اپنے آپ کو منوایا۔ وہ بڑی عمدہ شاعری کرتی تھیں۔ مختلف رسائل میں ان کی غزلیں اور نظمیں شائع ہوتی رہی ہیں اور وہ حیا تخلص کرتی تھیں۔ ان کی مختلف اصناف میں مہارت کے بارے میں نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ صغرا ہمایوں کی شخصیت بڑی پرکشش تھی۔ انھیں بیک وقت کئی ادب میں دخل تھا انھوں نے ناول اور افسانے لکھے، سوانح اور سفر نامے مرتب کیے، مضامین لکھے اور شاعری بھی کی۔ ڈاکٹر علامہ اقبال نے ان کی ایک نظم پر اصلاح دی تھی۔ [۳۳]

صغرا ہمایوں نے غزلوں، نظموں، رباعی کے علاوہ نوحے بھی لکھے۔ ان کے نوحہ جات کی تصنیف ''سفینہ نجات'' ہے۔ یہاں بطور نمونہ ان کی ایک فارسی غزل پیش کی جاتی ہے، یہ اُن کی پہلی فارسی غزل ہے اس سے پہلے انھوں نے کبھی کچھ فارسی میں نہیں لکھا۔ وہ اپنی اس غزل کے بارے میں تہذیب النسواں کے ۷ اگست ۱۹۴۳ء کے شمارہ میں لکھتی ہیں:

'میں قندیل کے بیٹھ کر فارسی میں اشعار لکھنا چاہ رہی ہے اور بآواز بلند پڑھتی بھی جاتی ہے۔ بیرسٹر صاحب یہ اشعار سن کر مجھے کہتے ''کیوں کفر کہہ رہی ہو ایسے اشعار نہ لکھو'' میں کہتی، ''تھوڑی دیر مجھے

کہہ لینے دو"، مگر وہ مجھے منع کرتے ہی گئے۔ لیکن میرا قلم نہیں رکا۔ تھوڑے سے اشعار جو لکھے وہ پیش کرتی ہوں۔ یہ مری پہلی فارسی غزل ہے۔ میں نے اس سے قبل فارسی میں کبھی کچھ نہیں لکھا۔[۴۵]

یہاں یہ طویل اقتباس دینے کا مطلب یہ ہے کہ میری مندرجہ بالا بات کی شہادت اُن کے اپنے قول سے ثابت ہو جائے۔ صغرا ہمایوں کی فارسی غزل ملاحظہ کریں۔

گہے باراں گہے گرما گہے باد صبا ہستم
گہے سجدہ گہے کعبہ گہے بدر الدجیٰ ہستم
گہے تیرہ گہے روشن گہے آتش فشاں ہستم
گہے زندہ گہے مردہ گہے خاک شفا ہستم
منم ساقی۔ منم ساغر۔ منم بادہ۔ منم آدم
منم گریاں ۔ متم خداں و من باد فنا ہستم
منم خاکی۔ منم بادی۔ منم آبی۔ منم خارا
منم قائم منم دائمن من اسرار بقا ہستم
منم رحمت۔ منم زحمت۔ منم جادو منم افسوں
منم دوزخ۔ منم جنت۔ منم ارض و سما ہستم
زمیں دارم زماں دارم فلک دارم ملک ارم
نہ من دانم کہ کے ہستم کجا بودم کجا ہستم
حیاؔ گر تو بقا خواہی بیا آنجا کہ من گویم
گہے یاد خدا باشی کہ من یاد خدا ہستم[۴۶]

ترجمہ:

کبھی بارش، کبھی گرمی، کبھی صبح کی ہوا ہوں
کبھی سجدہ، کبھی کعبہ، کبھی چمکتا ہوا چاند ہوں

کبھی تاریکی، کبھی روشنی، کبھی آتش فشاں ہوں
کبھی زندہ ، کبھی مردہ، کبھی شفاکی مٹی ہوں
میں ساقی ،میں ساگر ، میں شراب ،میں آدم ہوں
میں روتی، میں ہستی، میں فنا ہونے والی ہوا ہوں
میں مٹی ہوں ،میں صحراہوں، میں پانی ہوں ، میں کانٹا ہوں
میں قائم ہوں ،میں ہمیشہ ہوں، میں زندگی کا راز ہوں
میں رحمت ہوں ، میں زحمت ہوں، میں جادو ہوں،میں منتر ہوں
میں دوزخ ہوں ،میں جنت ہوں، میں زمین و آسماں ہوں
زمیں ، زمانہ ،آسمان رکھتی ہوں، سلطنت رکھتی ہوں
میں نہیں جانتی میں کون ہوں، کہاں تھی، کہاں ہوں
حیاؔ اگرتم بقاء چاہتی ہو،یہاں آؤ،تاکہ میں بولو
کبھی خدا کو یاد کرو،کہ میں خدا کی یاد ہوں

بیگم صغرانے جس طرح اصناف نثر کی مختلف صنف میں اپنی خداداد صلاحیتوں کو منوایااسی طرح شعری اصناف میں بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔انھوں نے نہ صرف غزل اور نوحے لکھے بلکہ رباعی جیسے مشکل میدان میں بھی قدم رکھا۔رباعی شعری اصناف میں سے ایک مشکل میدان ہے اس میں بہت کم لوگ کامیابی سے پاراترنے میں کامیاب ہوتے ہیں مگر صغراہمایوں اردوادب کاایک ایسادرخشاں ستارہ ہے جو ہر افق پر خوبصورتی سے چمکاہے۔ان کی یہ چکاچوندرباعی کے میدان میں بھی نظر آتی ہے بطور نمونہ رباعی پیش کی جاتی ہے۔

رباعی

خیمہ زد ابر بہاراں درمیان کوہسار
غنچہ خنداں۔ لالہ حیراں بام ودرچوں سبزہ زار
برکنارے رود کوخر دیدنی است اے حیا

جام گلگوں۔ ساقی گلرو ۔ شب ماہ لالہ زار[۷۷]

ترجمہ :

ابر بہار نے پہاڑوں پہ ڈیرہ ڈال لیا
غنچے مسکرانے لگے لالہ حیران اور بام ودر سبزہ زار ہو گئے
اے حیا رود کوثر کے کنارے قابل دید ہے
گل رنگ پیالہ ، گلرو ساقی اور چاندنی رات

(اردو ترجمہ۔ بشکریہ ڈاکٹر جواد ہمدانی صاحب)

بیگم صغرا ہمایوں غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک تھیں۔ انھوں نے ادب و صحافت ، شاعری اور سیاست و معاشرت کے میدانوں میں شاندار کارنامے انجام دیئے۔ متعدد سفر ناموں کے علاوہ ناول اور سینکڑوں مضامین بھی لکھے۔ انھوں نے چھوٹی عمر میں لکھنا شروع کیا اور تادمِ آخر ان کا قلم رواں رہا۔ اس زمانے کا شاید ہی کوئی ایسا رسالہ ہو گا جس میں ان کی تحریر شائع نہ ہوئی ہو اور بیداریِ نسواں کا کوئی ایسا پلیٹ فارم نہیں یہاں اُن کی آواز کی گونج نہ ہو۔ وہ ساری زندگی حریت نسواں کے لیے کوشاں رہیں۔

۷۔ بیگم حسرت موہانی (سیّدہ نشاط النساء)

بیگم حسرت موہانی ۱۸۸۵ء کو بھارت کے صوبہ اترپردیش کے ایک ضلع اناؤ کے قصبہ موہان میں پیدا ہوئیں۔[۷۸] ان کی پیدائش کے بارے میں مولانا حسرت کی صاحبزادی نعیمہ بیگم لکھتی ہیں کہ تاریخ پیدائش شاید ان کو (مولانا کو) خود بھی معلوم نہ تھی لیکن اس سلسلے میں اگر کبھی والدہ ماجدہ اپناذکر کرنے لگتیں تو مولانا ان سے فرمایا کرتے تھے کہ تم اپناذکر نہ کرو۔ تم چودھویں صدی کی ہو اور میں تیرھویں صدی کا۔[۷۹]

ان کے والد سید شبیر حسین موہانی جو کہ ریاست حیدر آباد کے ایک شہر رانچور میں منتقل ہوگئے تھے اور وہاں

وکالت کرنے لگے مگر ان کا موہان سے تعلق ہمیشہ قائم رہا کیونکہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اپنے بزرگوں کے زیرِ سایہ چاہتے تھے اور وہ موہان آتے رہتے تھے۔ اس طرح بیگم حسرت کے بچپن کا بڑا حصہ وہیں گزرا۔

بیگم حسرت کا اصل نام سیدہ نشاط النساء بیگم تھا اور ان کا تعلق سادات گھرانے سے تھا۔ وہ سید شاہ وجیہہ الدین کی پانچویں پشت میں سے تھیں۔ [۸۰] سید شاہ وجیہہ الدین کا سلسلہ نسب حضرت امام موسیٰ سے ملتا ہے۔ اس طرح یہ خاندان علم و فضل میں برکت رکھتا تھا۔

بیگم نشاط النساء کی والدہ سیدہ منصور النساء مولانا حسرت کی پھوپھی تھیں اور اسی طرح والدہ حسرت سیدہ شہر بانو نشاط النساء کی پھوپھی تھیں۔ قریبی رشتہ داریاں ہونے کی وجہ سے خاندان میں ہی باہم شادی کرنے کا رواج تھا۔ نشاط النساء کا چونکہ بچپن قصبہ موہان میں ہی گذرا جو کہ مولانا حسرت کا ننھیال اور نشاط بیگم کا ددھیال تھا۔ یہ خاندان مذہب کا سختی سے پابند تھا اور بچوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دیتا تھا۔ بیگم نشاط کی تربیت ان کی دادی کے زیرِ سایہ ہوئی جو کہ خود بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ تھیں۔ وہ نہایت وسیع القلب اور وسیع النظر تھیں۔ ان کا معمول تھا کہ وہ خاندان کے ہر فرد پر نظر رکھتیں بلکہ اہلِ قصبہ کی فلاح و بہبود کو بھی عزیز رکھتی تھیں۔ نشاط بیگم نے تعلیم کے معاملے میں اپنی دادی کے رجحان کو اپنایا اور ان کی زندگی کے مقصد کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا اور ۱۹۲۴ء میں اس قصبے میں ایک ہائی سکول بھی قائم ہو گیا تھا۔ [۸۱] نشاط بیگم کے والد سید شبیر حسین تعلیم یافتہ اور روشن خیال انسان تھے۔ انھوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر مکمل توجہ دی اور اس سلسلے میں بیٹی اور بیٹوں میں کوئی تخصیص نہیں رکھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لڑکیوں کی تعلیم کا رواج نہ تھا صرف قرآن، فارسی کی چند کتب اور دینی تعلیم کو کافی سمجھا جاتا تھا مگر سید شبیر حسین نے اپنی بیٹی کے لیے اردو، فارسی اور عربی کی ممکنہ تعلیم فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ رسمی تعلیم پر بھی وجہ دی۔ نشاط بیگم نے چھوٹی سی عمر سے باقاعدہ تعلیم کا آغاز کیا اور وہ صوم و صلوۃ کی پابند تھیں۔ پرنسپل عبدالشکور ان کی تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں:

> چونکہ سادات موہان میں علم و کمال کا چرچا شروع سے ہی تھا۔ اس لیے محترمہ نشاط النساء بیگم اودھ کی عام لڑکیوں کی طرح زیور علم سے محروم نہ رہیں۔ آپ کو مذہبی تعلیم کے علاوہ اردو، فارسی اور عربی زبانوں کی معقول تعلیم دلائی گئی۔ زمانہ دوشیزگی میں آپ کا مشغلہ یہ تھا کہ پس ماندہ قصبہ کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتی تھیں اور اگر آج موہانی میں تعلیم نسواں کی جھلک نظر آتی ہے تو محترمہ نشاط النساء کی کوشش اور مالی ایثار کا ثمرہ ہے۔ [۸۲]

نشاط بیگم جو کہ چار دیواری میں پلی بڑھیں تھیں مگر انھوں نے فکر و شعور کا سفر کم عمری میں ہی طے کر لیا۔ انھیں نہ صرف اپنی تعلیم بلکہ قصبے کی دوسری لڑکیوں کی تعلیم اور ترقی کی فکر تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ دینی فرائض میں بھی غفلت نہ کی۔ انھوں نے اپنے خاندان کے دیگر افراد کی مانند چھوٹی سی عمر میں حضرت شاہ عبدالوہاب کے ہاتھ بیعت کی اور ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئیں۔ ان سے عقیدت کا یہ رشتہ زندگی بھر قائم رکھا۔

سیدہ نشاط النساء کے خاندان میں ایک تو کم عمری اور دوسرا خاندان میں ہی شادی کرنے کا رواج تھا۔ مولانا حسرت اور نشاط بیگم کا بچپن اکھٹے گذرا اسی وجہ سے وہ نہ صرف ایک دوسرے کے مزاج شناس تھے بلکہ پسندیدگی کا عنصر بھی پایا جاتا تھا۔ خاندان کے بزرگوں کے فیصلے کے مطابق ان کی شادی ۱۸۹۸ء میں ہوئی۔ [۸۳] اس وقت نشاط النساء کی عمر تقریباً ۱۵ سال اور مولانا حسرت ۱۹ سال کے تھے اور علی گڑھ کالج کے طالب علم تھے۔ شادی کے بعد ۱۹۰۳ء میں مولانا حسرت اپنے ساتھ علی گڑھ لے گئے۔ اسی سال مولانا نے سیاست اور صحافت میں حصہ لیا اور نشاط بیگم اپنی زندگی کے آخری سانس تک اپنے شوہر کی رفیق اور غمخوار رہیں۔ وہ آزادی کی جدوجہد اور مزدوروں کے حقوق کے لیے مولانا حسرت کے ساتھ مل کر لڑتی رہیں۔ مولانا حسرت کی شخصیت کو مکمل کرنے میں بیگم نشاط کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ بیگم حسرت کی وفا شعاری کے متعلق ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> سیدہ نشاط النشاء نے ایک باوفا بیوی ہونے کا پورا ثبوت اس طرح دیا کہ ہر موقعہ اور ہر جگہ اپنے شوہر کے ساتھ شریک کار رہیں خواہ علمی زندگی ہو یا ادبی یا سیاسی سرگرمیاں ہاتھ بٹاتی رہیں۔ [۸۴]

بیگم حسرت اور مولانا حسرت کا اڑتالیس سال کا ساتھ تھا۔ انھوں نے عملی اور قلمی میدان میں ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ مولانا نے جب عہد کیا کہ وہ ہمیشہ دیسی چیزیں استعمال کریں گے تو بیگم حسرت نے اس معاملہ میں بھی ان کا ساتھ دیا۔ وہ اپنے ہاتھ کے بنے سوت کے کپڑے پہنتی رہیں۔ انھوں نے چہرے کا پردہ کبھی نہیں کیا مگر اپنا سر اور جسم ہمیشہ ڈھانپ کر رکھا۔ مولانا حسرت نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ قید و بند میں گزارا۔ وہ جب جیل جاتے تو ان کی غیر موجودگی میں رسالے، کتابوں، پریس اور سٹور کا کام وہ خود سنبھالتی تھیں۔ کئی دفعہ ان کے گھر کے حالات اس قدر خراب ہوئے کہ وہ اجرت پر لوگوں کے کپڑے سی کر اور کاغذ کے لفافے بنا کر روزی کماتیں مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتیں اور اگر کسی نے ان کی مدد کرنا چاہی تو انھوں اس پیش کش کو بڑے پیار سے ٹھکرا دیا۔ نشاط النساء بیگم کے یہاں ۱۷ فروری ۱۹۰۷ء میں ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام انھوں نے نعیمہ بیگم رکھا۔ نعیمہ ابھی ایک برس کی تھی کہ مولانا کے

رسالے اردوئے معلیٰ میں برطانوی پالیسی کے خلاف کسی طالب علم کا مضمون چھپا جس کے جرم میں مولانا کو پہلی بار دو سال کی سزا ہوئی مگر ان حالات میں بیگم حسرت نے چھوٹی سی بچی کی ذمہ داری کے ساتھ اس مقدمے کی بھی پیروی کی۔

بیگم حسرت صرف قید میں ہی مولانا کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی تھیں بلکہ سیاست کے میدان میں بھی مولانا کے قدم بہ قدم ہم سفر رہیں۔ مولانا حسرت نے جس طرح کی کٹھن زندگی گذاری اور جس طرح کی مشکلیں جیل میں برداشت کیں وہ اپنی جگہ مسلم ہیں مگر اس سے زیادہ مشکلات حالات سے نبرد آزما بیگم حسرت ہوتی رہی ہیں۔ اگر حالات، وقت اور قدیم پسماندہ ہندوستان میں ایک معمولی تعلیم یافتہ عورت کی جدوجہد اور مصائب سے بھری زندگی دیکھی جائے تو بیگم حسرت اپنے صبر وہمت، بے مثال جان نثاری اور وفاشعاری میں مولانا سے بہت آگے ہیں۔

بیگم حسرت کے لیے جس طرح سے ان کی اکلوتی بیٹی نعیمہ بیگم کی پیدائش ایک آزمائش تھی اسی طرح ان کی شادی بھی انھی حالات میں انجام پائی۔ اپریل ۱۹۲۲ء میں ہندوستان میں تحریک عدم تعاون چل رہی تھی۔ ادھر گھر میں شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ ادھر پولیس نے مولانا سودیسی سٹور پر چھاپا مارا اور انھیں گرفتار کر لیا مگر بیگم نشاط نے مولانا کی ہدایت کے مطابق شادی کی تاریخ میں کوئی ردوبدل نہ کیا۔[۵۵] بیگم نشاط ایک پختہ عقیدہ مسلمان خاتون تھیں۔ آپ حضرت شاہ عبدالوہاب فرنگی کی مرید تھیں اور حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی سے بھی بے حد عقیدت رکھتی تھیں۔ ان کی طبیعت ۱۹۲۵ء میں خراب رہنا شروع ہو گئی اور ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک انھوں نے مولانا کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کی۔ آخری حج کے سفر کے دوران اپنی بیٹی نعیمہ کو اپنے سفری واقعات ومشاہدات خطوط کی صورت میں روانہ کرتی رہیں۔ جو بعد میں سفر نامہ عراق کے نام سے شائع ہوا۔ اس سفر حج کے بعد ان کو ریڑھ کی ہڈی کا کینسر ہو گیا جو جان لیوا ثابت ہوا اور انھوں نے ۱۸ اپریل ۱۹۳۷ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔

۸۔ شاہ بانو بیگم (میمونہ سلطان)

آپ کا اصل نام میمونہ سلطان اور سسرالی خطاب شاہ بانو بیگم ہے۔ آپ کا تعلق افغانستان کے قبیلے شہزادہ خیل سے تھا۔ آپ والئ کابل کے خاندان میں سے ایک شخص شہزادہ جہانگیر کی پوتی اور شہزادہ ہمایوں کی بیٹی تھیں۔[۵۶] میمونہ سلطان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں معلومات دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اس کی پیدائش کا اندازہ اُن کے

عقد کے سال سے لگائیں تو میمونہ سلطان کی عمر تب نو سال اور نواب حمید سلطان گیارہ سال کے تھے۔ ان کے عقد کے متعلق ڈاکٹر رضیہ حامد لکھتی ہیں:

> نواب سلطان جہاں بیگم نے حمید اللہ کا کم سنی میں عقد کر دیا تھا۔ افغانستان کے شہزادہ خیل کے ہمایوں جہانگیر کی بیٹی میمونہ سلطان سے، جن کی عمر عقد کے وقت نو سال اور حمید اللہ کی عمر گیارہ سال تھی۔[۸۷]

اس سے قیاس ہوتا ہے کہ میمونہ سلطان کی پیدائش تقریباً ۱۸۹۶ء کو پشاور میں ہوئی۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی خواہش تھی کہ اپنے چھوٹے بیٹے حمید اللہ کے لیے ایک ایسی دلہن کا انتخاب کرے جو جدید تعلیم سے آراستہ اور دیگر اعلیٰ خصوصیات کی حامل ہو۔ اس عہد میں ایسی مثالی بہو کا ملنا ناممکن تھا۔ اس لیے بیگم نواب نے یہ صورت نکالی کہ اُس لڑکی کو اپنے محل میں رکھ کر تمام تر تربیت کی ذمہ داری وہ خود لیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے ایک خاص وزیر قنداہادی خان کو شمالی مغربی سرحدی علاقے سے قدیم افغان نسل سے تعلق رکھنے والی لڑکی کی تلاش میں روانہ کیا۔ وزیرِ خاص نے بعد میں بتایا کہ انھوں نے چار سالہ میمونہ سلطان کو اپنے گھر کے باہر نکلنے کے پاس کھڑا دیکھا اور فیصلہ کر لیا کہ یہی لڑکی نواب حمید اللہ کی بیوی بنے گی۔ وزیرِ خاص جب والدہ میمونہ سے رشتے کی بات کرنے گیا تو میمونہ کی تصویر مانگنے پر گھر سے باہر نکال دیا اور کہا کہ اگر اس بچی کے والد زندہ نہیں تو کیا میں اس کی تصویر آپ کو اس لیے دوں کہ آپ کسی بگڑے نواب سے اس لڑکی کا رشتہ طے کریں کہ جس لڑکی کے اباؤاجداد نے ماضی میں اس نواب کی سرزمین کو کئی دفعہ فتح تو کیا مگر وہاں رہنا خود گوارہ نہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی وزیر کو اپنے گھر سے چلے جانے کا حکم دیا مگر وزیرِ خاص نے ہمت نہ ہاری اور کسی اور ذرائع سے تصویر لے کر بھوپال واپس آ گئے اور نواب بیگم کو لڑکی کی تصویر دکھانے کے ساتھ سارا قصّہ بھی بیان کیا۔[۸۸]

نواب سلطان جہاں کے لیے یہ بات ہی کافی تھی کہ انھیں دلہن پسند آ گئی اور ان کے نزدیک میمونہ کی والدہ کا روّیہ بھی اُن کی باوقار نسل کی سند تھا۔ نواب سلطان جہاں بیگم چھوٹی عمر کی شادی کے خلاف تھیں مگر اپنی بہو کو اپنے زیرِ تربیت پروان چڑھانے کے خیال سے انھوں نے وزیرِ خاص کے ذریعے انگریز افسران کو مطلع کرنے کے بعد رشتہ طے کر لیا اور ۱۹ اگست ۱۹۰۵ء بروز جمعرات ایک پارٹی کو بھوپال سے پشاور روانہ کیا تاکہ وہاں بارات کا انتظام کریں اور تاریخ طے کریں۔ ان دونوں کے نکاح کی تاریخ ۶ ستمبر ۱۹۰۵ء کو طے ہوئی۔[۸۹]

اس شادی میں جہاں شاہی شان و شوکت کا پورا اہتمام کیا گیا وہاں اس بات کا بھی خاص خیال رکھا گیا کہ کوئی فضول اور غیر شرعی رسم ادا نہ ہونے پائے۔ البتہ مستحقین اور خاندان ریاست کو بیش بہا جوڑے اور گراں قدر انعامات عطا کیے گئے اور اس کے ساتھ صدقہ و خیرات اور غرباء میں پیسے تقسیم کیے گئے تھے۔ اس کم سنی کی شادی کے متعلق بیگم سلطان جہاں شادی کی تقریب میں اپنی تقریر میں یوں اظہار کرتی ہیں۔

> میں گمان کرتی ہوں کہ اس چھوٹے دولہا کو دیکھ کر آپ خیال کرتے ہوں گے کہ اس صغر سنی میں دلہن بیاہ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ شاید آپ کو یہ بھی خیال ہو گا کہ ہندوستان کے رسم و رواج کا اثر مجھ پر بھی ہے اور صغر سنی کی شادی کو جو عموماً معیوب سمجھی جاتی ہے میں بھی مستحسن سمجھتی ہوں۔ میرا اصل مقصد شادی میں اس قدر عجلت کرنے کا نہ تھا کہ اپنی ننھی سی بہو کو اپنا نورِ نظر بنا کر اپنی نگرانی میں تعلیم و تربیت دے سکوں کیونکہ عمدہ تعلیم و تربیت کو مستورات کے لئے سب سے بہتر اور سب سے زیادہ خوشنما زیور سمجھتی ہوں۔ [۹۰]

میمونہ سلطان کی تربیت نہایت عمدہ طور پر بیگم نواب سلطان کی زیرِ نگرانی ہوئی۔ میمونہ سلطان کے بالغ اور تعلیم یافتہ ہونے تک رخصتی نہیں کی گئی، اس دوران انھوں نے شہزادیوں کی سی تعلیم حاصل کی۔ انھیں پردے کی پاسداری کراتے ہوئے قرآن، حدیث، عربی، فارسی، انگریزی، خوشخطی اور اسلامی تاریخ کی مکمل تعلیم دی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریز اساتذہ کی زیرِ تربیت انھیں مغربی ثقافت جس میں انگریزی، فرانسیسی، پیانو اور وائلن، آلاتِ موسیقی بھی سکھائے گئے تھے۔ ان تمام علوم کے علاوہ گھڑ سواری، بندوق چلانا اور ٹینس کھیلنا بھی سکھایا گیا۔ نواب سلطان بیگم کی کوشش تھی کہ وہ میمونہ کو ایسے تیار کریں کہ انھیں علاقائی رسم و رواج اور مغربی ثقافت کے امتزاج میں کوئی دشواری نہ ہو۔ اسلامی اور جدید تعلیم کے ساتھ میمونہ سلطان نے دستکاری اور امورِ خانہ داری میں بھی دسترس حاصل کی۔ میمونہ سلطان کی تعلیم کے بارے میں زہرہ بیگم فیضی ایک مضمون میں لکھتی ہیں:

> شاہ بانو بیگم کی تعلیم و تربیت اور ہی طریقہ پر ہوتی ہے۔ ان میں ایک ایسی خاص بات ہے کہ بے اختیار ان کی طرف دل راغب ہوتا ہے۔ سرکار عالیہ نے انہیں زیورِ علم سے اچھی طرح آراستہ و پیراستہ کیا ہے۔ ہنوز اُن کی تعلیم ہو رہی ہے۔ ابھی ان کا سن و سال ہی کیا ہے پندرہ یا سولہ برس کا سن ہے ان کی ذات سے خواتین اسلام کی بہت کچھ امیدیں وابستہ ہیں۔ میں ان سے جہاں کہیں ملتی ہوں بہت خوش ہوتی ہوں۔ [۹۱]

شاہ بانو کا بچپن نواب سلطان جہاں کے زیرِ سایہ گزرا۔ انھوں نے فہم و فراست، علم و دانائی اور گھر گرہستی کے تمام گر بھی نواب بیگم سے سیکھے۔ شاہ بانو ہر لحہ بیگم نواب کی شریکِ کار رہیں اور تمام فلاحی اور ادبی کاموں میں ان کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتی رہیں۔

میمونہ بیگم نے نواب بیگم اور نواب حمید اللہ کے ہمراہ ہندوستان کے مختلف صوبوں اور شہروں دہلی، بمبئی، کلکتہ، بنگلور، میسور، لکھنؤ، کانپور، اجمیر اور آگرہ کا سفر کیا اور اہلِ ہندوستان سے ملاقاتیں بھی کیں۔ ان اسفار کے علاوہ ۱۹۱۱ء میں یورپ کا سفر بھی کیا۔ اس سفر کے دوران وہ روزنامچہ تحریر کرتی رہیں اور واپسی پر نواب بیگم کی یادداشتوں کی مدد سے مرتب کر کے سیاحت سلطانی شائع کیا۔ اس سفر نامہ کے علاوہ ان کی دیگر تصانیف یہ ہیں۔

۱۔ عمل و ریحان

بچوں کی اصلاح و تربیت کے لیے کہانیوں پر مشتمل ہے اور یہ بھوپال، حیدر آباد، علی گڑھ کے مدارس میں شامل رہی۔

۲۔ سلک مروارید

یہ چار حصّوں پر مشتمل مذہبی نثری کتاب ہے۔

۳۔ ذکر مبارک

آنحضور ﷺ کی سوانح عمری ہے اور یہ مدرسوں میں شاملِ نصاب رہی ہے۔

۴۔ آغاز اسلام (ترجمہ بدواۃ اسلام)

یہ تصنیف مولانا شبلی نعمانی کی فارسی کتاب بدٔالاسلام کا اردو ترجمہ ہے۔

۵۔ اخلاقی حکایات فرائض مادری (مرتبہ و ترجمہ)

یہ کتاب ماں کے فرائض پر مبنی اخلاقی اور سبق آموز حکایات پر مبنی ہے۔

میمونہ سلطان ایک چاق و چوبند اور سرگرم خاتون تھیں۔ انھوں نے تحریکِ نسواں میں فعال کردار ادا کیا اور جلسے جلوسوں میں مختلف موضوعات پر تقاریر کیں۔ اس کے ساتھ وہ لیڈیز کلب کے جلسوں، نمائشِ مصنوعات خواتین ہند اور آل انڈیا لیڈیز کانفرنس میں بھی شریک رہیں۔ بیگم شاہ بانو نمائش مصنوعات خواتینِ ہند کی منتظمہ کمیٹی کی پریزیڈنٹ بھی منتخب ہوئیں۔[۹۲] انھوں نے خواتین کے لیے بڑی دل چسپی اور محنت کے ساتھ کام کیا۔ غرض اس قسم

کے جلسے ہوتے رہتے تھے۔ خاندان شاہی کی بیگمات اور دیگر ممتاز خواتین کی طرف سے یہاں زنانہ پارٹیاں بھی دی جاتی تھیں۔ وقتاً فوقتاً مختلف مضامین پر تقریریں ہوتی تھیں جن میں میمونہ سلطان شاہ بانو کی بھی متعدد تقریریں ہوتی تھیں جو ہر لحاظ سے طبقۂ اناث کے لیے مفید و موزوں تھیں۔[۹۳]

میمونہ سلطان بیگم نہایت شائستہ اور نفیس خاتون تھیں۔ نواب حمید اللہ (۱۹۲۸ء) میں سائمن کمیشن اور بٹلر کمیٹی کا حصّہ بنے تو اس سلسلہ میں نواب حمید اللہ کے ہمراہ میمونہ بیگم بھی برطانیہ گئیں۔ اس وقت نواب صاحب نے ان کا باقاعدہ پردہ ختم کرایا۔ وہ جدید تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی شعائر کے مطابق زندگی بسر کرنا پسند کرتی تھیں۔ انھیں نواب حمید اللہ کی طرف سے کچھ مسائل سے بھی دوچار ہونا پڑا مگر انھوں نے بڑی ثابت قدمی سے سب مشکلات کا مقابلہ کیا اور آخر کار یہ باہمت خاتون ۱۴ مئی ۱۹۸۲ء کو اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئیں۔

۹۔ محمودہ عثمان حیدر

بیگم محمودہ ۱۹۰۸ء[۹۴] میں ہندوستان کے ضلع بجنور کے ایک قصبہ نہوڑ میں پیدا ہوئیں۔ یہ وہ مشہور جگہ بجنور ہے جس کی تاریخ لکھنے کے لیے سر سید احمد خان وہاں گئے اور سالوں کی عرق ریزی کے بعد تاریخ بجنور تحریر کی۔ بیگم محمودہ نے ایک علمی و ادبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد حکیم سید غلام حیدر کا خاندان بیگم محمودہ ۱۹۲۶ء میں سید عثمان حیدر سے بیاہی گئیں جو کہ سید سجاد حیدر یلدرم کے بھانجے تھے۔ وہ اینگلو پرشین آئل کمپنی میں ملازم ہونے کی وجہ سے مشرقِ وسطیٰ میں مقیم تھے۔ اس لیے بیگم محمودہ نے ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۳ء کا عرصہ اپنے شوہر عثمان حیدر کے ساتھ گذارا اور ایک سفر نامہ مشاہدات بلادِ اسلامیہ تحریر کیا۔

بیگم محمودہ سید سجاد حیدر یلدرم کی حقیقی چچازاد بہن اور ان کے بھانجے کی بیوی تھیں۔ اس حوالے سے بھی وہ ایک الگ پہچان رکھتیں تھیں۔ مصنفہ کو اپنے مقام و مرتبہ کا احساس تھا جس کا اظہار وہ اپنے سفر نامہ میں بھی جابجا کرتیں نظر آتی ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتی ہیں:

> کار خاص کے علاوہ اب عثمان صاحب دنیا کی بہترین قسم کی کاروں کے بھی مالک تھے جو حکومت ایران اور کمپنی کے اعلیٰ افسروں اور برطانوی سفیر کے لیے مخصوص تھیں۔ ان کے علاوہ تین ہزار موٹریں، سوا سو بحری جہاز، چھو

ہوائی جہاز، کئی سو موٹر لانچ اور موٹر لاریاں علیحدہ ٹرانسپورٹ کے محکمے کی نگرانی میں تھیں۔اسی سلسلہ سے عثمان صاحب کو ایک مرتبہ شاہی دورے میں شرف ہم رکابی اعلیٰ حضرت اقدس ہمایونی ہوا۔[۹۵]

بیگم محمودہ نے زندگی کا بہت سا حصہ بیرونِ ممالک گزارا اور پھر ہندوستان سے ہجرت کر کے کراچی میں مقیم ہو گئی تھیں۔ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔

اگلے ابواب میں ان خواتین ادیبوں کے سفر ناموں کا مطالعہ و تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ محمد امین زبیری مارہروی،حیات سلطانی،(آگرہ: عزیزی پریس،۱۹۳۹ء)، ص ۲۔

۲۔ رضیہ حامد،نواب سلطان جہاں بیگم ،(بھوپال: باب العلم پبلی کیشنز،۲۰۱۱ء)، ص۳۶۔

۳۔ و۔اصاحبہ،تذکرہ بیگمات بھوپال،(لاہور: دارالاشاعت پنجاب،۱۹۳۳ء)، ص۱۱۔

۴۔ سلطان جہاں بیگم،حیات قدسی،(بھوپال: مطبع ریاست،۱۹۱۷ء)، ص ۱۲۴۔

۵۔ ایضاً، ص۱۰۔

۶۔ محمد امین زبیری مارہروی۔حیات سلطانی، ص ۲۔

۷۔ محمد امین زبیری،بیگمات بھوپال،(بھوپال: مطبع ریاست،۱۹۱۸ء)، ص۴۶۔

۸۔ ایضاً، ص۴۷۔

۹۔ طیبہ بی،تاریخ فرمار وایان بھوپال،(بھوپال: بھوپال پریس،۱۹۷۷ء)، ص۷۸۔

۱۰۔ رضیہ حامد، ص۵۱۔

۱۱۔ محمد امین زبیری،بیگمات بھوپال، ص۱۲۸۔

۱۲۔ محمد امین زبیری،ایضاً، ص۱۔

۱۳۔ محمد امین زبیری،ایضاً، ص۴۹۔

۱۴۔ نواب سلطان جہاں،تزک سلطانی(حصّہ اول)،(بھوپال: مطبع سلطانی،۱۳۲۸ھ)، ص۳۹۔

۱۵۔ ایضاً، ص۴۰۔

۱۶۔ ایضاً، ص۴۵۔

۱۷۔ رضیہ حامد،نواب سلطان جہان بیگم، ص۸۲۔

۱۸۔ سلطان جہاں بیگم، تزک سلطانی، ص۹۔

۱۹۔ محمد امین زبیری،حیات سلطانی، ص۱۸۔

۲۰۔ و۔ا۔صاحبہ،تذکرہ بیگمات بھوپال،(لاہور:دارالاشاعت پنجاب،۱۹۳۲ء)،ص۴۰۔

۲۱۔ رضیہ حامد،نواب سلطان جہاں بیگم،ص۳۱۴۔۳۱۵۔

۲۲۔ محمد حسین صدیقی،ہندوستان کی بیس بڑی خواتین،(کراچی:زمزمہ پبلشرز،۲۰۰۳ء)، ص۱۷۹۔

۲۳۔ طیبہ بی،تاریخ فرمانروایان،بھوپال،ص۱۵۰۔

۲۴۔ فصیح الدین ملخی(مرتبہ)،تذکرہ نسوانِ ہند،(پٹنہ:مطبوعہ شمسی پریس،س۔ن۔)،ص۸۲،

۲۵۔ ایضاً،ص۵۴

۲۶۔ اصغر عباس(مرتبہ)،مسافرانِ لندن،(کراچی:ادارۂ یادگارِ غالب،۲۰۱۶ء)،ص۱۵۰۔

۲۷۔ بیگم سربلند جنگ بہادر، دنیا عورت کی نظر میں،(دہلی:خواجہ برقی پریس،۱۹۱۰ء)،ص۱۷۷۔

۲۸۔ اختر حمید یہ بیگم سربلند جنگ، تقریر، مشمولہ:عصمت،(رازق الخیری، جلد۲۶،فروری۱۹۲۶ء)، ص۷۷۔

۲۹۔ ایضاً،ص۷۸۔

۳۰۔ اختر حمید، بیگم نواب سربلند جنگ بہادر،(دہلی:مشمولہ عصمت، جلد۳۶،فروری۱۹۳۸ء)۔

۳۱۔ بیگم سربلند،دنیا عورت کی نظر میں،ص۸۔

۳۲۔ رفعت جہاں،بیسویں صدی میں خواتین کی غیر افسانوی نثر:ایک مطالعہ، (علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس،۲۰۱۵)،ص۱۳۳۔

۳۳۔ محمد یامین(مرتبہ)،زمانۂ تحصیل، (کراچی:ادارۂ یادگارِ غالب،۲۰۱۰ء)،ص۱۴۔

۳۴۔ میمونہ دلوی،بمبئی میں اردو،(دہلی:مکتبہ جامعہ،۱۹۷۰ء)،ص۶۸۔

۳۵۔ محمد یامین عثمان،عطیہ فیضی کا خاندان، مشمولہ:تحقیق،شمارہ۲۹(جنوری تاجون۲۰۱۵)،ص۲۴۴۔

۳۶۔ معین الدین عقیل،اردو کی اولین خود نوشت سوانح عمریاں، مشمولہ:خدا بخش لائبریری جرنل (۲۰۰۴ء)،ص۶۳۔

۳۷۔ محمد یامین عثمان،عطیہ فیضی کا خاندان،ص۲۴۷،۲۴۸۔

۳۸۔ رئیس احمد جعفری، عطیہ بیگم فیضی، مشمولہ: نگار، جلد نمبر ۵۸ (نومبر ۱۹۷۹ء)، ص ۲۸۔
۳۹۔ نازلی رفیعہ سلطان، سیرِ یورپ، (لاہور: یونین اسٹیم پریس، ۱۸۰۸)، ص ۲۴۶۔
۴۰۔ ایضاً، ص ا۔
۴۱۔ اخبار نامہ قبیلہ فیضی طیبی، جلد دہم، ص ۲۳۷۔۲۳۸۔
۴۲۔ روز نامہ جنگ، کراچی، ۷ جنوری ۱۹۶۷ء۔
۴۳۔ محمد عبدالرزاق بسمل، تذکرہ جمیل، (حیدر آباد: دکن: بیرون دبیر پورہ، ۱۹۲۹ء)، ص ۱۷۔
۴۵۔ علامہ راشدالخیری، محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ، مشمولہ: عصمت، جلد ۳۶ (فروری ۱۹۲۶ء)، ص ۱۳۱۔
۴۶۔ محمد یامین عثمان (مرتبہ)، زمانۂ تحصیل، (کراچی: ادارۂ یادگار غالب، ۲۰۱۰ء)، ص ۱۴۔
۴۷۔ محمد یامین عثمان، عطیہ فیضی کا خاندان، ص ۲۴۳۔
۴۸۔ ایضاً، ص ۲۴۴۔
۴۹۔ میمونہ دلوی، بمبئی میں اردو، (دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۰ء)، ص ۶۸۔
۵۰۔ محمد یامین، عطیہ فیضی کا خاندان، ص ۲۴۴۔
۵۱۔ معین الدین عقیل، اردو کی اولین خود نوشت سوانح عمریاں، ص ۶۳۔
۵۲۔ ڈاکٹر محمد یامین، ص ۲۵۰۔۲۵۱۔
۵۳۔ سید تنویر شیرازی، اجنار بلدیہ، جلد نمبر ۸۔۹، دسمبر۔جنوری ۱۹۰۰ء
۵۴۔ ایم شفیق، دخترانِ حرم، (کراچی: مسلم اکیڈمی، سن ندارد)، ص ۱۲۴۔
۵۵۔ ڈاکٹر محمد یامین، زمانۂ تحصیل، ص ۱۴۷۔
۵۶۔ محمد عبدالرزاق بسمل، تذکرہ جمیل، ص ۲۰۔
۵۷۔ ایم شفیق، دخترانِ حرم، (کراچی: مسلم اکیڈمی، سن ندارد)، ص ۱۲۱۔
۵۸۔ ضیاالدین برنی، اقبال دیگر مشاہیر اور عطیہ، مشمولہ: ماہ نو (کراچی، اپریل ۱۹۶۷ء)۔
۵۹۔ رازق الخیری، محترمہ عطیہ فیضی صاحبہ، مشمولہ: عصمت، رازق الخیری، (جلد ۳۶، فروری ۱۹۲۶ء)، ص ۱۲۳۔

۶۰۔ وہاب اشرفی، شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری مشمولہ سیمیں، ثمر فضل، ہندوستانی مسلم خواتین کی جدیدتعلیمی ترقی میں ابتدائی ناولوں کا حصہ، (دہلی: اے ون آفیسٹ، ۱۹۹۱)، ص ۲۵۵۔

۶۱۔ سلطانہ بخش، ایم، پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار، (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء)، ص ۱۸۹

۶۲۔ صغرا ہمایوں، سفرنامہ یورپ، ص ۸۶ے

۶۳۔ حمیرہ سعید، اردو ناولوں میں نسائی حسیت، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹ء)، ص ۵۷

۶۴۔ سیمیں، ثمر فضل، ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی ناولوں کا حصہ، ص ۲۵۵

۶۵۔ ایضاً، ص ۲۵۶

۶۶۔ ایضاً، ص ۲۵۶

۶۷۔ صغرا ہمایوں،، سفرنامہ یورپ، ص ۸۶ے

۶۸۔ نصیر الدین ہاشمی، حیدر آباد کی نسوانی دنیا، مشمولہ، سیمیں، ثمر فضل، ڈاکٹر، ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی ناولوں کا حصہ، ص ۲۵۷ (حیدر آباد: ادارہ ادب جدید، ۱۹۶۶ء)، ص ۵۰

۶۹۔ سلطانہ بخش، ایم، پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار، (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء)، ص ۱۸۹

۷۰۔ نصیر الدین ہاشمی، ایضاً، ص ۲۵۶

۷۱۔ علامہ راشد الخیری، محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ، مشمولہ: عصمت، جلد ۳۶ (فروری ۱۹۲۶ء)، ص ۱۳۱۔

۷۲۔ صغرا بیگم اور نسوانی دنیا، طیبہ خسرو، یاد صغرا ہمایوں، ۱۹۷۶ء، ص ۲۳، مرتب مرزا سرفراز علی مشمولہ اردو ناولوں میں نسائی حسیت، ص ۵۸

۷۳۔ صغرا ہمایوں،سفر نامہ یورپ، ص۷۸۶۔

۷۴۔ نصیر الدین ہاشمی، ایضاً، ص۲۵۶۔

۷۵۔ محمدی بیگم،تہذیب نسواں، جلد۴۶،(۷اگست ۱۹۴۳ء)، ص۵۱۴۔

۷۶۔ ایضاً، ص۵۱۵۔

۷۷۔ ایضاً، ص۵۱۶۔

۷۸۔ سید شفقت رضوی،بیگم حسرت موہانی حیات و سیرت،(کراچی: نشاط النساء میموریل سوسائٹی، ۱۹۹۶ء)، ص۱۳۔

۷۹۔ نعیمہ بیگم،حسرت کی کہانی: نعیمہ کی زبانی، (کراچی: المخزن پرنٹرز پاکستان چوک، ۱۹۶۹ء)، ص۶۔

۸۰۔ سید شفقت رضوی، ص۱۱۔

۸۱۔ ایضاً، ص۱۴۔

۸۲۔ عبدالشکور، پرنسپل،حسرت موہانی، (آگرہ: عزیزی پریس،۱۹۴۶ء)، ص۱۰۰۔۱۰۱۔

۸۳۔ محمد حسین صدیقی (مرتبہ)،ہندوستان کی بیس بڑی خواتین)، ص۱۸۴۔

۸۴۔ ایضاً، ص۱۸۵۔

۸۵۔ علیم شہاب، ۱۰۰ نامور خواتین، (لاہور: روہی پبلی کیشنز،۲۰۱۱ء)، ص۱۲۵۔

۸۶۔ محمد امین زبیری،بیگمات بھوپال، ص۱۲۸۔

۸۷۔ رضیہ حامد،نواب سلطان جہاں بیگم، ص۱۲۶۔

۸۸۔ صاحبزادہ یعقوب خان، *Memories of a Rebel Princess*: عابدہ سلطان(کراچی: آکسفورڈ پریس، ۲۰۱۳ء)، ص۲۸۔

۸۹۔ محمد امین زبیری،بیگمات بھوپال، ص۱۳۵۔

۹۰۔ محمد امین زبیری،بیگمات بھوپال، ص۱۲۷۔

۹۱۔ زہرہ بیگم فیضی،نمائش کے چشم دید حالات مشمولہ: بیگمات بھوپال، محمد امین زبیری، ص۸۸۔

۹۲۔ محمد امین زبیری، بیگمات بھوپال، ص ۹۱۔

۹۳۔ ایضاً، ص ۴۷۔

۹۴۔ محمودہ عثمان حیدر، مشاہدات بلادِ اسلامیہ، بیک کور۔

۹۵۔ ایضاً، ص ۱۳۔

باب چہارم

نوآبادیاتی عہد میں خواتین کے سفرنامے:

سماجی وثقافتی مطالعہ

باب چہارم

نوآبادیاتی عہد میں خواتین کے سفر نامے:
سماجی و ثقافتی مطالعہ

نوآبادیاتی عہد اردو نثر کے لیے بڑا اہم دور ہے۔اس دور میں دیگر اصناف کے علاوہ سفر نامے کی صنف کو بھی بڑی پذیرائی ملی اور بہت سے سفر نامے تخلیق ہوئے۔ اردو ادب میں خواتین کے ادب کی تاریخ کچھ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں خواتین کے لکھنے کا آغاز اصلاحی مضامین سے ہوتا ہے۔ ان مضامین میں سماجی مسائل پر اظہارِ خیال کرنے کے علاوہ عورتوں میں شعور بیدار کرنے کی بھی سعی کی گئی تھی۔ شروع شروع میں معاشرے کے مخصوص رویّے کے پیش نظر کئی خواتین نے فرضی ناموں سے لکھا مگر جب نوآبادکاروں نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیااور معاشرے میں تبدیلی کی لہر چلی تو تحریکِ آزادیِ نسواں کے تحت خواتین میں بیداری آئی۔ انھوں نے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کی جس کے لیے وہ براہِ راست معاشرے سے مخاطب ہونے لگیں۔

بیسویں صدی میں سفر نامے کے علاوہ دیگر نثری اصناف میں بھی خواتین نے طبع آزمائی کی اور اس طرح اردو نثری ادب میں اضافہ ہوا۔ اس صدی کے عشرہ اوّل میں اصلاحی مضامین کے ساتھ ساتھ سفر نامہ ہی ایک ایسی صنف ہے جس کو خواتین نے اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا اور اپنے اسفار کے تجربات، مشاہدات اور حالات و واقعات میں دوسروں کو شریک کیا۔ ان خواتین نے مختلف مقاصد کے تحت سفر کیے جیسا کہ سیر کی غرض سے اندرونِ ملک اور بیرونِ ممالک کا سفر، دیارِ مقدسہ کا سفر، سیاسی سفر، تعلیمی سفر وغیرہ۔

اس عہد میں حالات کی تبدیلی کی وجہ سے خواتین کو اپنے محدود دائرے سے نکل کر باہر کی دنیا کو بھی دیکھنے کے مواقع میسر آئے۔ اب وہ کہیں بھی جاتیں تو وہاں کے سماج اور ثقافت کا بغور جائزہ لیتیں اور ہر ایک بات کا مشاہدہ کرتے ہوئے سفر سے واپسی پر ان کو کتابی صورت میں پیش کرتیں۔ اس طرح خواتین نے بہت سے مقامی سفر نامے،

مغربی ممالک اور بلادِ اسلامیہ کے سفر نامے اور دیارِ مقدسہ کے سفر نامے تخلیق کیے۔ اب ہم ان سفر ناموں کا سماجی و ثقافتی جائزہ لیں گے۔

ا۔ دیارِ مقدسہ کے سفر نامے:

حج دینِ اسلام کا اہم رکن ہے اور اس مقدس رکن کی ادائیگی کا خواب ہر مسلمان دل میں رکھتا ہے۔ جب اس فرض کی تکمیل کے لیے وہ بڑی عقیدت سے حجازِ مقدسہ کا سفر مکمل کر کے وطن واپس آتا ہے تو بڑا سکون محسوس کرتا ہے۔ حجازِ مقدسہ کے سفر کے علاوہ زیارت گاہوں (ایران و عراق اور شام) کی زیارتوں کے لیے اختیار کیے گئے سفر بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

ان مذہبی فرائض کی عقیدت میں لوگوں نے دور دراز کے دشوار سفر کیے۔ جن میں انھیں قدم قدم پر زندگی کا خطرہ تھا مگر پھر بھی ان کی عقیدت میں فرق نہ آیا۔ ان اسفار سے واپس آنے والوں نے دوسروں کی رہنمائی کے لیے انھیں تحریری صورت میں قلم بند کیا، جو آہستہ آہستہ سفر نامے کی صورت اختیار کر گیا۔ اب ان مذہبی سفر ناموں سے ہمیں نہ صرف مناسک حج اور فرائض کی ادائیگی کے طریقوں کا پتہ چلتا ہے بلکہ ان ملکوں اور شہروں کی سماجی، ثقافتی، تاریخی، جغرافیائی بلکہ ہر طرح کی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

بیسویں صدی میں خواتین نے کثرت سے سفر نامے لکھے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواتین کو سفر کرنے کے مواقع زیادہ ملے اور ذرائع آمد و رفت بھی آسان ہو گئے تھے۔ خواتین نے سفر کرنے کے ساتھ ساتھ سفر نامے لکھنے پر بھی خصوصی توجہ دی۔ نو آبادیاتی عہد میں خواتین نے دیارِ مقدسہ کے درج ذیل سفر نامے لکھے ہیں جن کا مفصل تعارف و تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

ا۔	یادداشت تاریخ و قائع حج	نواب سکندر بیگم	۱۸۶۵ء
۲۔	روضۃ الریاحین	نواب سلطان جہاں بیگم	۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء
۳۔	دنیا عورت کی نظر میں	بیگم سربلند جنگ بہادر	۱۹۱۰ء
۴۔	سفرنامہ عراق	بیگم ہمایوں مرزا	۱۹۱۵ء
۵۔	مشاہدات بلاد اسلامیہ	محمودہ عثمان حیدر	۱۹۳۲ء

۶۔ سفرنامہ عراق   بیگم حسرت موہانی   ۱۹۳۷ء

ا۔ا۔یادداشت تاریخ وقائع حج از نواب سکندر بیگم:

نواب سکندر بیگم اردو ادب کی اولین سفر نامہ نگار خاتون ہیں۔یہ ریاست بھوپال کی حکمران تھی۔ یادداشت تاریخِ وقائع حج ان کا سفر نامہ ہے۔جو انھوں نے ۱۸۶۵ء میں حج کے سفر سے واپسی کے بعد تحریر کیا تھا۔ انھوں نے اس مقدس سفر کے حالات و واقعات کو یادداشت تاریخ وقائع حج میں بیان کیا۔[۱] اس سفر نامے کی صرف دو کاپیاں اردو زبان میں لکھی گئیں۔ایک مسز رورانڈ (Mrs. Rorand) کے لیے اور دوسری کاپی لیفٹیننٹ کرنل ڈپلو سے آسرن (Diplosy Asran) کے لیے تھی۔انھیں دو نسخوں میں سے ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔[۲] اس رام پور والے نسخہ پر سنہ تحریر درج نہیں ہے لیکن غالب امکان یہی ہے کہ اسے واپسی کے بعد ۱۸۶۴ء یا ۱۸۶۵ء میں مرتب کیا گیا ہوگا۔[۳] نواب سکندر بیگم کا یہ سفر نامہ اردو میں تو ابھی تک شائع نہیں ہوا مگر انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ کرنل ڈیورنڈولم ولکنسن (Davorondolam Wilicson) نے کیا۔[۴] اور ۲۰۰۷ء میں *A Princesses Pilgrimage* کے نام سے سیوبھان لیمپرٹ ہرلے (Siobhan Lampert Hurley) نے اس کی تدوین کر کے انڈیانا یونی ورسٹی پریس سے شائع کیا۔[۵] اس سفر نامے کو ۲۰۰۸ء میں دوبارہ اس مصنف نے اوکسفرڈ پریس (Oxford Press) کراچی (پاکستان) سے شائع کیا ہے[۶] اور یہی ایڈیشن راقمہ کے زیر مطالعہ رہا ہے۔

بیگم نواب سکندر کے سفر کے حالات روزانہ انگریزی اخباروں میں شائع ہوتے رہتے تھے اور دہلی گزٹ میں بھی باقاعدہ اشاعت ہوتی تھی۔ان تمام اخبارات کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر جگہ اُن کا جانا باضابطہ ہوتا تھا۔ برطانوی افواج اور مقامی لوگ ان کا استقبال کرتے تھے۔سفر نامے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سکندر بیگم ۱۲۸۰ھ بمطابق ۱۸۶۳ء میں ایک بڑے قافلے کے ساتھ سفرِ حج پر روانہ ہوئیں۔ان کا قافلہ دو بحری جہازوں اور مکہ

میں سات سوا ونٹوں پر داخل ہوا تھا۔ سفرِ حج کے دوران سکندر بیگم نے ایک روزنامچہ لکھا، ہر چیز کا بغور مطالعہ کیا اور بعد میں ان یادداشتوں کی مدد یہ سفر نامہ ترتیب دیا۔[۷] انھوں نے یہ حج نامہ فارن سیکرٹری شملہ مسٹر رورانڈ کی اہلیہ اور خود مسٹر رورانڈ کی فرمائش پر تحریر کیا تھا، جو ملک عرب اور وہاں کے باشندوں کے حالات جاننے کے مشتاق تھے۔ اس سفر نامے کا انگریزی ترجمہ بھی کیا گیا جیسے ۱۸۷۰ء میں ولیم اچ السن و کمپنی الٹریو (برطانیہ) نے شائع کیا۔ اشاعت کے بعد ملکہ برطانیہ وکٹوریا کی خدمت میں پیش کیا۔[۸]

یہ سفر نامہ نہ صرف بھوپال کی ایک مسلم خاتون کا پہلا سفر نامہ ہے بلکہ اسے اردو سفر نامہ نگاری کی تاریخ میں بھی پہلی خاتون کا سفر نامہ تسلیم کرنا چاہیے کیوں کہ اس سفر نامے کا انگریزی ترجمہ ۱۸۷۰ء میں شائع ہو چکا تھا۔ اس سفر کے متعلق محمد امین زبیری لکھتے ہیں۔

> ۱۲۸۰ھ میں سعادت حج حاصل کی اور باوجود راستہ کی سخت مشکلات کے پندرہ سو آدمی ہمراہ لے کر مکہ معظمہ گئیں، حج ادا کیا اور خدا کی نعمتوں کا شکر بجالائیں جس طرح کہ ہندوستان میں بہ لحاظ اپنے نظامِ حکومت اور بااعتبار وفاداری و خیر خواہی تاج برطانیہ سب سے ممتاز تھیں اسی طرح تمام والیان ملک میں حرم محترم میں بھی حاضر ہونے کا شرف امتیاز و اولیت انھیں کو حاصل ہوا۔[۹]

نواب سکندر کی حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد واپسی کے متعلق حیات سکندری میں لکھا ہے کہ وہ فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد پونا، بمبئی سے ہوتی ہوئی بروز بدھ ۳ جمادی الاول ۱۲۸۱ھ بمطابق ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۴ء کو بھوپال واپس پہنچیں۔[۱۰]

یہ سفر نامہ اردو سفر نامہ نگاری کی تاریخ میں خواتین کے اولین حج ناموں میں بھی شمار ہوتا ہے۔ اس میں سفر حج کی تفصیل عقیدت سے بیان کی گئی ہے۔ انھوں نے اس سفر نامے میں چھوٹی سے چھوٹی چیزوں کو بھی پیش کیا ہے۔ اس سفر نامے میں ان لوگوں کا بھی ذکر ملتا ہے جن کے ہمراہ بیگم سکندر نے سفرِ حج کیا۔ ان میں ان کی والدہ نواب قدسیہ بیگم بھی شامل تھیں۔ اس سفر نامے میں عرب کی تہذیب و معاشرت، رہن سہن وہاں کے لوگوں کے عادات و اطوار کا

ذکر بھی ملتا ہے۔ مکہ کے بدوؤں کا ان کے ساتھ سلوک اور ان کا لوگوں کے لیے تحفے تحائف لے کر جانا بھی درج ہے۔ نواب سکندر بیگم کا مکہ میں قرآن مجید کا ترکی زبان میں ترجمہ کرنے کا حکم بھی اس سفر نامے میں موجود ہے۔

اس سفر نامے میں مکہ و حجاز کی تہذیبی و سماجی، جغرافیائی اور سیاسی صورت حال بھی نظر آتی ہے۔ اس میں مکہ کے لوگوں کا کھانا پینا، لباس، وہاں کے مویشیوں کے بارے میں اور بدوؤں کے برے سلوک کا تذکرہ کثرت سے ملتا ہے۔ اس سفر نامے کی ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ایک خاتون ہونے کے ناطے بیگم سکندر نے وہاں کی عورتوں کا ایک معاشرتی پہلو کثرت طلاق کے بعد دس دس شادیوں کو نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔ سفر نامہ یادداشت تاریخ وقائع حج میں حج کے متعلق معلومات برائے نام ہیں اور اس کے بجائے دیگر معاملات مثلاً سیاسی رہنماؤں، شریف و پاشا سے ملاقات کا طویل بیان، سلطنت برطانیہ سے حج پر جانے سے متعلق ضروری امور کا تبادلہ خیال اور بحری جہاز کے انتظامات پر زیادہ تفصیلی بیان ہے۔ ان تمام طویل بیانات نے اگرچہ اس سفر نامے کو گنجلک بنا دیا ہے مگر اس کے باوجود یہ سفر نامہ اپنے عہد کی زبان، اندازِ تحریر کا عمدہ نمونہ ہے۔

اس سفر نامے میں زیادہ تر معلومات امورِ حج، معاملات سلطنت برطانیہ، اقامت، بحری جہاز کا احوال وغیرہ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں عربوں کا لباس، مویشی، کھانا پینا اور اس قافلہ حج کو درپیش مسائل کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ اس کے علاوہ نامور شخصیات سے ملاقاتوں کا احوال بھی درج ہے۔ یہ سفر نامہ اپنے اندازِ تحریر کی وجہ سے زیادہ اہمیت کا حامل ہو یا نہ ہو مگر اس کی سماجی و تہذیبی اہمیت ضرور ہے۔ اس کے علاوہ یہ سفر نامہ اپنی تاریخی اہمیت بھی رکھتا ہے۔ اس کا آج بھی تہذیبی تاریخ اور تاریخی حقائق کے حوالے سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کی اہمیت کے باوجود اردو سفر ناموں کے ناقدین اور مفسرین کی اس عہد آفریں سفر نامے سے عدم توجہ حیرت انگیز ہے حالاں کہ ریاست بھوپال کی تمام تاریخی کتب میں اس سفر نامے کا حوالہ ملتا ہے۔

۲۔ا۔ روضۃ الرّیاحین، سفر نامہ سفر کشور حجاز از نواب سلطان جہاں بیگم

نواب سلطان جہاں بیگم کا شمار بھی ریاست بھوپال کی حکمران خواتین میں ہوتا ہے۔ نواب سلطان جہان بیگم ریاست بھوپال کی چوتھی خاتون حکمران تھیں۔ روضۃ الریاحین ہزہائی نس نواب سلطان جہاں بیگم والی بھوپال کا حج کا سفر نامہ ہے۔ یہ سفرِ حج ۱۳۰اکتوبر ۱۹۰۳ء سے شروع ہو کر ۱۴اپریل ۱۹۰۴ء کو اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یہ سفر تقریباً چھ ماہ کی مدت پر مشتمل ہے اور اس سفر نامے کو مطبع سلطانی ریاست بھوپال نے ۱۳۲۷ھ / میں حافظ کرامت اللہ کے زیرِ اہتمام شائع کیا مگر اس سفر نامے کے اختتام پر سنہ تاریخ ۸ جمادی الثانی ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء درج ہے۔[۱۱] اس ۱۳۲۷ھ /۱۹۰۹ء کی اشاعت سے پہلے بھی یہ سفر نامہ روضۃ الریاحین مرحلہ طباعت سے گزرا ہے اور اس کی دوسری اشاعت کے سلسلے میں ڈاکٹر محمد شہاب الدین لکھتے ہیں کہ ''۱۳۲۴ھ /۱۹۰۶ء میں نواب سلطان جہاں بیگم کا سفر نامہ حج روضۃ الریاحین المعروف بہ سفر نامہ سفر کشورِ حجاز شائع ہو چکا تھا۔''[۱۲] انھوں نے ۸ شعبان ۱۳۲۱ھ بمطابق ۳۰اکتوبر ۱۹۰۳ء عیسوی ایک بڑے قافلے کے ساتھ سفر اختیار کیا۔ نواب سلطان بیگم کے ہمراہ ان کے دو بیٹے حافظ محمد عبید اللہ، نواب حمید اللہ اور ان کی بہو شہر یار دلہن صاحبہ بھی تھیں۔ انھوں نے نہ صرف یورپ اور ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کی ہے بلکہ یہ سفر نامہ روضۃ الریاحین ان کے حج کے سفر کے حالاتِ پر مشتمل ہے۔ جس میں اس زمانے کی سیاست اور حکومتی ارکان انگلشیہ کے متعلق بھی اہم معلومات ملتی ہیں۔ یہ سفر نامہ اس لیے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اردو ادب میں اولین حج نامہ نگار خواتین حکمران بھوپال ہیں۔ بیگمات بھوپال میں نواب سکندر بیگم کے بعد یہ سعادت نواب سلطان جہاں کو حاصل ہوئی اور سفر نامہ روضۃ الریاحین ریاست بھوپال کی دوسری خاتون حکمران کا حج نامہ ہے۔

اس سفر نامے کے دو حصے اور ۳۸۹ صفحات ہیں۔ پہلے حصے میں حج کی اہمیت کو اسلام کی رو سے اور آیات قرآنی سے بیان کرنے کے بعد بیت اللہ اور مسجد نبوی کی تعمیر کے متعلق بڑی تاریخی معلومات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد پہلے حصے کے تتمہ میں انھوں نے عرب کے قدیم و جدید سکہ جات کو تفصیلاً بیان کرنے کے علاوہ مکہ و حجاز کی مقدس زیارات کو جس دل چسپی اور عقیدت سے بیان کیا ہے جو بیگم سلطان جہاں کی علم دوستی اور علمی بصیرت کا پتہ دیتی ہے۔ دوسرے حصے میں حکومت برطانیہ سے حج کی سعادت حاصل کرنے اور اجازت طلب کرنے کے لیے قانونی کارروائیاں درج ہیں، پھر سفرِ حج کی داستان ہے۔ اس سفرِ حج کی روانگی کے بارے میں محمد امین زبیری لکھتے ہیں۔

> سرکار عالیہ نے اپنے ارادہ حج بیت اللہ کے متعلق جمیع رعایائے ملکِ محروسہ کے نام ایک اعلان کی اشاعت فرمائی جس کا ہر ایک فقرہ شفقت و عطوفت شاہانہ سے بھرا ہوا ہے اور عبدیت و فرائض

حکومت کی اہمیت کے احساس کو نمایاں کر رہا ہے اور اپنی رعایا سے درخواست کی تھی کہ اگر لاعلمی یا بطریق دیگر کسی کے حقوق ادا کرنے میں قصور ہوا ہو تو معاف کر دے اور مقبولیت حج اور مع الخیر پر واپسی کی دُعا کرے۔[۱۴]

اس سفر نامے کے سرِورق سے لے کر اس کی کچھ عبارتیں عربی زبان میں ہیں لیکن نواب بیگم کے اسلوب کی اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے ہر عربی عبارت کا مفہوم حواشی میں درج کیا ہے۔ اس عہد کے دیگر سفر ناموں کے مطابق اس سفر نامے کا آغاز بسم اللہ سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد فارسی کا یہ قطعہ درج ہے:

مقصد و جہان ز مہر و ماہ است یکے | رہبر و بود و لیک راہ است یکے

در مدح محمد و خدا فرقے نیست | گر چشم دو تا بود نگاہ است یکے

اور پھر اس کے بعد ایک آیت سے سفر کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے۔

ہم نے دکھائی امانت آسمان کو اور زمین کو اور پہاڑوں کو پھر سب نے قبول نہ کیا کہ اس کو اٹھا دیں اور اس سے ڈر گئے اور اٹھالیا اس کو انسان نے۔[۱۵]

اس سفر نامے میں نواب سلطان جہان نے اپنے سفر کی تیاری کے حکومتی معاملات، سفر کے فائدے، عرب کا جغرافیہ، بیت اللہ کی بنیاد، ارکانِ حج اور مناسکِ حج کو بڑی تفصیل سے بیان کیا مگر عرب تہذیب و معاشرت پر سرسری نگاہ ڈالی ہے۔ اس میں صرف حج اور حکومتی معاملات کی کاروائیاں وضاحت سے بیان کی گئی ہیں۔ انھوں نے اپنے سفر نامہ حج میں سفر کی کاروائی سے متعلق معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے ان کا سفر نامہ معلومات کا گنجینہ بن گیا ہے۔

مصنفہ نے اپنے سفر نامے کے ذریعے اہلِ ہندوستان کو راہنمائی پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ یہ سفر نامہ روزنامچے کی ہیئت میں ہے جس میں روانگی سے لے کر ہر مرحلہ بندرگاہ و جہاز کے حالات، راہ حجاز میں اونٹوں کے سفر، منزلوں کے نام، شتربان بدوؤں کا پریشان کرنے کا ذکر، حاجیوں کے قافلوں پر بدوؤں کے حملے، لوٹ مار جیسے واقعات سے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ اس سفر نامے میں مصنفہ نے روزمرہ بول چال کے عربی الفاظ اور جملوں کی شمولیت کا

التزام بھی کیا ہے۔ طرزِ املا کے نقطہ نظر کو دیکھیں تو مصنفہ نے قدیم طرز املا کا رویہ اپنا کر یائے معروف اور مجہول میں کوئی فرق نہیں کیا۔ اس کے علاوہ دو چشمی ھ کے بجائے ہائے ہوز کا استعمال بھی کیا ہے۔ مثلاً کبی (کبھی)، کچہہ (کچھ)، کہانا (کھانا) اور مجہہ (مجھ) وغیرہ اور ساتھ ہی دو الفاظ کو ملا کر لکھنے اور قدیم طرز پر زائد الفاظ کے استعمال کا رجحان بھی بہت ہے۔ مثلاً جنپر (جن پر)، اسمیں (اس میں)، اُونکی (اُن کی)، اُوسکے (اُس کے)۔ اس کے علاوہ نون غنہ والے لفظوں میں نون استعمال کیا ہے۔ جیسے مین (میں)، ہین (ہیں)، کرین (کریں)، وہان (وہاں)، یہان (یہاں) وغیرہ۔

یہ سفر نامہ چوں کہ نو آبادیاتی عہد میں تحریر کیا گیا ہے اس لیے یہ اپنے عہد کی ایک اہم تاریخی دستاویز بھی ہے جس سے حکمران بھوپال کے سلطنت برطانیہ کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس لیے یہ سفر نامہ اہم سفر ناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔

۳۔۱۔ دنیا عورت کی نظر میں از بیگم سربلند جنگ بہادر

دنیا عورت کی نظر میں نواب بیگم سربلند جنگ بہادر کا سفر نامہ ہے۔ جو خواجہ برقی پریس دہلی سے ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ بیگم نواب ۲۷ شوال بمطابق ۱۶ نومبر ۱۹۰۹ء میں نواب حمید اللہ خان کے ساتھ حج بیت اللہ کے سفر پر روانہ ہوئیں۔ اُن کا یہ سفر ۱۸ مارچ ۱۹۱۰ء کو حیدر آباد دکن پر ختم ہوا اور اس طرح اُن کا یہ سفر تقریباً چار ماہ کی مدت میں مکمل ہوا۔ اس سفر میں ان لوگوں کے ہمراہ دو ملازمین بھی تھے اور انھوں نے حیدر آباد سے عدن، سویز، پورٹ سعید، حافہ، شہر ندرت، طبریہ، مدینہ و مکہ منورہ، دمشق، بیروت قسطنطنیہ، اسکندریہ، ایتھنیز، پیرس، روم، لندن کا سفر کیا۔ انھوں نے جس بحری جہاز پر سفر شروع کیا اس کا نام "سال سٹ" (Salsette) تھا اور یہ جہاز پی۔ اینڈ۔ او۔ کمپنی کا تھا۔ بیگم سربلند صاحبہ کا یہ بحری جہاز کا پہلا سفر تھا۔ اس سے پہلے انھوں نے کبھی کشتی یا جہاز نہیں دیکھا تھا تو کشتی کے متعلق لکھتی ہیں کہ جب کشتی چلی تو میں نے گھبرا کر پوچھا کہ یہ کیسی جگہ ہے جو ہلتی ہے تو نواب صاحب نے بتایا کہ یہ کشتی ہے جو ہمیں جہاز تک لے کر جائے گی۔[۵] مصنفہ نے دورانِ سفر ہی اس سیاحت نامے کو لکھنا شروع کر دیا تھا اور وہ روزانہ ڈائری میں روز کی مصروفیت درج کرنا نہیں بھولتی تھیں اور پھر اختتام سفر پر انھوں نے روزنامچے کی صورت میں سفر نامہ دنیا عورت کی نظر میں میں ۱۹۱۰ء میں خواجہ برقی پریس نے دہلی سے شائع کیا۔ اس سفر نامے کا نام ہی اس سفر نامے کی اندر کی داستان کا خلاصہ ہے۔

اوائل بیسویں صدی کے ہندوستان کی اس باسی نے بیرونی دنیا کو جیسا دیکھا اس کو ہو بہو اہلِ ہندوستان کو دکھانے کی سعی کی ہے۔ وہ وہاں کی تہذیب و معاشرت اور نئی نئی ایجادات کو دیکھ کر خود بھی متاثر ہوتی ہیں اور اپنی سب کیفیات، تجربات اور مشاہدات میں دوسروں کو بھی شریک کرتی ہیں۔ بحری جہاز میں انھوں نے برتنوں کو مشین کے ذریعے دھلتے دیکھا تو حیرت کا اظہار کرتی ہیں کہ برتن عجیب طرح سے دھوئے جاتے ہیں۔ بیسن میں برتن ڈال دیے اور نل موڑ دی برتن اوپر نیچے ہو گئے اور گرم پانی سب برتنوں میں پھر گیا، بس دھل گئے۔[۱۶] مصنفہ نے ہر شہر اور ممالک کے لوگوں کے رہن سہن کو تفصیلی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ لندن، فرانس اور جرمنی کے عجائب خانے، نیشنل گیلری، تھیٹرز اور مصر کے عجائب خانوں میں ممیز دیکھ کر اپنی حیرت کا اظہار یوں کیا ہے۔

> ایک چیز ایسی دیکھی کہ جس سے افسوس بھی ہوا اور حیرت بھی ہوئی۔ وہ یہ کہ اگلے بادشاہوں کی نعش کو ایک بکس بنوا کر اس میں کچھ روپیہ جواہرات رکھ کر بند کر دیا کرتے تھے اور اوپر بادشاہ متوفی کی تصویر لگا دیتے تھے۔ ان لوگوں نے اس بکس کو توکھڑا کر دیا بعض کو بند بعض کو کھول کر آئینہ کی الماری مثل تحت کے بنا کر اُسی میں رکھ دیا ہے۔[۱۷]

اس سفر نامے میں بیت اللہ کے روح افزا سفر کے ساتھ یورپی ممالک کے لوگوں کے رہن سہن اور وہاں کے بازاروں، عمارتوں کی تصویر کشی بھی ہے۔ سفر نامے کے ابتدائی حصہ میں حج بیت اللہ اور مناسک حج کا بیان ہے اور بعد کا سفر یورپی دنیا کے دل کش مناظر کی عکاسی ہے۔ مگر اس کی ہیئت روزنامچہ کی سی ہے جس میں روزانہ کے معمول، کھانا، سونا اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی تفاصیل ضرورت سے زیادہ ہیں۔ اس سفر نامے کے بارے میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ یوں رقم طراز ہیں۔

> اس سفر نامے کے عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مشرقی عورت یورپ کے تہذیبی مطالعے کو کس قدر اہمیت دے رہی تھی۔ یوں بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول کی ابتدا خواتین کے سفر ناموں میں یورپ کی جانب نظر اٹھا کر دیکھنے سے ہوئی۔[۱۸]

اس نو آبادیاتی عہد میں ہر طبقے کی خواتین پردے کا خصوصی اہتمام کرتی تھیں۔ بیگم سربلند جنگ بھی ان روایات کی پاسدار تھیں اور انھوں نے یہ سفر پردے کے ساتھ کیا۔ سفر نامے میں جا بجا انھوں نے پردے کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتی ہیں کہ نواب سربلند جنگ بہادر نے آ کر کہا کہ چلو میز تیار ہے، مصنفہ نے کہا سب

کے ساتھ کھانا کھاؤں؟ تو نواب صاحب نے جواب دیا چلو یہاں کون دیکھتا ہے۔اس نے ایک کلوک پہنا جو خاص اس سفر کے لیے سلوایا تھا اور ترکی نقاب منہ پر ڈال کر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ مگر اسے جاتے ہوئے بہت شرم محسوس ہوئی۔ اتفاق سے جس میز پر آکر بیٹھی یہ بالکل علیحدہ تھی اور اس کا منہ صرف نواب صاحب کی طرف تھا اور منہ سے نقاب اٹھا دی۔[۱۹] ان تمام عبارات سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ طبقہ اشرافیہ کے مرد و زن دورخی رویہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ اندرونِ ہندوستان وہ سختی سے پردے کا اہتمام کرواتے اور بیرونِ ممالک میں اس قید سے آزاد ہو کر سیر و سیاحت اور اپنے دیگر امور انجام دیتے تھے۔ اس عہد کی تمام سفر نامہ نگار خواتین جیسے عطیہ فیضی، نازلی بیگم، صغرا ہمایوں اور محمودہ عثمان حیدر نے اپنے وطن سے باہر پردہ ترک کرنے میں ہی عافیت جانی ہے۔

مصنفہ کو دورانِ سیاحت اپنا ملک برابر یاد آرہا تھا۔ وہ جس جگہ سے گذرتیں اس میں اپنے ملک کے کسی شہر اور مقام سے مناسبت تلاش کرنے کی کوشش کرتیں۔ اپنی اس کوشش میں ان کو کئی جگہ کامیابی ملی اور انھوں نے اس کو بیان بھی کیا ہے جیسے ترکی کا اپنے ملک سے موازنہ یوں کرتی ہیں۔

> قسطنطنیہ کا آدھا حصہ یورپ میں ہے آدھا ایشیا میں۔ بیچ میں سمندر ہے درمیان میں پل ہے۔ یورپ کا حصہ بھی سلطان ہی کی حکومت میں داخل ہے مگر یہ پیرا جہاں ہم اُترتے ہیں اس کی حالت ایسی ہے جیسے ہمارے ہاں کا سکندر آباد۔[۲۰]

حج کا سفر ایک اہم عبادت اور فرض سمجھ کر کیا جاتا ہے۔اس سفر میں ایک مسلمان کو ان مقامات کی زیارت کرنے کا موقع ملتا ہے جن کا ذکر وہ ہمیشہ سنتا چلا آیا ہے۔اس لیے جب وہ اس مقدس شہر میں داخل ہوتا ہے تو اس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے، جس میں عقیدت و احترام کے جذبات ہوتے ہیں۔ قربِ خداوندی کے شوق کے ساتھ ان راستوں سے گذرنے کی آرزو بھی ہوتی ہے۔ جن پر کبھی رسولِ رحمت اور ان کے اصحاب گذرتے تھے۔ اس لیے اس سفر کے مسافر کی اندرونی کیفیت بدل جاتی ہے۔ اسی کیفیت کا ایک خوبصورت اظہار وہ اس طرح بیان کرتی ہیں:

> جلدی سے ایک عجب شوق میں حرم پاک کی طرف روانہ ہوئے۔ میں اپنے قلب کی حالت بیان نہیں کرسکتی۔ لبیک برابر زبان پر جاری ہے اور آنسو آنکھوں سے بہہ رہے ہیں۔ سامنے سے باب حرم پاک نظر آیا۔ کیا شان جبروت میں بیان کروں۔ بہت جلدی بصد شوق قدم بڑھایا اور درِ حرم کو چوما، سامنے حرم پاک نظر آگیا۔ باب السلام سے سر سجدہ کی خاطر جھکنے لگا کیسا دلربا میرے اللہ کا گھر ہے۔[۲۱]

مصنفہ نے ارضِ مقدس میں اپنی داخلی کیفیات کا اظہار بڑی تاثیر اور عقیدت سے کیا ہے۔ ان کے دل میں اس پاک زمین کا تقدس، اس کی عظمت اور محبت سمائی ہوئی ہے۔ کیوں کہ یہاں خدا کا گھر اور رسول پاک کی آرام گاہ ہے۔ اس سفر نامے میں اختصار و سادگی اور سلاست کے ساتھ ذاتی مشاہداتِ قلبی اور واقعات ظاہری کو پیش کیا گیا ہے۔

بیگم سربلند جنگ حرم نبوی کی زیارت کے لیے بہت بے قراری سے لکھتی ہیں۔ اب ہم دونوں مشتاقانِ دیدار بے اختیار کھڑے ہو گئے اور نہایت بے تابی کے ساتھ دیکھنے لگے تاکہ وہ روضۂ انور نظر آ جائے۔ خوشی اور شوق دیدار روضۂ نبی سے آنسو جاری ہو گئے۔ کھجوروں کے درخت بھی نظر آنے لگے۔ جوں جوں سٹیشن اور اہلِ مدینہ نظر آتے جاتے ہیں ویسے ویسے دل کی بے تابی بڑھتی جاتی ہے۔ اس طرح کی جذباتی اور دلوں کو گرمانے والی عبارتوں سے سفر نامہ بھرا ہوا ہے۔ بیگم سربلند جنگ نے سفر نامے کی ابتدا ہی دلگیر مناظر کو پیش کر کے کی ہے کہ جب وقتِ رخصت اپنوں نے پھولوں کے ہار آنسوؤں کے ساتھ پہنائے اور امام ضامن دعاؤں سے باندھے تھے اور انھوں نے صرف اپنے امام ضامنوں کی تعداد ۶۰۰ بتائی ہے۔ [۲۲] سربلند جنگ بہادر کے امام ضامنوں کی تعداد ان کے علاوہ ہے۔ تو ان تمام اقتباس سے ان کی مذہب سے گہری وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔

سفر نامہ دنیا عورت کی نظر میں مستشرقین کا ہندوستانیوں کے بارے میں شرق شناسی (Orientalism) کے رویے کا اظہار بھی کئی جگہ پایا جاتا ہے جیسے ایک جگہ مصنفہ لکھتی ہیں کہ اثنائے گفتگو میں ڈاکٹر نے مجھ کو دیکھا اور ہنس کر کہا کہ ہند میں تو بی بی لوگ کو بند کر کے مثل قیدی کے رکھتے ہیں۔ یہ سن کر مجھ کو بھی ہنسی آئی۔ [۲۳] اس سفر نامے میں نہ صرف دیارِ مقدسہ کے روح پرور مناظر کی جھلک نظر آتی ہے بلکہ مشرقیت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ یہ سفر نامہ اس دور کی ایک تاریخ ہے دوسری بات یہ کہ سفر نامہ شستہ اردو میں تحریر کیا گیا ہے جس کی نثر میں سپاٹ پن نہیں ہے بلکہ دلچسپی سے بھرپور ہے۔

اس سفر نامے میں مصنفہ نے معجزاتی پہلو کو بھی بیان کیا ہے اور وہ اسے غیبی فرشتے کا نام دیتی ہیں۔ ہر مسلمان کی طرح مصنفہ کو بھی حجرِ اسود کو بوسہ دینے کی دلی آرزو تھی لیکن ایک جم غفیر کو دیکھ کر وہ مایوس و رنجیدہ ہو کر اپنے پروردگار سے اس خواہش کو پورا کرنے کی دعا کرتیں تھیں کہ:

> ایک روز دریائے رحمت جوش میں آ گیا۔ یکایک ایک سدی حبشی قوم کا آدمی عمامہ باندھے میرے پاس آیا اور کیا خوب سوال کیا کہ "یا ستی انت بغیت بوسہ" یک دم میری زبان سے نکلا کہ "نعم یا سیدی" اتنا

کہتے ہی اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور اس کثیر اژدہام میں بچا کر لے چلا اس آسانی سے کہ گویا میں سیدھی گھسی چلی جار ہی ہوں ایک دم میرا سر پکڑ کر حجرِ اسود پر جھکا دیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے مجھ کو گھیرے کھڑا رہا کہ میں دَب نہ جاؤں۔ میں نے متواتر کئی بوسہ لیے۔ بعد کو اس نے مجھ کو گھسیٹ لیا اور باہر نکال لایا اور کہا کہ میرے پیچھے پیچھے چلی آؤ۔ زبان اس کی عربی ہے مگر میں سمجھ رہی ہوں۔ ایک مقام پر قریب خطیب کے لیجا کر مجھ سے کہا کہ "ہاتھ اٹھاؤ" اور خوب دعا میرے اور میرے والدین کے لیے مانگی۔ بعد اس کے ایک سیاہ کپڑا خانہ کعبہ کا اور عقیق البحر کی تسبیح عنایت کی۔ میں نے دو روپے نذر کیے تو نہ لیے اور بہت خوشی سے میری پشت پر ہاتھ پھیرا اور کہا" سخن روح منانہاں "۔ اب جاؤ یہاں سے بس میں پھر بہت خوش خوش باہر حرم شریف کے آئی۔ ۲۴

اس سفر نامے سے اہلِ یورپ اور اہلِ ارضِ مقدس کی سماجی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی مذہبی اور ثقافتی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس سفر نامے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں وارداتِ قلبی کے ساتھ واقعات سیاحت کو بھی قلم بند کیا گیا ہے کیونکہ مصنفہ نے حج بیت اللہ کی سعادت کے بعد یورپی ممالک کی سیاحت بھی کی تھی اور یہ سفر نامہ بیسویں صدی کے اوائل کے سفر ناموں میں اہم سفر نامہ ہے۔

۴۔۱۔ سفر نامہ عراق از بیگم صغرا ہمایوں

اب تک دیارِ مقدسہ کے جو سفر نامے ملے ہیں ان میں ایک اہم مذہبی سفر نامہ سفر نامہ عراق ہے۔ یہ سفر نامہ اُس عہد کی مشہور ادیبہ اور خواتین کے حقوق کی جنگ لڑنے والی بیگم صغرا ہمایوں کا ہے۔ اس سفر نامے کو مطبع نظام دکن نے ۱۹۱۵ء میں شائع کیا۔ مصنفہ نے یہ سفر اپنے خاندان کے افراد اور ملازموں کے ساتھ عراق کے مقدس مقامات کی زیارت کی غرض سے اختیار کیا تھا۔ ان کا چھوٹا سا قافلہ ۱۱ مارچ ۱۹۱۵ء کو حیدر آباد دکن سے بذریعہ ٹرین روانہ ہوا۔ مصنفہ نے اپنے سفر نامے روزنامچے کی ہیئت میں تحریر کیے ہیں اور اس اندازِ تحریر سے انھوں نے یہ فائدہ اٹھایا ہے کہ وہ اپنے قاری کو بھرپور سماجی و ثقافتی، تاریخی و معاشی معلومات فراہم کرتی ہیں اور جزئیات کو باہم مربوط کرتی ہیں۔ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت گہرا ہے۔ وہ ایک ایک نظارے، مقامات، موسموں، رہن سہن، معیشت اور رسم و رواج کی تفصیلات سمیٹتی جاتی ہیں اور پھر اپنے قاری کو اس میں شریک کرتی ہیں۔ وہ اپنے سفر ناموں کے ذریعے دوسرے ملکوں، شہروں کی سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشی صورت حال پر روشنی ڈالتی ہیں۔ وہ کسی بھی ملک یا شہر کی تاریخی معلومات دیے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتیں۔ جس کا فائدہ آج سے بڑھ کر اوائل بیسویں صدی کی

خواتین کو پہنچا ہو گا کہ جن کو اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر قدم رکھنے کی آزادی نہ تھی۔ اس دور میں سفر نامے لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ان لوگوں کو اپنی تحریروں سے ان جگہوں سے متعارف کروایا جائے جہاں تک کہ ان کی رسائی ممکن نہیں اور وہ بیرونی ممالک کی ترقیوں سے آگاہ ہوں۔

مصنفہ نے اس سفر نامے میں عراق کے معاشرے اور ثقافت کا تفصیلی حال لکھا ہے۔ انھوں نے ۱۹۱۵ء میں عراق کا یہ سفر کیا۔ ان کا یہ سفر کچھ مہینوں پر مشتمل ہے۔ وہ بمبئی، کراچی سے ہوتے ہوئے بصرہ، بغداد، کاظمین، سامرہ، کربلا معلّٰی، نجف اشرف گئے اور زیارت گاہوں پر حاضری دی۔

بیگم صغرا کے اس سفر نامے کی اہمیت اس کے گراں قدر دیباچے کی وجہ سے بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ انھوں نے اپنے اس سفر نامہ عراق میں اپنے خاندانی حالات آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیے ہیں۔ یہ ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو کسی دوسری تصنیف میں نہیں ملتا اور آج کی اکیسویں صدی میں اس عہد کی ادیبہ کے خاندانی حالات جاننے کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی مواد نہیں ہو سکتا۔ دوسری اس سفر نامے کی خاصیت یہ ہے کہ اس کے سرِورق پر بیگم صغرا کا لقب "حجلہ نشین و عصمت و عزلت بیگم صاحبہ" درج ہے۔ لیکن اس القاب عزلت بیگم صاحبہ کو کسی دوسری خاتون سفر نامہ نگار کا نام سمجھ کر اس سفر نامہ عراق از صغرا ہمایوں (۱۹۱۵ء) کو اس سے منسوب کیا جاتا رہا ہے اور اکثر کتب میں یہ سفر نامہ عراق از عزلت بیگم تحریر چلا آ رہا ہے جو ایک تحقیقی خامی ہے۔ راقمہ نے سفر نامہ کی تاریخی کتب میں اس کی جانچ پڑتال شروع کی اور تذکروں میں بھی اس نام کی خاتون کو تلاش کیا مگر ناکامی ہوئی لیکن ایک دن اچانک یہ سفر نامہ ملنے پر سرورق پر درج اس القاب نے راقمہ کی تحقیق کو مکمل کیا اور ثابت ہوا کہ سفر نامہ عراق از حجلہ نشین و عصمت و عزلت بیگم صاحبہ صغرا ہمایوں مرزا کی تصنیف ہے۔ [۲۵]

چونکہ یہ مصنفہ ایک اچھی شاعرہ بھی تھیں تو اس حوالے سے انھوں نے اپنا دیباچہ ان حمدیہ شعروں سے شروع کیا ہے۔

تو ہے خالق انس و جاں یا الٰہی | تو ہے رازق ایں و آں یا الٰہی
توہی رازق نیک و رزاق بد ہے | تو ہے وارث بندگاں یا الٰہی
بٹھائے اُسے اک جہاں اپنے سر پر | تو جس پر کہ ہو مہرباں یا الٰہی

ترا باغ جنت ہے تیرا ہی دوزخ   زمیں تیری اور آسماں یا الٰہی [۲۶]

اس کے بعد نعتیہ شعر کچھ یوں ہیں۔

محمدؐ سے صفت پوچھو خدا کی   خدا سے پوچھیے شان محمدؐ
علی کا مرتبہ اللہ اکبر   خدا نے تیغ دی احمد نے دختر [۲۷]

بیگم صغرا سیاحت کی شوقین تھیں انھوں نے نہ صرف اپنی سیاحت میں دوسروں کو شریک رکھا بلکہ ان کی ایک شعوری کوشش یہ بھی تھی کہ وہ برصغیر کے لوگوں کو اور خصوصاً عورتوں کو دوسرے ملکوں کی بود و باش، طرزِ تعمیر، نظام معیشت، رسم و رواج، زبان اور موسموں کا احوال زیادہ سے زیادہ بیان کریں۔ وہ جن مقامات پر بھی زیارت کے لیے گئیں وہاں کے حالات کو تفصیل سے بیان کیا ہے جیسا کہ وہ بتاتی ہیں

> جب تک کاظمین رہی اس کی صحت بہت اچھی رہی۔ بھوک خوب لگتی تھی۔ وہاں کی کھجوریں انھیں بہت پسند آئیں۔ وہاں کی روٹی بہت اچھی ہوتی تھی جس کو نان آبی کہتے ہیں۔ آدمی کے قد سے بھی بڑی بڑی روٹی ہوتی تھی۔ جس کو کاٹ کر، تول کر فروخت کرتے تھے۔ بازاری کباب بھی ان کو بہت پسند آئے، وہاں ترکاری بھی تول کر بیچتے ہیں۔[۲۸]

اس سفر نامے کے متعلق ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

> اس میں مقدس بارگاہوں پر حاضری کے نقوش اور ان حاضریوں سے پیدا ہونے والے تاثر کو پیش کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ بیگم ہمایوں کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے زیاراتِ مقدسہ کی فضیلت کے نقوش بھی جابجا نکھارے ہیں اور اس میں اپنے جذبہ عقیدت کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ اس سفر نامے میں سماجی اور تہذیبی نقوش کو بھی مناسب انداز میں اجاگر کیا گیا ہے۔[۲۹]

سفر نامہ عراق ایک دلچسپ اور معلوماتی سفر نامہ ہے۔ یہ سفر نامہ مختصر ہوتے ہوئے بھی عراق کی سماجی، تہذیبی و تمدنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ مقدس زیارت گاہوں کا نقشہ کھینچتا ہے۔ مصنفہ شاعرہ بھی ہے اس لیے انھوں نے سفر نامے میں اپنے اشعار کا استعمال کیا ہے جس سے سفر نامہ اور بھی دلکش بن گیا ہے۔ بطور نمونہ ایک نوحہ:

لاش شہ دیں پر یہی زینب کا بیاں تھا　　صدقہ ہوئی زینب

کیا جلد جہاں سے گئے ہے ہے مرے بابا　　صدقہ ہوئی زینب

اماں کا اٹھا سایہ تھا سر پر سے ہمارے　　بابا بھی سدھارے

ہم کس سے کریں ہائے یہ تقدیر کا شکوا　　صدقہ ہوئی زینب

کلثوم بھی چلاتی ہے اور کرتی ہے فریاد　　میں ہو گئی ناشاد

اب کوئی نہیں آن کے سینے سے لگاتا　　صدقہ ہوئی زینب

حسنین بُکا کرتے ہیں دیکھا نہیں جاتا　　شق ہوتا ہے سینا [۳۰]

مصنفہ مختلف زیارت گاہوں پر گئیں اور اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ ان بزرگانِ دین میں حضرت عبد القادر جیلانی، حضرت امام ابو حنیفہ، امام حضرت موسیٰ کاظم، حضرت امام علی تقی، حضرت امام حسن عسکری، حضرت نرگس خاتون والدہ معظمہ حضرت امام مہدی، حضرت عون محمد، حضرت علی اکبر، حضرت اصغر، حضرت ابوالفضل عباس شامل ہیں۔ سفر نامہ چونکہ زیارت گاہوں پر مشتمل ہے اس لیے جذبات فطرتاً مذہبی ہو جاتے ہیں۔ ہر جگہ کی زیارت کرتے ہوئے وہ اشکبار ہو جاتی ہیں اور سوچتی ہیں کہ کس کس طرح اہلِ بیت نے کربلا میں حق و سچ کے لیے قربانیاں دیں۔ ایک جگہ ان کی جذباتی کیفیت ملاحظہ کیجیے۔ ایک تو یہ لوگ عرب دوسرا قرأت سے واقف اس قدر بلند آواز سے پڑھتے ہیں کہ تمام گنبد گرج جاتا ہے۔ میرے بدن میں سنسنی ہونے لگتی تھی اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ [۳۱]

سفر نامہ عراق کی تاریخی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس میں مختلف شہروں کے تاریخی حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ راستے کی مشکلات اور موسموں کا حال بھی ملتا ہے۔ وہ موسم کا حال بھی لکھتی ہیں۔ موسم کافی ابر آلود تھا۔ کافی جگہوں پہ طوفان کا سماں تھا۔ آندھی اس قدر شدید تھی کہ آگے کچھ نظر نہ آتا تھا اور ٹھنڈ کا یہ عالم تھا کہ دانت بجنے لگے۔ [۳۲]

مصنفہ نے مقدس مقامات کی زیارتوں کی عقیدتوں کے ساتھ ساتھ اہلِ ہندوستان کے متعلق اہلِ عراق کے رویہ کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس کا اظہار دکھ کے ساتھ کیا ہے۔

> جوں ہی حمام میں داخل ہوئی دروازہ کے قریب ایک عورت وحشت ناک شکل کی میرے پاس ناک بھوں چڑھائے ہوئے آئی۔ افسوس کا مقام ہے کہ ہندی لوگوں کو عرب و عجم حقارت سے دیکھتے ہیں۔ میرے قریب فیس داخلہ مانگنے کے لیے آئی۔ میرے آدمیوں کو دیکھ کر آپس میں یہ وحشی عورت ایک دوسری عربن سے جو اس کے برابر کھڑی تھی کہنے لگی "کسے ہندی آمدہ" جب میں نے چہرہ سے نقاب اٹھایا تو سب کے سب یعنی وہ عورتیں بھی جو حمام کے لیے وہاں آئی ہوئی تھیں، نہایت تعجب سے مجھے گھورنے لگیں۔ ان کی ٹکٹکی جو بندھ گئی تھی کسی طرح موقوف ہی نہیں ہوتی تھی اور ایک دوسرے سے کہنے لگیں "ہندی نیست نسل عجم است" میں چپ سن رہی تھی۔ [۳۳]

بیگم صغرا ہر چیز کا گہرا مشاہدہ کرتی تھیں اور پھر ایک جز کو دوسرے سے یوں ملاتیں کہ ایک تسلسل قائم ہو جاتا تھا۔ ان کے باریک مشاہدے کی کیفیت اس اقتباس سے عیاں ہوتی ہے۔

> بیچ کے الحاق جس میں فرتح مبارک حضرت سیّد الشہدا کی ہے۔ ایک جانب ایک چاندی کی ایک اور ضریح ہے جس میں حضرت قاسم وغیرہ ہیں اس میں حبیب ابنِ مظاہر کی تربت ہے۔ ایوان مبارک کے چاروں طرف صحن بہت وسیع ہے۔ میوہ فروشوں، کتب فروشوں کی متعدد دکانیں جابجا صحن کے اطراف میں چائے خانے، قہوہ خانے بکثرت ہیں۔ سقّے قدم قدم پر کٹورے بجاتے پھرتے ہیں۔ [۳۴]

اس سفر نامے میں مصنفہ نے جگہ جگہ قافلہ کربلا اور خاندان نواسہ رسول ﷺ کے صبر اور ایمان افروز قربانیوں کے ساتھ ساتھ ان کے بہت سے واقعات بھی قلم بند کیے ہیں۔ مصنفہ کو اہلِ بیت کے کارنامے اور ان کے تاریخی واقعات سے بہت عقیدت ہے اور وہ ہر ایک کو تفصیل سے بیان کرتی ہیں۔ حضرت عباسؓ کا نہر سے پانی لانا اور شہادت، حضرت زین العابدین کی علالت اور معصوم اصغر کی شہادت کے واقعات ہیں۔ ایک واقعہ ملاحظہ ہو۔

> یہ وہی نہر ہے جس پر یزید پلید نے پہرے لگائے تھے تاکہ اہلِ بیت کو پانی نہ ملے اور شدت، تشنگی کی تاب نہ لا کر امام حسینؓ بیعت قبول کر لیں۔ حضرت عباسؓ علمدار جب مشکیزہ بھر کر واپس چلے تو ایک تیر کسی شقی کا حضرت کے شانہ مبارک میں ایسا کاری لگا کہ دست مبارک علیحدہ ہو کر وہیں شہید ہو گیا۔ [۳۵]

بیگم صغرا نے اس میں عراق کا نظامِ حکومت، فصلیں اور عورتوں کا لباس اور ان کے کام کاج پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور وہاں کے لوگوں کی خوراک کے متعلق لکھتی ہیں کہ

> عراق کے چند اقسام کے کھانوں، مٹھائیوں اور حلوہ جات کا تذکرہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اب
>
> گوشت سادہ گوشت کا شوربا جس میں تھوڑے سے سالم چنے بھی ڈالتے ہیں۔ واضح ہے کہ عراق کے چنے اس قدر بڑے ہوتے ہیں کہ شاید ہی دنیا کے کسی حصہ میں اس قدر بڑے ہوتے ہیں۔ کباب سیخ بازار میں ہمہ وقت ملتا ہے۔ قورمہ، آلو بخارا، قورمہ سیب، قورمہ بادنجان، فنجان مرغ، مسلم مرغ کا کباب اندر اس کے مغز اخروٹ پیس کر آب انار میخوش مغز بادام کے ٹکڑے اور زعفران ڈالتے ہیں۔ شیراز سے جو زعفران عراق میں لاکر بیچتے ہیں۔ کشمیری زعفران سے زیادہ تربو یا خوش رنگ ہوتی ہے۔ اسی طرح عرق بید مشک بھی شیراز کا بہت مفرح ہو معطر ہوتا ہے۔ قیمہ نخود نمکین و شیریں، دنبہ کے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے، کچا کچا مٹی کے ظرف میں رکھ کر بھونتے ہیں۔ مرک چند ترکاریوں کو ملا کر پکاتے ہیں۔[۳۶]

مصنفہ ایک عورت ہونے کے ناطے اُس ایک چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی نظر رکھتی ہیں جو کسی مرد سفر نامہ نگار کی نظروں سے اوجھل رہتے۔ انھوں نے نہ صرف اندرونِ ہندوستان خواتین کا بغور مشاہدہ کیا بلکہ بیرونِ ملک کی عورتوں کے بھی رہن سہن کو دیکھا اور اپنی عورتوں سے موازنہ بھی کیا۔

> اکثر خواتین اپنی مادری زبان عربی لکھ پڑھ سکتی ہیں۔ بعض فارسی اور ترکی بھی جانتی ہیں۔ سینا، پرونا، کشیدہ نکالنا اچھی طرح جانتی ہیں۔ بعض نقدہ یعنی کامدانی کا کام بھی جانتی ہیں۔ لباس عموماً اس قسم کا ہوتا ہے چھوٹے پائچوں کا پائجامہ اس پر سے لانبی آستینوں کا کرتا۔[۳۷]

یہ سفر نامہ مختلف شہروں اور عراق کے رسم ورواج، ان کے مذہبی اعتقادات، رہن سہن اور طرزِ معاشرت کا آئینہ دار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سفر نامہ نگار نے عراق کے تاریخی، سیاسی اور سماجی حالات کو تفصیل سے درج کیا ہے۔ یہ سفر نامہ پڑھ کر مقاماتِ مقدسہ اور زیارت کے طریقوں سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

۵۔ا۔ مشاہدات بلادِ اسلامیہ از محمودہ عثمان حیدر

دیارِ مقدسہ کے سفر ناموں میں محمودہ عثمان حیدر کا سفر نامہ مشاہدات بلادِ اسلامیہ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کے مقدس مقامات کی زیارت گاہوں کے احوال پر مشتمل ہے۔ یہ پہلی بار ۱۹۳۲ء اور دوسری بار ۱۹۶۲ء میں مشہور آفسٹ پریس کے تعاون سے کراچی سے شائع ہوا۔ یہ سفر نامہ دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے میں سفر کی روداد اور دوسرے میں مختلف بزرگانِ دین کے سوانحی خاکے بیان کیے گئے ہیں۔

بیگم محمودہ عثمان حیدر بھی حقوقِ نسواں کی حامی خواتین میں سے تھیں۔ انھوں نے اپنے سفر نامے میں یہاں مختلف ملکوں کی تہذیب و معاشرت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہاں پر وہ ہندوستانی خواتین کی تعلیم اور بیداری کے لیے بھی کوشاں نظر آئیں۔ انھوں نے اس سفر نامے میں مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کا تفصیلی حال لکھا ہے۔ انھوں نے ۱۹۲۹ء سے جولائی ۱۹۳۳ء کا عرصہ اپنے شوہر سیّد عثمان حیدر کے ہمراہ مختلف ممالک کی زیارت گاہوں کو دیکھنے میں بسر کیا۔ یہ لوگ ایران، آبادان، بغداد، کربلا معلّٰی، نجف اشرف، کوفہ، موصل، ترکی، شام، دمشق، حلب، بیروت، حیفہ اور بیت المقدس سے ہوتے ہوئے وطن واپس پہنچے۔ انھوں نے یہ سفر مختلف زیارت گاہوں کو دیکھنے کے مقصد سے اختیار کیا تھا۔ وہ اس سفر کے متعلق لکھتی ہیں:

> میرے سرتاج آقائے سیّد عثمان حیدر کو مدت سے بلاد اسلامیہ کی سیاحت کی آرزو تھی۔ آخر میری نند مسز الطاف حسین کے جیٹھ اور ہمارے خالہ زاد بھائی مسٹر سیّد احمد حسین اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر سی پی اور اُن کے حقیقی بھانجے سیّد احمد صاحب کی کوششوں سے یہ آرزو پوری ہوئی۔ [۳۸]

بیگم محمودہ عثمان حیدر کو اپنے عہدے اور مقام و مرتبہ کا احساس ہے جس کا اظہار سفر نامہ میں جا بجا پایا جاتا ہے۔ جس سے خود نمائی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ مصنفہ سید سجاد حیدر یلدرم کے خاندان میں سے تھیں۔ اس تعلق کا اظہار بارہا سفر نامے کی زینت بنا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے شوہر سید عثمان حیدر جو کہ ایسٹ انڈیا کی ایک کمپنی "اینگلو پرشین آئل کمپنی لمیٹڈ" میں اعلیٰ عہدے پر ملازم تھے، ان کے عہدے اور مراعات کا خصوصی تذکرہ پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ لکھتی ہیں کہ "جب عثمان صاحب کارِ خاص پر مامور ہوئے تو ان کی پوزیشن ہی کچھ اور ہو گئی۔ نہ پہلی سی ڈیوٹی کی پابندیاں رہیں نہ کسی کی خاص ماتحتی۔ بس اپنے وقت کے نواب بے ملک تھے۔ اتفاق سے کام بھی کچھ ایسے تفویض ہوتے تھے جن کی وجہ سے دیارِ غیر میں وہ لطف ہیں کہ وطن میں خواب و خیال میں بھی ممکن نہ تھے۔ کارِ خاص کے

علاوہ اب عثمان صاحب دنیا کی بہترین قسم کی کاروں کے بھی مالک تھے۔[۳۹] اسی قسم کے اقتباسات اور اپنے شوہر کے عہدے سے حاصل شدہ عیش و عشرت کا بیان سفر نامہ کی فضا پر ایک عجیب سا تاثر پیدا کرتا ہے۔

اس سفر نامہ میں نو آبادیاتی عہد کی نامور ادبی اور سیاسی شخصیات جیسے مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور، حکیم سید غلام حیدر، سید سجاد حیدر یلدرم، نذر سجاد حیدر، مسٹر ٹاؤ صاحب، ہر ہائی نس لیڈی علی شاہ (والدہ سر آغا خان)، محمد سر فراز بیگم، بیرسٹر سر تیج بہادر سپرو سے ملاقاتوں کا ذکر بھی ہے جس سے اس عہد کی تاریخ ساز شخصیات سے آگاہی ہوتی ہے۔

یہ سفر مقدس مقامات کی زیارت کرنے کی غرض سے کیا گیا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ مختلف ممالک کے لوگوں کے رہن سہن، ان کے رسم و رواج، ان کی ثقافت اور تاریخی مقامات کے متعلق بھی معلومات جاننا چاہتے تھے۔ اس سفر نامے کی اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید یوں لکھتے ہیں۔ یہ سفر نامہ دنیائے اسلام کی زیارت گاہوں اور مقاماتِ مقدسہ کے بارے میں مفید اور قابلِ اعتماد معلومات فراہم کرتا ہے۔[۴۰]

سفر نامے میں مصنفہ نے مقاماتِ مقدسہ اور بزرگانِ دین کی عظمت کو تفصیلی طور پر بیان کیا ہے۔ انھوں نے مختلف معلومات کے ذریعے سفر نامے کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ سفر نامہ مختصر ہوتے ہوئے بھی مختلف ملکوں کی ثقافتی اور سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ زیارتوں کا ایسا دلفریب نقشہ کھینچتا ہے کہ پڑھنے والا اس کی روحانی فضا میں کھو سا جاتا ہے۔ اس سفر نامے کی افادیت کے متعلق مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔

> حقیقت یہ ہے کہ مشاہدات بلاد اسلامیہ کو پڑھنے کے بعد اپنی محرومی پر افسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے دورانِ سفر میں لاعلمی کے سبب بہت سے اہم مقامات کے پاس سے گذرا اور وہاں حاضری نہ دے سکا۔ اب آرزو ہے کہ اس کا ایک نسخہ لے کر دوبارہ ارض اسلام کی سیاحت پر جاؤں اور اس کی زیرِ رہنمائی سب مقامات پر حاضری دوں۔[۴۱]

یہ سفر نامہ زائرین کی سہولت کے لیے بھی لکھا گیا ہے کیونکہ اس عہد میں سفری سہولتیں کم یاب تھیں اور سفر کئی مہینوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ لوگوں کو راستے میں بہت سی مشکلات پیش آتی تھیں۔ ان کی رہنمائی کے لیے یہ ایک عمدہ کاوش تھی۔ اس سفر نامے کی زبان عام فہم اور سلیس ہے۔ مصنفہ نے مشرق وسطی کے ممالک کی تہذیبی، سماجی

اور مذہبی زندگی کو پیش کیا ہے۔ وہاں کے لوگوں کی زبان، عادات واطوار، عمارات، مساجد، دفاتر وغیرہ سب ہی کچھ ہمیں ان کے سفر نامے میں مل جاتا ہے۔ ایک جگہ لکھتی ہیں۔

> ایران میں سب سے اچھا شہر یہاں کا پایہ تخت تہران ہے۔ یہاں کی سرکاری عمارات میں پارلیمنٹ ہاؤس، وزرا کے دفاتر یعنی سیکرٹریٹ، یونیورسٹیاں، جنرل پوسٹ آفس، شاہی ہسپتال، فوجیوں کی بارکیں وغیرہ اور شاہی محلات میں گلستان محل قابل دید ہیں۔ [۴۲]

اس سفر نامے میں ہر ملک کی مساجد کی بھی عمدہ منظر کشی کی گئی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ کیجیے۔

> یہ مقام اس مسجد میں سب سے متبرک ہے۔ زیر گنبد مخرہ شریف یعنی پتھر کی ایک بڑی چٹان ہے جو قریب قریب معلق ہے۔ گنبد کے چاروں طرف خوب کشادہ دالان ہیں اور یہ تمام عمارت مع گنبد نہایت شاندار اور خوش نما ہے۔ اندر کثرت سے ہیرے جواہرات جڑے ہوتے ہیں اور جابجا نہایت اعلیٰ نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ [۴۳]

سفر نامہ مشاہدات بلادِ اسلامیہ میں بہت سے بزرگانِ دین کی کرامات، معجزے اور ان کی اسلام کے لیے دی گئی قربانیوں کا ذکر ہے۔ محمودہ عثمان حیدر کے دل میں بزرگانِ دین حضرت حذیفہ بن الیمان، حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت سلمان فارسی اور حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی محبت، عقیدت اور احترام کا گہرا نقش موجود ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس احترام و محبت کے اظہار کے لیے ان مذہبی شخصیات کی نہ صرف خوب صورت حلیہ تراشی کی ہے بلکہ ان کی زندگیوں سے سبق آموز حکایات، واقعات اور پند و نصائح کے فرمودات کو بھی بیان کیا ہے۔ سفر نامہ کا یہ دوسرا حصہ ان بزرگانِ دین کے حالاتِ زندگی اور حلیہ مبارک جاننے کے لیے ایک بڑی اہم کاوش ہے جس کے لیے مصنفہ نے خاصی عرق ریزی سے اس کو مرتب کیا ہے۔

اس سفر نامے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مصنفہ جس جس جگہ سے گذری وہاں کی ہر ایک بات، تاریخی، سماجی حالات اور عمارتوں کی تفصیلات بھی بیان کی ہیں۔ وہ لاشعوری طور پر ہندوستان سے دیگر مقامات کا موازنہ کرتی بھی دکھائی دیتی ہیں جیسا کہ لکھتی ہیں کہ آبادان جو اینگلو پرشین آئل کمپنی کا صدر مقام اور ہمارا ہیڈ کوارٹر تھا۔ وہاں ایک ماڈل ٹاؤن ہے۔ سڑکوں کی نفاست، برقی روشنی اور دنیا کے ہر حصے کے اشخاص کا اجتماع دن رات کی چہل پہل اور قسم کے جہازوں کی آمد و رفت کے اعتبار سے اس پر لندن نہیں تو بمبئی کا دھوکا ضرور ہو جاتا ہے۔ [۴۴]

مصنفہ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ وہ نہ صرف خود تعلیم کی اہمیت سے آگاہ تھیں بلکہ انھیں ہندوستان کی عورتوں کی تعلیمی پستی کا بھی گہرا احساس تھا۔ اس لیے وہ بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کے دوران اور واپسی پر ہندوستانی عورت کی حالت پر رنجیدہ رہی۔ اس لیے انھوں نے سفر نامے کے آخری مضمون "ہندوستان اور بلادِ اسلامیہ" میں مسلمان قوم اور یورپی اقوام کی خواتین کی تعلیمی صورت حال کا موازنہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کے بعد اپنے ملک کو آکر دیکھا تو عجیب عالم نظر آیا۔ بمبئی، دہلی، لکھنؤ غرض جہاں بھی دیکھیے مرد تو ضرور کچھ ترقی کی دوڑ میں نظر آتے ہیں مگر عورتوں کے لیے ان کی تنگ خیالی میں ابھی تک کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔[۴۵] عورتوں کی تعلیم کے حوالے سے سفر نامہ کا یہ آخری حصہ واعظانہ اہمیت رکھتا ہے۔ مصنفہ اس میں ایک مقررہ کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور مزید لکھتی ہیں:

> ہمارے مرد تو بڑی ڈگریاں حاصل کرتے ہیں مگر عورتوں کی یونی ورسٹی صرف گھر ہی میں ناظرہ قرآن پڑھنے تک محدود ہے۔ ہزار میں دو چار اگر کچھ پڑھی لکھی ہیں تو وہ بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وہ غیر ممالک کی نسوانی ترقی و آزادی کی تعریفیں تو بہت کچھ کرتے ہیں مگر انھیں خیال بھی نہیں آتا کہ اپنے گھر کی ہونہار لڑکیوں کو ویسا بنانے کی کوشش کریں۔ یہ ہے ہمارے ملک و قوم کی حالت۔ یہاں غلامی و زباں بندی کے اٹل قانون پر عمل کیا جاتا ہے۔[۴۶]

بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا

اے بلادِ اسلامیہ میں آزادی کی زندگی بسر کرنے والو ہماری مدد کرو۔ ہمیں غلامی کی جکڑ بندیوں سے خدارا جلد آزاد کراؤ۔ ہم دولت نہیں مانگتے، حکومت نہیں مانگتے۔ بس اپنا جائز حق مانگتے ہیں جو ہمارے اور تمھارے لیے یکساں قابل احترام ہے۔ ہمارے مردوں کو شمشیر سے نہیں بلکہ اپنی تحریر و تقریر سے یہ بتا دو کہ ہمارا بھی کتنا اور کیا حق ہے؟[۴۷]

اس سفر نامہ میں انھوں نے کربلائے معلی نجف اشرف، بیت المقدس اور دیگر مقاماتِ مقدسہ کی زیارتوں اور ان کے تاریخی، سماجی اور ثقافتی حالات بیانیہ انداز میں پیش کیے ہیں۔ اس میں مقدس مقامات کا احوال بھی کافی تفصیل کے ساتھ درج کیا گیا ہے جس سے اس کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔

۶۔ا۔سفر نامۂ عراق از بیگم حسرت موہانی

سفر نامۂ عراق بیگم حسرت موہانی کے دیار مقدسہ کے سفر کی یادگار ہے۔انھوں نے یہ سفر ۱۹۳۶ء میں اختیار کیااور اس سفر کی ایک اہم بات یہ ہے کہ مصنفہ نے اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ خشکی کے راستے سے عراق سے ہو کر حج کی سعادت بھی حاصل کی تھی۔ بیگم حسرت نے اس سفر کے دوران مختلف مقامات سے بہت سے خطوط اپنی بیٹی نعیمہ بیگم کو ارسال کیے تھے جن میں اپنے احساسات و تجربات اور مشاہدات کو تفصیل سے تحریر کیا۔ان کی وفات کے بعد مولانا حسرت موہانی نے ان خطوط کو اردوئے معلیٰ میں سفر نامہ عراق کے نام سے ۱۹۳۷ء میں شائع کیااور پھر بعد میں یہ کتابی صورت میں مولانا حسرت کے دیباچے کے ساتھ شائع ہوئے۔

اس سفر نامے میں ان تمام لوگوں کا بھی ذکر ملتا ہے جن کے ہمراہ بیگم حسرت نے سفر کیااور اس کے علاوہ زیارت گاہوں اور وہاں کی تہذیب و معاشرت کا تفصیلی ذکر اس سفر نامے کی اہمیت کو مزید اجاگر کرتا ہے۔اس سفر نامے کے بارے میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ یوں رقم طراز ہیں کہ نشاط النساء بیگم نے اپنے میاں مولانا حسرت کے ہمراہ ۱۹۳۶ء میں عراق کا سفر کیا تھا۔انھوں نے سفر نامہ عراق قلم بند کرتے ہوئے عراق کے طرزِ تمدن کا گہری نظر سے مشاہدہ کیااور شگفتہ طرزِ بیان اپنایا۔[۴۸]

بیگم حسرت نے ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۶ء تک مولانا کے ساتھ تین حج کیے۔ انھی اسفار میں سے ایک سفر کے دوران لکھے گئے خطوط کو مولانا حسرت نے سفر نامہ عراق کے نام سے مرتب کیا۔اس میں آخری کچھ حصّہ مولانا نے مکمل کیا ہے کیونکہ بیگم حسرت اپنی علالت کی وجہ سے اپنی بیٹی نعیمہ سے خطوط کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکی تھیں۔اس سفر نامے کے متعلق سیّد شفقت رضوی لکھتے ہیں۔

> سفرِ حج کے دوران میں بیگم حسرت اپنی بیٹی نعیمہ بیگم کو تفصیلی خط لکھتی رہیں۔ جن میں سفر کے حالات کے علاوہ جن مقامات پر قیام رہا وہاں کے کوائف بھی درج کیے۔ان خطوط کو مولانا نے مرتب کر کے اردوئے معلیٰ میں ایک تعارفی اور وضاحتی نوٹ کے ساتھ شائع کیا۔ آخری حصہ بوجہ ناسازی طبیعت مکمل نہ ہو سکا تھا۔ مولانا نے جہاں تک کے حالات بیان کیے تھے ان کے بعد کے احوال اجمالی لکھ کر اسے سفر نامہ عراق کی شکل دے دی۔[۴۹]

بیگم حسرت نے سب سے پہلا خط یکم فروری ۱۹۳۶ء کو لکھا جس میں وہ اپنی روانگی سے لے کر ٹرین کی اندرونی حالت کو بھی تفصیلاً بیان کرتی ہیں۔ وہ جس جس مقام سے گذرتی رہیں اس کا ذکر اور خصوصاً شہروں اور ملکوں کی تہذیبی، سماجی اور مذہبی زندگی کو یوں پیش کرتی ہیں۔

> دجلہ پر پل بنا ہے۔ اس طرح سے کہ نیچے برابر ناؤ کی طرح لوہے کی کشتیاں پانی میں لنگر انداز ہیں۔ انھیں پر لمبا چوڑا پل قائم ہے۔ اربعانہ (پل پر) نہیں جاتا۔ موٹریں بے عدد و بے شمار ہیں۔ بازاروں میں ہر طرف دوڑ دھوپ اور آدمیوں کا ہجوم ہر وقت نظر آتا ہے۔ مٹھائیوں کی دکانیں بھی بہت ہیں۔ یہاں خاص و عام، غریب و امیر سب کی ایک پوشش ہے۔ یعنی کوٹ، پتلون، ٹائی، بوٹ، عراقی سیاہ ٹوپیاں اور اس پر سے اوور کوٹ بھی۔ عراقی خوب گورے گورے خوب صورت انسان ہیں۔ بچے بھی اسی طرح سفید روئی کے گالے (جیسے ہوتے ہیں) چوڑے چوڑے چہرے تندرست موٹے تازے۔ ۵۰

اس طرح ان کے حج نامے میں لوگوں کی زبان، عادات واطوار اور کھانے پینے سے لے کر ان کے رسم ورواج کا بھی ذکر ملتا ہے۔ کافی جگہ وہ نہ صرف کھانے کی چیزوں کے بارے میں بلکہ چیزوں کی قیمتیں بھی لکھتی ہیں۔ گوشت کی دکانیں اور میوے کی بھی دکانیں بہت زیادہ ہیں۔ انار ۵ آنے سیر، سرخ و شیریں بڑے بڑے دانے، شاداب خوب ہیں۔ مولی، گاجر، میٹھے نیبو، کھٹے نیبو، کیلا غرض کہ کافی چیزیں ہیں۔ ۵۱

مصنفہ سفر نامہ میں اپنے سفری حالات و مشاہدات بھی تفصیل سے لکھتی ہیں کہ جہاز بیچ سمندر لنگر انداز ہوا اور بڑی بڑی دس پانچ کشتیوں میں مال آیا۔ انار کے بنڈل بہت آئے۔ (سوا آنے) کا ایک انار شیرین انہوں نے بھی لیا۔ سنترے ایک آنے کے تین۔ مرغیاں انڈے وغیرہ بھی آئے۔ یہاں سے بکس انھیں کشتیوں میں اتارے گئے۔ دو لکڑی کے بڑے بڑے بکس جن میں پوری پوری موٹریں بند تھیں، وہ بھی جہاز کے نیچے کے حصے سے زنجیروں میں باندھ کر نکالے گئے اور جس طرح تم نے بھی دیکھا ہو گا کہ سامان لاد لاد کے مشین کے ذریعے اٹھا کر نیچے کشتیوں میں ڈال دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک ایک بکس ایک ایک کشتی پر لادا گیا۔ ۵۲

بیگم حسرت نے بہت سی ایسی معلومات فراہم کی ہیں جس میں خواتین کی دلچسپی زیادہ ہو۔ اس میں نسوانیت کا بھر پور اظہار ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کا بھاؤ اور چھوٹی سے چھوٹی چیز کے بارے میں بتاتی ہیں۔

> ہوٹل بھی جگہ جگہ بہت ہیں۔ان میں کھانا ہر قسم کا اور سستا ملتا ہے۔ دودھ بھی ۲ سیر پر سوں منگوایا تھا، خوب گرم اچھا تھا۔ گوشت گائے کا بھی بہت سستا ہے۔ بھینسیں بھی ہیں، ملائی وغیرہ اسی (کے دودھ) کی بنتی ہے۔ دنبے کا گوشت اور بکری کا بھی، آج کل گراں ہے۔ ۸ آنے سیر چربی بھی بازاروں میں بکثرت (ملتی)۔ پنیر اور کھویا بھی ملتا ہے۔ [۵۳]

مصنفہ نے سفر نامہ میں خاص طور پر ان چیزوں کا ذکر کیا ہے جو اس مقدس مقامات کے سفر میں ضروری ہوتی ہیں اور لوگ اس سے ناواقف ہوتے ہیں۔ لوگوں کی رہنمائی کے لیے مصنفہ نے ایک ایک کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ لوگ اپنا اپنا کھانا انگیٹھیوں میں پکاتے ہیں۔ ہم لوگوں نے بھی کل صبح کو دال ارہر، چاول اور روٹی پکائی۔ شام کو دال، پچ، میل چاول اور آج صبح دال مسور، چاول، روٹی اور آلو کا بھرتا پکایا گیا۔ میری انگیٹھی خوش رنگ کی انگیٹھی اور پتیلیاں وغیرہ استعمال میں ہیں۔ کراچی سے آٹا، گھی، دالیں، مسالہ، چائے، شکر وغیرہ آٹھ روپے کا منگوایا گیا۔ [۵۴] اس سفر نامے کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ

> بیگم حسرت اگرچہ مشرقی وضعداری کی مثال تھیں تاہم ان کے آزادہ خیالی کا پر تو بھی موجود ہے۔ انھوں نے پسماندہ ہندوستان سے باہر نکل کر جب عراق کی نسبتاً ترقی یافتہ شہریت دیکھی تو انگشت بدنداں ہو جانے کی بجائے اس کی تعریف کی۔ ان کا سفر نامہ اس تحسین کا متوازن اور ہموار بیانیہ ہے۔ اس سفر نامے کی صداقت اس کا حسن اور اس کی سادگی اس کا زیور ہے۔ [۵۵]

بیگم صاحبہ خواتین کے حقوق کے لیے بھی سرگرم رہیں۔ وہ جس جگہ بھی گئیں انھوں نے عورتوں کی سماجی و ثقافتی زندگی کا بغور مشاہدہ کیا اور اس حج نامے میں عراق کی عورتوں کے لباس کا نہ صرف حال بیان کیا ہے بلکہ مغربی تقلید کی روش پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ عراق میں مسلمان خواتین پردے کی پابند نہیں رہیں۔ ایک جگہ وہ عورتوں کے لباس کے متعلق لکھتی ہیں۔

> مسلمان اور غیر مسلم عورتوں میں لباس کا فرق صرف اس قدر ہے کہ مسلمان لڑکیاں برہنہ سر ٹیڑھی مانگ نکالے، فراک، گون، موزے پہنے، پنڈلیاں کھلی نظر آتی ہیں۔ یہودی و نصرانی عورتیں بھی بالکل اسی طرح رہتی ہیں مگر وہ اپنے سروں پر چٹائی یا مخمل کی رکابی نما چپٹی سی ٹوپی آدھے سر میں پہنے رہتی ہیں۔ [۵۶]

اس سفر نامے میں انھوں نے کربلائے معلیٰ کی طرزِ معاشرت، سفر کی مشکلات و مسائل اور موسموں کے علاوہ مقاماتِ مقدسہ کی عمارات کا نقشہ بھی کھینچا ہے کہ ہر وقت یہاں سامنے حضرت غوث پاک کا گنبد نیلے رنگ کا نظر آتا ہے۔ اس پر پچی کاری، پتھروں کی رنگ برنگی پھول پتیاں بنی ہیں۔ مسجد سے ملا ہوا بہت بڑا ہال ہے۔ اس کے اندر لکڑی کے منقش دروازے لگے ہیں جس میں قفل اندر اور باہر پیتل کے پڑے رہتے ہیں۔[۵۷]

مصنفہ نے اپنے سفر کے حالات خطوط کی شکل میں پیش کیے ہیں جس میں سفرِ حج اور عراق کی مقدس زیارت گاہوں کا احوال ملتا ہے۔ انھوں نے سادہ بیانیہ میں سفر کے مشاہدات و واقعات کا ذکر کیا ہے جس میں ان ممالک کی تہذیبی و ثقافتی اور سماجی زندگی کی ایک جھلک بھی ملتی ہے۔ یہ سفر نامہ دیارِ مقدسہ کے اہم مقامات کی یادگار ہے۔

۲۔ دیارِ مغرب کے سفر نامے:

سولھویں صدی عیسوی کے آخر میں یورپی سیاحوں نے مشرقِ وسطیٰ اور ہندوستان کے سفر کیے تاکہ وہ ان ممالک اور ان کے باشندوں کے بارے میں واقفیت حاصل کر سکیں اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکیں۔ انیسویں صدی میں ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط اسی سفر کا شاخسانہ ہے۔ ہندوستان میں برطانوی تسلط کے بعد یہاں کے سماجی، اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی نظام میں کئی تبدیلیاں ہوئیں۔ لوگوں میں تعلیم کی طرف رجحان بڑھ گیا۔ اس سلسلے میں خاص طور پر سر سید احمد خان کی تعلیمی کاوشوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے ساتھ ساتھ خواتین کا بھی تعلیم کی طرف رجحان پیدا ہوا اور طبقہ اشرافیہ کی خواتین نے ان مواقع سے خود بھی فائدہ اٹھایا اور تعلیمِ نسواں کے لیے بھی کوششیں کیں۔ ان تمام تبدیلیوں کے اثرات اردو ادب پر بھی پڑے کیونکہ ایک فاتح اور ترقی یافتہ قوم کے عادات واطوار اور آدابِ زندگی میں مفتوح قوم کی دلچسپی ہوتی ہے۔ تعلیم کی وجہ سے معاشرے میں بیداری آئی اور خواتین کو اپنے محدود دائرے سے نکل کر ایک کھلی فضا میں اپنی صلاحیتوں کو منوانے کا موقع ملا اور ساتھ ہی گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرونِ ملک سیاحت کا بھی موقع ملا۔ انھوں نے اپنے سفر کے حالات و واقعات، مشاہدات اور جذبات میں دوسروں کو بھی شریک کرنے کے لیے سفر نامے تحریر کیے۔ جن میں مذہبی سفر ناموں کے علاوہ یورپ کے سفر نامے بھی شامل ہیں۔ اس دور میں لکھے گئے خواتین کے سفر ناموں میں درج ذیل یورپی ممالک کے احوال پر مشتمل ہیں۔

۱۔	سیرِ یورپ	نازلی رفیعہ سلطان	۱۹۰۸
۲۔	سیاحت سلطانی	شاہ بانو بیگم	۱۹۱۵ء
۳۔	زمانۂ تحصیل	عطیہ فیضی	۱۹۲۲ء
۴۔	سفرنامہ یورپ	بیگم ہمایوں مرزا	۱۹۲۶ء

۱۔۲۔ سیرِ یورپ نازلی رفیعہ سلطان

خواتین کے سفر ناموں میں ہر ہائی نس نازلی رفعیہ سلطان کا سفر نامہ سیرِ یورپ کسی مسلمان خاتون کا یورپ کی سیاحت کا اولین سفر نامہ ہے۔ یہ ۱۹۰۸ء میں کتابی صورت میں یونین سٹیم پریس لاہور سے شائع ہوا۔ یہ سفر نامہ ان خطوط پر مشتمل ہے جو نازلی سلطان نے یورپ کی سیر کے دوران اپنی بہن زہرا بیگم فیضی کو لکھے اور انھوں نے ان خطوط کی مدد سے اس سفر نامے کو ترتیب دیا اور شائع کروایا۔ یہ سفر نامہ کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے سلسلہ وار رسالہ عصمت میں شائع ہوتا رہا ہے اور لوگوں نے اسے خوب سراہا ہے۔ ان خطوط کو اسی ترتیب سے اس سفر نامے میں پیش کیا گیا ہے جن تاریخوں سے وہ لکھے گئے تھے۔ پہلا خط ۲۱ اپریل ۱۹۰۸ء کو اور آخری ۱۸ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو لکھا گیا ہے۔ اس سفر نامے کے بارے میں مصنفہ خود سفر نامے کی تمہید میں لکھتی ہیں کہ اصل میں یہ وہ خطوط ہیں کہ جو انہوں نے اپنے بزرگوں کے نام سیرِ یورپ کے حالات لکھے ہیں۔[۵۸] سیرِ یورپ کی تمہید میں مصنفہ نے مختصراً سفر نامے کے متعلق بڑی مفید باتیں کی ہیں جس سے اُن کا مقصدِ سفر بھی پتہ چلتا ہے۔ وہ صرف سیاحت کی غرض سے نہیں گئیں بلکہ برصغیر کی خواتین کے لیے ایک لائحہ عمل لینے گئی تھیں اور انھوں نے بار بار اپنے لفظوں کے ذریعے انھیں جھنجوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس سفر کو اختیار کرنے کا مقصد یورپ کی سیاحت تھا اور یہ سفر تقریباً چھ ماہ کے عرصے پر مشتمل تھا۔ بیگم نازلی کے ہمراہ ان کے شوہر نواب سر سیّدی احمد خان بہادر جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔، علی اصغر بیگ فیضی، عطیہ فیضی، سردار سیّدی حسن، سیّدی سعید اور ڈاکٹر ہاشم لکھانی تھے۔ ان کے علاوہ ایک ملازم اور ملازمہ بھی تھی۔

انھوں نے یہ خطوط ہندوستانی خواتین اور مردوں کے پڑھنے کی غرض سے چھپوائے تھے تاکہ وہ ان کو پڑھ کر یورپ کی سیاسی و ثقافتی، سماجی و معاشرتی زندگی سے آشنا ہو سکیں اور اپنے طرزِ عمل میں تبدیلی لائیں۔ بیگم نازلی نے اس سفر نامے میں جگہ جگہ یورپ کے سماج کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔

> افسوس کہ گھوڑوں کی حالت بہ نسبت لندن کے بہت ہی حقیر ہے۔ یہاں لوگوں کو کتوں پر نہایت وہ پیارا ہے مگر بچوں اور گھوڑوں پر کم ہے۔ عجیب بات ہے کہ اس کا نظام بہتر نہیں جو گھوڑوں کی زندگی صرف ۲ سے ۸ سال کی ہوتی ہے۔ بعد میں کاٹ کے کھایا جاتا ہے کیوں کہ زیادہ کام کرنے کی مجال نہیں۔ تقریباً ۲۴ گھنٹے گھوڑے کام کرتے ہوں گے۔ نہ انسان سوتے ہیں نہ گھوڑے چین پاتے ہیں۔ بہت سی دکانیں سویرے سات بجے بند ہو کر نو بجے کھلتی ہیں۔ پیرس بالکل کھو کھلا شہر ہے۔[۵۹]

بیگم نازلی رفیعہ مختلف رسالوں کی مستقبل کی لکھاری تھیں اور انھوں نے مختلف موضوعات پر متعدد مضامین

تحریر کیے۔ ان کا شمار بیسویں صدی کی تعلیم یافتہ باشعور ادبی خواتین میں ہوتا ہے۔ ان کا یہ سفر نامہ ہمیں بیسویں صدی کے انگلستان کی تہذیبی، سماجی، تمدنی ترقی، علوم زراعت، فنون لطیفہ اور ملکی انتظامی امور سے واقفیت بہم پہنچاتا ہے۔ انھوں نے لوگوں کی دل چسپی کے لیے مختلف مقامات کی تصاویر بھی شامل کر دی ہیں۔

اس سفر نامے یورپ کو روزنامچے کی تکنیک میں لکھا ہے جس میں مصنفہ نے تمام واقعات کو تاریخی ترتیب سے بیان کیا ہے۔ سفر نامے کے آدھے سے زیادہ حصّے میں بحری سفر کا احوال درج ہے اور بحری جہاز کے اندر کی زندگی کے حالات و واقعات پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے۔ جہاز جب روانہ ہوا تو بہت سے لوگوں سے ان کی سلام دعا ہوئی۔ وہ وہاں کی مصروفیات، روزانہ کے معمولات، تفریح طبع کے سامان اور سمندر کا نظارہ اس طرح سے بیان کرتی ہیں۔ "اوپر نیلگوں آسمان، نیچے آبی سمندر۔ ہم گویا تنکوں کی طرح بہہ رہے ہیں۔ ساحل نظر ہی نہیں آتا۔ بس خدا سے لو لگائے بیٹھے ہیں۔ عدن کا انتظار ہے۔ سمندر چپ چاپ ہے۔ جہاز بے حس و حرکت چلا جا رہا ہے۔"[۶۰] باقی سفر نامے میں یورپ کے ممالک کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ مصنفہ کی تحریر میں ایک بات کا افسوس نظر آتا ہے کہ ہندوستان یورپ سے بہت پیچھے ہے اور بعض جگہوں پر وہ موازنہ کرتی بھی دکھائی دیتی ہیں مثلاً وہ روسی عورتوں کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ان میں بھی ہندی عورتوں کا سا حجاب ہے۔ لباس اور زیور بہت سلیقے سے پہنتی ہیں۔ گلے میں واجبی سی موتیوں کی لڑی بھی ہوتی ہے۔[۶۱]

اس سفر نامے کی ایک خوبی تو یہ ہے کہ یہ ہندوستان کی سب سے پہلی خاتون کا سفر نامہ ہے جس نے یورپ کا سفر اختیار کیا اور جو تعلیم یافتہ اور طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ دوسری یہ کہ مشاہدات و تجربات پر نسوانیت پوری طرح غالب ہے۔ مثال کے طور پر وہ خواتین کے لباس اور زیورات پر تفصیلی بات کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ جہاز میں بچوں کے رونے پر غور کرنا اور بچوں کی تربیت کو سراہنا، کھانوں کی تعداد، ذائقے اور تراکیب بھی بیان کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ نازلی رفعیہ سلطان کا مشاہدہ نسوانی دلچسپیوں کے زاویوں کو گرفت میں لیتا ہے اور وہ اشیاء اور مظاہر کو جمالیاتی انداز میں دیکھتی ہیں۔ [۶۲]

سیر یورپ میں مصنفہ نے یورپ کے باشندوں کے ان اوصاف کو پیش کیا جن کی بدولت انھوں نے ترقی کی ہے۔ بڑے بڑے ملکوں کو فتح کیا اور خوب دولت کمائی ہے وہاں کے لوگ بہت محنت کش ہیں اور یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ انھوں نے لندن کے جگہ جگہ ہوٹلوں، شفاخانوں، تھیٹروں، گرجاگھروں، پارکوں کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ ایک جگہ وہ ہوٹل کی تعریف ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

> اپنے کمزور قلم میں وہ روانی کہاں سے لاؤں جو اس کی قدرت کاملہ کا بیان کر سکوں۔ یعنی وہ بیان جو میرے دل میں ہے جس کا پورا اظہار امر محال ہے۔ اس ہوٹل میں کمرے بہت عمدہ ہیں بالکل نئے ڈھب کے فرنیچر سے سجے ہوئے ہیں اور تمام رائج الوقت راحت سامانیوں کے سامان سے آراستہ۔ [۶۳]

انھوں نے یورپ کی سیر کے دوران بہت سی خوبصورت جگہیں دیکھیں۔ راجاؤں، سفیروں، شاہی خاندان سے ملاقاتیں کیں۔ مختلف لوگوں کے ساتھ دعوتوں میں گئیں اور ان تمام مصروفیات کا ذکر بیگم نازلی خطوط کے ذریعے اپنے رشتے داروں تک پہنچاتی رہیں۔ سفر نامے میں مصنفہ نے لندن، پیرس اور ترکی کی عام حالت پر نظر ڈالی ہے اور معمولی سے معمولی واقعہ کو بیان کیا۔ لندن کی بہت تعریف کی ہے اور وہاں کی تہذیب و معاشرت کو اپنے سفر نامے میں پیش کیا ہے۔ ان کی نظر جس جس چیز پر پڑتی ہے وہ حیرتوں کو جگاتی ہے اور شروع سے لے کر آخر تک مصنفہ حیرتوں میں گھری نظر آتی ہیں۔ انہوں نے جگہ جگہ یورپ کی معاشرت اور ہندوستان کی معاشرت کا تقابل کیا ہے۔ وہ ہندوستان کے لوگوں کو اپنے سفر نامے کے ذریعے وہاں کی ترقیاں دکھا کر بیدار کرنا چاہتی ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتی ہیں:

اس ٹرین کو پیرس ایکسپریس کہتے ہیں۔ کاؤنٹ سے معلوم ہوا کہ یہ ٹرین سب سے زیادہ تیز چلنے والی ہے۔ اس لیے اس کے چلانے والے کے اعصاب پر اتنا زور پڑتا ہے کہ منزل مقررہ پر پہنچنے تک تین یا چار بدلے جاتے ہیں اور لوگوں کو دور ہو جانے کو اس لیے کہتے ہیں کہ پہلے پہل جب یہ جاری ہوئی تو لوگ بے خیالی سے نزدیک کھڑے رہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی آدمی ہوا کی لپیٹ اور ٹرین کی کشش سے کھچ کر پہیوں کے درمیان گر پڑے اور کٹ گئے۔ یہ سن کر ہمارے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ [۶۴]

نازلی رفیعہ سلطان نے سفر نامے میں انگریزی معاشرت کو اس انداز سے پیش کیا ہے جس سے اہلِ ہندوستان کو فائدہ ہو اور وہ بھی اپنی تعلیم، صحت، صنعت و حرفت میں ترقی کریں۔ اس سفر نامہ میں فرانس کے شہروں، ٹاوروں، عمارتوں اور گورنمنٹ کے حالات بھی بیان کیے ہیں۔ اس کے ساتھ انگلستان کی عظمت اور وہاں کے باشندوں اور تہذیب کی عکاسی بھی کی ہے۔ یہ سفر نامہ ایک تعلیم یافتہ اور باشعور خاتون کے ان خیالات کو واضح کرتا ہے جو وہ یورپ اور وہاں کی تہذیب و معاشرت اور تمدن کے بارے میں رکھتی تھیں۔ انھوں نے بڑے دلچسپ پیرائے میں تاریخ وار انگریزوں کے حالات قلم بند کیے اور ہندوستان روانہ کرتی رہیں تاکہ ہمارے لوگ اس سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

نو آبادیاتی عہد میں ہر ہندوستانی ایک قسم کی احساس کمتری کا شکار ہو گیا تھا کیوں کہ ایک طرف جب حکومت ہاتھوں سے جاتی رہی جس نے سب کو معاشی، تہذیبی اور سماجی طور پر کنگال کر دیا تھا۔ دوسری طرف نئی تعلیم، سائنسی ایجادات اور نئی تہذیب نے تمام شعبہ ہائے زندگی کو متاثر کیا تھا۔ ان میں یورپ کا سفر کرنے والوں کے پیشِ نظر بنیادی مقصد اہلِ ہندوستان کو یورپ کی انقلابی تبدیلیوں سے روشناس کرانا تھا۔ سیر و سیاحت ثانوی مقصد تھا۔ اس لیے عام طور پر ان سفر ناموں میں مغربی تعلیم کی اہمیت اور ان کے طریقہ تعلیم کو خصوصیت سے پیش کیا گیا ہے۔ جیسے ایک جگہ لکھتی ہیں کہ

کیمبے کے عجائب خانے میں گئے جس کا بیان بہت ہی پر حظ ہے۔ ایک پروفیسر صاحب نے جو مختلف علوم میں ماہر تھے جنھوں نے اپنی تمام دولت اور زندگی اس مقصد کے حاصل کرنے میں صرف کر دی کہ علومِ شرقیہ کو حاصل کر لیں اور اسی بنا پر اور غرض سے یہ نمائش خانہ بنایا ہے۔ اولاً انھوں نے یہ کام کیا ہے کہ مشرقی ملکوں میں برسوں سیر و سیاحت کی پرانی کتابوں کے نمونے بہم پہنچائے۔ [۶۵]

اور لائبریری کے بارے میں وہ لکھتی ہیں کہ

یہ کمرہ کیسا تھا اور کتابوں سے اوپر نیچے تک بالکل بھرپور۔ یہاں سے منظر بھی نہایت عمدہ دکھائی دیتا ہے۔ وہاں سے کتب خانے میں لے گئے، میں کس طرح بیان کروں کہ لارڈوں کے لیے کتب خانہ تھا۔اس طرح بہت سی غلام گردشوں اور گزرگاہوں سے ہوتے ہوئے ہوس آف کامنز کی طرف گئے۔ یہاں کا کتب خانہ بھی بہت بڑا ہے مگر امراء کے کتب خانے کی طرح عالی شان نہیں۔ گو کہ واقعی کام تو یہی لوگ کرتے ہیں۔اب اس حد تک پہنچے۔۷۶

بعض سیاحوں کے سفر نامے مغربی تعلیم وتہذیب، معیشت، معاشرت۔کے حوالے سے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں یورپی ممالک کے طریقہ تعلیم اور تہذیب وتمدن کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے جیسے سفر نامہ یورپ، دنیا عورت کی نظر میں، زمانۂ تحصیل میں نہ صرف مغربی نظامِ تعلیم کو بیان کیا ہے بلکہ ہندوستانی تعلیم وتہذیب اور مغربی تعلیم کا مقابلہ بھی کیا گیا ہے۔اس سے محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت ملک کا تعلیم یافتہ اور باصلاحیت طبقہ تعلیم پر زیادہ زور دے رہا تھا۔سفر نامہ کا بیانیہ سادہ اور عام بول چال کا سا انداز لیے ہوئے ہے کیوں کہ یہ سفر نامہ خطوط پر مشتمل ہے اور یہ خطوط کوئی ادبی خطوط نہیں ہیں بلکہ عام خطوط ہیں جو مصنفہ نے اپنے عزیز و اقارب کو دورانِ سفر تحریر کیے تھے۔اس لیے زبان سادہ ہے۔ کہیں بھی زبان میں تصنع، بناوٹ اور افسانوی انداز نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہے۔اس لیے یہ سفر نامے بے حد اہم ہیں جو اس عہد کے لوگوں کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں۔

۲۔۲۔سیاحت سلطانی از شاہ بانو (میمونہ سلطان)

سیاحت سلطانی بیگم میمونہ سلطان المعروف بہ شاہ بانو کا سفر نامہ ہے۔شاہ بانو ریاست بھوپال کی نواب سلطان جہاں بیگم کے سب سے چھوٹے بیٹے نواب حمید اللہ کی بیوی تھیں۔انھوں نے بتیس (۳۲) اشخاص کے ہمراہ ۱۸اپریل ۱۹۱۱ء کو اپنے سفر کا آغاز کیا اور تقریباً سات ماہ کی سیاحت کے بعد یہ قافلہ وطن واپس پہنچا۔ مصنفہ نے یہ سفر اپنے سسرالی عزیز نواب کرنل محمد عبید اللہ کے علاج کے سلسلے میں اختیار کیا تھا۔اس سفر نامے میں زیادہ توجہ علاج اور بکھنگم پیلس میں ملاقاتوں، دعوتوں پر رہی ہے مگر پھر بھی اس سفر نامے میں بیسویں صدی کے اوائل کا یورپ دکھائی دیتا ہے۔یہ سفر نامہ ۱۹۱۵ء میں سیاحت سلطانی کے نام سے مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوا۔یہ سفر نامہ روزنامچے کی ہیئت میں لکھا گیا ہے۔ بیگم شاہ بانو نے دورانِ سفر اپنے مشاہدات وواقعات کو تاریخ وار ڈائری میں لکھا اور اختتام سفر

پر اسے نواب سلطان جہاں بیگم کی رہنمائی میں ترتیب دے کر کتابی صورت میں شائع کروایا۔ مصنفہ اس سفر نامے کو تحریر کرنے کے حوالے سے نواب سلطان جہاں کی کوششوں کے بارے میں سیاحت سلطانی کے ہدیہ تشکر میں لکھتی ہیں۔

> جن چیزوں کو حضور ممدوحہ نے ملاحظہ کیا جہاں جہاں تشریف لے گئیں جو نئی نئی باتیں معلوم ہوئیں اور ان سب کے متعلق کامل یادداشتیں لکھوادیں اور ان یادداشتوں کو لکھواتے ہوئے ہر ایک بات میرے ذہن نشین بھی کر دی۔[۶۷]

یہ سفر نامہ دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے میں انھوں نے اپنے سفر نامے کا آغاز شکریہ، سفر کرنے کا مقصد، تیاری سفر، وداعی جلسے، روانگی، سفر نامہ بھوپال سے بمبئی تک کا راستہ، جہاز کی حالت، ایک بچے کی موت، عدن میں داخلہ، بحر الاحمر کا موسم، نہر سویز، پورٹ سعید، پیرس، لندن کے مقامات کا بیان ہے اور دوسرے حصّے میں لندن سے روانگی، ترکی کے حالات و مقامات اور واپسی سفر کی روداد بیان کی ہے۔

اس سفر نامہ کے زیادہ تر واقعات نواب سلطان جہان بیگم نے فراہم کیے تھے کیونکہ بہت سی جگہوں پر بیگم شاہ بانو بوجہ پردہ ان کے ہمراہ نہیں جاتی تھیں اور وہ تمام معلومات بیگم نواب انھیں لکھواتی تھیں۔ اس طرح یہ سفر نامہ دیدہ و شنیدہ معلومات پر مبنی ہے۔ کیوں کہ مصنفہ پیرس کی سیر اس لیے زیادہ نہ کر سکی کہ وہاں یہ عام تھا کہ ذرا کوئی مشہور شخص آئے جس سے لوگوں کو ذرا سی بھی دلچسپی ہو تو وہ فوراً اس کی تصویریں لے کر اخبارات میں چھپوا دیتے تھے۔[۶۸]

اس سفر نامہ میں مشاہدات و تجربات کے ساتھ ساتھ یورپی ممالک کی تہذیب و معاشرت اور خاص کر سلطنت برطانیہ کے شاہی خاندان کے متعلق بھی معلومات ملتی ہیں۔ اس سفر نامے کے بارے میں ڈاکٹر فرحت جہاں لکھتی ہیں:

> اس سفر نامے کی زبان قدیم اور سادہ ہے لیکن اسلوب دلکش ہے۔ کہیں کہیں بہت سطحی باتیں ان کی زبان سے نکل گئی ہیں۔ بہت سی چیزوں کے بارے میں انھوں نے جس حیرت کا اظہار کیا ہے کہ قاری خود حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ ایک شاہی خاندان سے وابستہ ہونے کے باوجود ان کو زندگی کے ان لوازمات کے بارے میں علم نہیں تھا۔[۶۹]

سفر نامے میں مصنفہ نے اپنی کم علمی کا بھی سچائی سے اقرار کیا ہے اور جن جن ذرائع سے معلومات حاصل کیں اس کے متعلق بھی لکھا ہے کہ مصنفہ نے نواب سلطان جہاں سے یورپ کے بارے میں اپنی معلومات میں کمی کا ذکر کیا تو انہوں نے اس کمی کو دور کرنے اور ہندوستانی عورتوں کو ایسے دل چسپ حالات سے روشناس کرانے کے لیے مصنفہ کو پیسہ اخبار کے چند نمبر دیے تاکہ وہ ان سے ضروری حالات کا اقتباس کر کے اس سفر نامے میں درج کر دیں۔[۷۰]

سفر نامے میں یورپ کی تہذیبی و سماجی زندگی کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کا ذکر بھی کرتی ہیں۔ یورپ کے ملازموں کے سلیقہ اور صفائی کا موازنہ ہندوستانی خادموں سے یوں کرتی ہیں:

> اول تو ایسے خادم ملتے ہی نہیں جو سلیقہ عقل اور صفائی رکھتے ہوں اور آقا کی مرضی کے مطابق کام کریں۔ اگر مل بھی گئے یا محنت کر کے اور مشکلیں اٹھا کر کسی کو اپنی مرضی کے مطابق بنائیں بھی تو ایسے خدام کی کم یابی کی وجہ سے ان کا دماغ بگڑ جاتا ہے اور ایک عجیب قسم کا غرور پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم جہاں کہیں جائیں گے ہماری قدر ہو گی۔ ان کا یہ خیال پوری طرح اطاعت و فرمان برداری نہیں کرنے دیتا۔ یورپ کے خدام میں شائستگی و صفائی کے ساتھ اطاعت و فرمان برداری نہایت قابل قدر صفت ہے۔[۷۱]

سیاحت سلطانی میں مصنفہ نے یورپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے وہاں کے طرزِ عمل، عمارات، طریقہ ملاقات، وہاں کے باشندوں کا رہن سہن، اُن کے عادات و اطوار اور مذہبی رسوم غرضیکہ ساری تفصیلات اس سفر نامے میں قلم بند کر دی ہے۔ اس سفر نامے کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید یوں لکھتے ہیں کہ وہ سیاحت سلطانی اگرچہ سفر کی تیاری، سامان سفر کی فراہمی، روانگی اور دوران سفر واقعات وغیرہ کو اہمیت دی گئی ہے اور انھیں روزنامچے کے انداز میں قلم بند کیا گیا ہے۔[۷۲]

ان لوگوں نے لندن کے مدارس، شفاخانے، شاہی باغات اور قصرِ بکنگھم میں تاج پوشی کی رسم میں بھی شرکت کی مگر ہر جگہ ہر ہائی نس نواب صاحبہ نے پردے کا خصوصی خیال رکھا۔ ان کے پردے کے بارے میں محمد امین لکھتے ہیں کہ ہر ہائی نس کا سن شریف اُس وقت ۵۴ سال کا تھا۔ اس عمر میں یورپ کی سیاحت کے لیے روانہ ہونا اور پھر وہ بھی مذہب و پردہ کی کامل پابندی کے ساتھ ایک عجیب حیرت ناک امر ہے۔[۷۳]

مصنفہ نے پیرس کے بازاروں اور سڑکوں کا ذکر بھی بڑے ستائشی انداز میں کیا ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی گئیں ہیں انھوں نے ہر چیز کا مشاہدہ گہرائی سے کیا ہے اور ایک جگہ وہ یوں رقم طراز ہیں:

> عموماً پیرس کے بازار نہایت خوش نما ہیں۔ سڑکیں چوڑی ہیں اور صاف دکانیں اپنے سامانوں سے جگمگاتی ہیں۔ دکانوں پر مضبوط شیشوں کے کواڑ لگے ہوئے ہیں تاکہ کوئی چیز نہ جاتی رہے اور روشنی میں سارا اسامان بھی نظر آئے۔ [۴۴]

سفر نامہ میں لندن کے شہروں، عمارتوں اور گورنمنٹ کے حالات بھی بیان کیے ہیں۔ انگلستان کی عظمت اور وہاں کے باشندوں اور تہذیب کا حال بیان کیا ہے۔ دربار شاہی کی کیفیت، وہاں کی تعلیمی حالت کا ہندوستانی تعلیم سے مقابلہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزی سماج کی شائستگی، صفائی اور رکھ رکھاؤ کو بھی سراہا ہے۔ وہاں کی تہذیب سے ہندوستانی تہذیب کا موازنہ کیا ہے۔ ایک جگہ وہ برطانوی شاہی دربار کا نقشہ یوں بیان کرتی ہیں:

> جابجا شاہی عہدہ دار اور محل کے افسر زرق برق لباس پہنے اپنی اپنی خدمت پر معین تھے اور اپنے حد سے دوسرے کی حد تک پونچا دیتے تھے۔ تمام لیڈیاں جو لیوی میں شریک ہونے والی تھیں۔ عمدہ عمدہ لباس سے آراستہ اور بیش قیمت زیورات سے مزین محل میں اِدھر اودھر پھر رہی تھیں۔ محل برقی روشنی جگمگا رہا تھا چھتوں پر سنہری کام تھا جو بجلی کی روشنی میں شعاع نور بنا ہوا تھا۔ دیواروں پر تاریخی تصویریں سلطنت برطانیہ کی عظمت ظاہر کر رہی تھیں۔ نفیس قالین کا مکلف فرش بچھا ہوا تھا۔ سنگ رخام اور سنگ مرمر کے دوہرے ستون جن کے سروں پر طلائی ملمع تھا روشنی میں عجب بہار دکھا رہے تھے۔ [۴۵]

سیاحت سلطانی ایک اہم سفر نامہ ہے۔ یہ ایک تعلیم یافتہ ہندوستانی خاتون کے ان خیالات کو واضح کرتا ہے جو وہ یورپ اور وہاں کی تہذیب و معاشرت کے بارے میں رکھتیں تھیں۔ انھوں نے یورپی سماج، تمدن، ثقافت اور نظام حکومت کی عکاسی اس ڈھنگ سے کی ہے کہ اہل ہندوستان اس سے واقفیت حاصل کر سکیں۔ اس سفر نامے میں آغاز سفر ہندوستان سے یورپی ممالک کے حالات و واقعات ملتے ہیں۔ بیگم شاہ بانو نے جگہ جگہ اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں یورپ اور ہندوستان کی حالت کا مقابلہ بھی کیا ہے۔ اس سفر نامے کا شمار بیسویں صدی کے اہم سفر ناموں میں ہوتا ہے۔

۳۔۲۔زمانۂ تحصیل از عطیہ فیضی

زمانۂ تحصیل بیگم عطیہ فیضی رحمین کی سیر و سفر کی داستان ہے۔انھوں نے یہ سفر یکم ستمبر ۱۹۰۶ء میں شروع کیا اور ۲۷ ستمبر ۱۹۰۷ء میں ختم ہوا۔ان کا یہ سفر یورپ ایک سال اور چھبیس یوم میں ختم ہوا۔ یہ سفر نامہ ان خطوط سے مرتب شدہ ہے جو مصنفہ پہلے روز سے ہی اپنے اہلِ خانہ کے نام، تاریخ وار بھیجتی رہی تھیں۔ان واقعات و مشاہدات، روزمرہ کی روداد کی تفصیل کو ان کی بہن زہرا بیگم فیضی "تہذیب نسواں" میں شائع کرواتی رہی تھیں۔ عطیہ فیضی کا یہ سفر نامہ روزناچے کی شکل میں لکھا گیا ہے اور یہ بہت بعد میں ۱۹۲۱ء میں "مطبع مفید عام آگرہ" نے کتابی صورت میں شائع کیا۔

اس کتابی صورت میں چھپنے والے سفر نامے زمانۂ تحصیل کا دیباچہ مصنفہ کا تحریر کردہ ہے جس میں انھوں نے اپنے یورپ جانے کا مقصد، سفر کے دوران لکھے گئے خطوط کو رسالہ تہذیب نسواں میں شائع کرنے کی وجہ اور پھر بعد میں کتابی صورت میں چھپوانے کے اغراض و مقاصد بیان کیے ہیں۔ وہ روانگی یورپ کے متعلق لکھتی ہیں کہ وہ ۱۹۰۶ء میں گورنمنٹ اسکالرشپ لے کر لندن گئی تھیں۔ان کے سفر کا مقصد یہ تھا کہ معلمہ بن کر وہاں سے واپس آنا اور اپنی ہم وطن بہنوں کی خدمت کرنا تھا۔[۱۷] اس سفر نامہ کا دیباچہ ہی مصنفہ کے سفر کرنے کے مقصد پر روشنی ڈالتا ہے۔اس عہد میں ہندوستان میں بیداریٔ نسواں کی تحریک زوروں پر تھی۔ ہر پڑھا لکھا طبقہ معاشرے میں تعلیم کی کمی کو شدت سے محسوس کر رہا تھا اور اپنی حد تک اس کمی کو دور کرنے میں حصّہ ڈال رہا تھا۔اس دور کی خواتین بھی اس جدوجہد میں کسی سے پیچھے نہ تھی۔انھوں نے ہر پلیٹ فارم سے عورتوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ بیگم عطیہ بھی اس مقصد کو لے کر آگے بڑھیں اور یورپ کی تعلیمی، سماجی و ثقافتی ترقی کے بارے میں معلومات اپنے خطوط کے ذریعے بر صغیر کی خواہش کو روانہ کرتی رہی۔

مصنفہ نے یہ سفر نامہ اپنی نانی بیگم شجاع الدین طیب علی کے نام منسوب کیا ہے۔ایک سو اکیس صفحات پر مشتمل سفر نامے کا زیادہ تر حصّہ تعلیمی اور مجلسی زندگی پر ہونے کے ساتھ یورپ کی تہذیبی و ثقافتی، سماجی و تمدنی اور معاشرتی زندگی کی بھی خوبصورت عکاسی کرتا ہے۔عطیہ فیضی نے وہاں کے نظامِ زندگی کا قریبی مشاہدہ کیا اور ایک ایک چیز کا گہری نظر سے جائزہ لے کر اہلِ ہندوستان سے اس کا موازنہ تاسف و تحیّر سے کیا ہے۔ وہ ہر صورت میں اپنی خواتین کی ترقی اور خوشحالی کی آرزومند تھیں۔اس سفر نامے کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید اظہارِ خیال کرتے ہیں کہ ڈائری کی

تکنیک میں لکھا گیا یہ سفر نامہ مشاہدے کو پہلی نظر ہی میں سمیٹ لینے کی کاوش کرتا ہے اور عطیہ فیضی کے حقیقی اور معصوم تاثر کو سامنے لے کر آتا ہے۔[۷۷]

اس سفر نامے میں ہندوستان کی کئی مشہور شخصیات، سر عبدالقادر شیخ، سید علی بلگرامی، سروجنی داس نائیڈو، ڈاکٹر مختار انصاری، مس کارنیلیا سہراب جی، ڈاکٹر محمد اقبال، بائی ٹاٹا اور علامہ عبداللہ یوسف علی کے ذکر کے علاوہ یورپ کے مختلف مقامات کا دلچسپ احوال ملتا ہے۔ یورپ کی مختلف سیر گاہوں، تعلیمی اداروں، تاریخی مقامات، کتب خانوں اور شفاخانوں کی تفصیلات کو بڑی حیرت اور سادگی سے بیان کیا ہے۔ ایک جگہ ریل گاڑی کا ذکر یوں حیرت سے کرتی ہیں۔

> وہ مجھے ایک نئی چیز میں یہاں بھائی صاحب قمرالدین کے ہاں لے گیا جس کو ٹیوب کہتے ہیں اور میں پہلی ہی دفعہ اس میں سوار ہوئی۔ راستے پر سے ایک بڑے نل کے ذریعے چند قدم زمین اتر کر لفٹ یعنی کل کی نشست میں بیٹھنا پڑتا ہے جو دور تک زمین کے اندر جاتی ہے پھر یہاں ریل آتی ہے۔[۷۸]

اسی طرح سے یورپ کے کتب خانوں کے متعلق لکھتی ہیں کہ جہاں کتب بینی کی جگہ ہے۔ اس کمرے کی زمین موٹے ربڑ کی ہے کہ چلنے میں آواز نہ ہو۔ کمرہ مدّور ہے۔ خاصے ہزار آدمی ایک وقت بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں۔[۷۹] سفر نامے میں مصنفہ نے انگلستان کی ایک ایک چیز اور معمولی سے معمولی واقعے کو بھی ستائشی انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ وہاں کی درس گاہوں کا بیان اپنی تہذیبی بہنوں کی معلومات میں اضافے کے لیے بار بار کرتی ہیں۔ وہ یورپ والوں کی سماجی زندگی سے بھی متعارف کرواتی رہتی ہیں کہ ان کی زندگی بڑی خوشگوار ہوتی ہے۔ ان کے لباس صاف ستھرے اور مکان بھی آرام دہ ہوتے ہیں۔ وہاں تھیٹر، ہوٹل، کلب، شراب خانے بھی بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ان سب کا بیان وہ تفصیلاً کرتی ہیں۔

> یہ اتنا بڑا ہال ہے کہ دس بارہ ہزار آدمی اچھی خاصی طرح بیٹھ کر تماشا دیکھ سکتے ہیں بے حد بڑا ہے وہاں تیس فٹ اونچا ارغنوں رکھا ہوا تھا اور اس کے نیچے اچھا پچی کاری کیا ہوا۔ مشہور گانوں والوں نے ترانہ سازی کی۔[۸۰]

سفر ناموں سے کسی بھی ملک کی تاریخی، سماجی، تجارتی، معاشرتی حالات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے عطیہ فیضی کا زمانۂ تحصیل پڑھیں تو ہمیں لندن، ترکی اور پیرس کے سماج اور ان کی تہذیب سے آشنائی حاصل ہوتی ہے۔ مصنفہ سکالرشپ پر تعلیم حاصل کرنے انگلستان گئیں تھیں تو اس سفر نامے میں تعلیمی فضا کے علاوہ وہاں کی سماجی اور ثقافتی زندگی کے نمونے بھی جابجا جلوہ افروز ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جگہ وہ لکھتی ہیں:

> جتنا باغ میں نے دیکھا اس سے صاف یہ ظاہر ہو گیا کہ انگلستان میں بھی شاید اور کم ایسے باغ ہوں گے۔ ندی پر کشتیاں، ہوس بوٹ وغیرہ جن پر رنگ برنگی مہین لباسوں میں ہفت آرائش مزین، نزاکت میں چور عورتیں پھرتی ہوئیں دکھائی دیتی تھیں۔ جابجا پھولوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ باجا بج رہا تھا۔ چائے نوشی کا بازار گرم ہو رہا تھا۔ [۵۸]

اس سفر نامے میں بھی بیسویں صدی کی دوسری خواتین کی طرح یورپ کی ہر ایک چیز کو سراہا گیا ہے اور اس کے مطالعے سے ہم وہاں کی تہذیب و معاشرت سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔

۴۔۲۔ سفرنامہ یورپ از بیگم صغرا ہمایوں

بیگم صغرا ہمایوں کا یہ سفر نامہ ان کے سفرِ یورپ کے بارے میں ہے۔ ان کا یہ سفر ۲۹ مارچ ۱۹۲۴ء کو حیدر آباد سے پونہ بمبئی کے لیے شروع ہوا اور وہاں سے مارسلز، پیرس، لندن، ہالینڈ، جرمنی، سویٹزرلینڈ اور اٹلی سے ہوتے ہوئے ۳۱ ستمبر ۱۹۲۴ء کو حیدر آباد وطن واپس پہنچنے کی روداد پر مشتمل ہے۔ صغرا ہمایوں کے شوہر کو ڈاکٹر نے دل کا عارضہ بتایا اور علاج کے لیے لندن جانے کے لیے کہا تھا۔ لہٰذا آپ اپنے بھائی، شوہر اور دو ملازمین کے ہمراہ سفر پر روانہ ہوئیں۔ یہ سفر نامہ دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ اس میں صغرا ہمایوں نے یورپی ممالک کے سفر کے دوران درپیش حالات و واقعات کو بیان کیا ہے۔ وہ مختلف ملکوں کی تہذیب و معاشرت عمارتوں، پارکوں، تھیٹروں، تعلیمی اداروں، ہسپتالوں، آب و ہوا، کتب خانوں اور شہروں کی تاریخ بھی ساتھ ساتھ بیان کرتی جاتی ہیں۔

سفر نامہ یورپ ۱۹۲۶ء میں اعظم سٹیم پریس چار مینار حیدر آباد دکن سے شائع ہوا۔ یہ سفر نامہ کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے سلسلہ وار رسالہ تہذیب النسواں میں شائع ہوتا رہا اور ہندوستان کے لوگوں نے اس سفر نامے کو خوب سراہا۔ اس سلسلے میں خود بیگم صغرا لکھتی ہیں:

ہندوستان سے آج ڈاک آئی۔ بہت سے خطوط ملے۔ جناب مولوی ممتاز علی صاحب مینجر تہذیب نسواں کا بھی خط آیا انھوں نے لکھا ہے کہ میں آپ کا شکریہ کسی طرح ادا نہیں کر سکتا۔ آپ نے نہایت عمدہ اور دلچسپ حالات سفر تہذیب کے لیے بھیجے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ اور مضامین بھی آپ بھجوائیں گی۔ [۸۲]

اس سفر نامہ میں دیگر معلومات کے علاوہ مصنفہ کی مختلف موضوعات پر تقاریر بھی ہیں۔ وہ نہ صرف تعلیم نسواں کے لیے آواز بلند کرتی ہیں بلکہ وہ مذہب اسلام کا دفاع بھی کرتی ہیں جیسا کہ وہ سفر نامے میں جرمنی اور ہندوستانی عورتوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ جرمنی کی خواتین مردوں کے شانہ بشانہ مزدوری کرتی ہیں۔ وہ صرف اپنے ملک و قوم کی ترقی اور خوشحالی کے لیے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتی ہیں اور ہم اور ہماری قوم اب تک غلامی میں پڑی ہوئی ہے۔ [۸۳]

بیگم صغرا ہمایوں ہندوستان کی خواتین کی تعلیم اور اُن کے حقوق کی جنگ لڑتی رہی ہیں۔ انھوں نے اپنی ہر تحریر میں تعلیم کی افادیت پر زور دیا ہے۔ اس سفر نامہ میں بھی مصنفہ نے اپنے حالاتِ سفر بیان کرنے کے ساتھ جگہ جگہ اپنے ملک کی حالت کا یورپ کے شہروں کی حالت سے موازنہ کیا ہے اور مصنفہ نے اپنی قوم اور ملک کی بھلائی کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے انگلستان کی تعلیم، وہاں کا طرزِ تمدن، حسنِ معاشرت اور وہاں کی ہر قسم کی ترقیات کے اسباب جاننے کی کوشش بھی کی اور پھر اپنے مضامین کے ذریعے اہلِ ہندوستان کو روشناس کرایا۔

بیگم صغرا کا یہ سفر نامہ بیسویں صدی کے اوائل کا اہم سفر نامہ ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے سفر کے حالات و واقعات اور مشاہدات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یورپ کی تہذیب، وہاں کے طریقۂ معاش، لوگوں کی عادات واطوار پر روشنی ڈالی ہے۔ مصنفہ انگریزی تہذیب و معاشرت سے متاثر دکھائی دیتی ہیں اور ان کی یہ خواہش تھی کہ ہندوستانی بھی انگریزی علوم و فنون سیکھیں اور اپنی زندگی کو خوشگوار بنائیں۔ مصنفہ فرانس کے نظامِ تعلیم کے متعلق لکھتی ہیں کہ وہاں فرانس میں ہزاروں ایسے مدرسے ہیں جہاں تعلیم حاصل کرنا لڑکے اور لڑکیوں پر لازمی ہے اور ان سے کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ ان مدرسوں کے تمام خرچے حکومت خود برداشت کرتی ہے۔ [۸۴]

صغرا ہمایوں کے اس سفر نامہ یورپ کے بارے میں ڈاکٹر فرحت جہاں لکھتی ہیں:

انداز سنجیدہ اور زبان سادہ ہے۔ اس سفر نامے میں انھوں نے جن ممالک کا سفر کیا ان کے تہذیبی اور تاریخی پس منظر پر توجہ دی ہے اور اپنے مشاہدات کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے وہاں کے کتب خانے دیکھے اور وہاں کی عمارتوں کا مشاہدہ کیا جن کی تفصیلات کتاب میں موجود ہیں۔ انھوں نے قیصرِ جرمنی کے مکان کو دیکھا اور اس کی جزئیات سے قارئین کو آگاہ کر دیا ہے۔ انھوں نے وہاں کے رہن سہن کے طریقے، موسم، پر فضا مقامات اور معاشرتی معاملات و مسائل کو زیادہ دلچسپی سے بیان کیا ہے۔ [۸۵]

سفر نامے میں لندن کے مختلف مقامات اور جگہوں کی بڑی تعریف کی گئی ہے اور وضاحت سے تمام معلومات فراہم کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتی ہیں کہ برٹس میوزیم کا کتب خانہ بہت بڑا ہے۔ یہ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہاں ہر زبان کی کتابیں موجود ہیں اور فارسی کتابوں کی بھی بہت قدر ہے۔ [۸۶]

سفر نامہ یورپ میں مصنفہ نے لندن اور جرمنی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ وہاں کے بازار، مینار، طرزِ عمارت، طریقہ ملاقات، وہاں کے باشندوں کے رہنے سہنے کا ڈھنگ اور طرز تمدن غرضیکہ ساری تفصیلات سفر نامے میں قلم بند کر دی ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ وہ لکھتی ہیں کہ ہر سال مئی کے مہینہ میں چار روز تک کشتیوں کی شرطیں ہوا کرتی ہیں۔ انگریز کھیل کود کے بہت شایق ہیں اسکولوں اور کالجوں میں اقسام کے کھیل ٹینس، کرکٹ، ہاکی، گالف، فٹ بال وغیرہ کھیلتے ہیں جس سے ورزش ہوتی ہے۔ [۸۷]

اس سفر نامے کے بارے میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے لکھا ہے کہ صغریٰ بیگم حیاؔ کا سفر نامہ یورپ جو انتہائی باریک بینی کے ساتھ مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا موازنہ کرتا ہوئے خالصتاً نسوانی اپروچ کا حامل ہے۔ [۸۸] صغرا ہمایوں نے اپنے سفر نامے میں یورپی زندگی کے مختلف گوشوں کو پیش کیا ہے۔ ان کے اس سفر نامہ یورپ سے انگلستان، فرانس اور جرمنی کے لوگوں کی جیتی جاگتی تصویریں مرتب ہوتی ہیں۔ ایک جگہ مصنفہ یوں لکھتی ہیں:

> یہاں کی ہائیکورٹ کی عمارت بہت عالیشان ہے اور ڈاک خانے کی عمارت بھی بے نظیر ہے۔ یہاں سے ہم وکٹ پلائس اسکویر میں آئے۔ یہ عجیب جگہ بنی ہوئی ہے۔ بیچ میں ایک گول بے انتہا بڑا حوض ہے اس میں فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ فوارے عجیب طرح سے بنائے گئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی مورتیں اور شیر ببر کی مورتیں بنائی ہیں۔ ان مورتوں کے منہ میں سے پانی حوض میں گر رہا ہے۔ [۸۹]

مصنفہ نے اپنے سفر نامہ یورپ میں جہاں یورپی ممالک کے لوگوں کی زندگی کی رنگینی و دل کشی کو پیش کیا ہے وہاں انگریزوں کی بہت زیادہ تعریف بھی کرتی ہیں اور یورپی اقوام کی تعریف و ستائش کے ساتھ ہی ہندوستانی معاشرے کی زبوں حالی انہیں دکھی بھی کرتی ہیں۔ سفر نامے میں کہیں جگہ دونوں تہذیبوں اور سماج کا موازنہ صرف اس خیال سے کرتی ہیں تاکہ اہل ہندان ترقی یافتہ اقوام سے سبق سیکھیں اور اپنی حالت کو سدھاریں۔ بیگم صغریٰ کا یہ سفر نامہ تعلیم ہنداور شعور ہند کے مقصدی نقطہ نظر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

۳۔اندرونِ ہندوستان کے سفر نامے:

بیسویں صدی میں مذہبی اور یورپی سفر ناموں کے علاوہ بہت سے اندرونِ ہند کے سفر نامے بھی تحریر کیے گئے ہیں یعنی کہ وہ سفر نامے جو اندرونِ ملک کی سیر وسیاحت پر مشتمل ہیں۔ان سفر ناموں کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کے ذریعے ہندوستان کی تہذیب و معاشرت، رسم ورواج، مناظرِ فطرت، تاریخی معلومات اور یہاں کی عمارتوں کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہیں کیونکہ ہر علاقہ اور شہر ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اور ایک ملک کے باشندے ہونے کے باوجود ہم دوسرے علاقوں کے رسم ورواج، لباس اور کھانے پینے کی اشیاء سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ ایسے سفر نامے ہمیں ایسی بہت سی معلومات دیتے ہیں جن سے ہم ناواقف ہوتے ہیں۔ اندرونِ ہندوستان کے سفر ناموں میں زیادہ تر شہروں کی تاریخ، عمارات، بازاروں، چشموں، زراعت، صنعت و حرفت، مزاروں، درسگاہوں کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ یہ تمام سفر مختلف مقاصد مثلاً تجارت، تحصیلِ علم، زیارتوں یا سرکاری ضرورتوں کے تحت کیے گئے ہیں۔ان سفر ناموں کا مختصر جائزہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

۱۔	سفرنامہ پونہ و مدراس	بیگم صغرا ہمایوں	۱۹۱۸ء
۲۔	روزنامچہ بھوپال، آگرہ و دہلی کے حالات	بیگم صغرا ہمایوں	۱۹۲۰ء
۳۔	رہبر کشمیر	بیگم صغرا ہمایوں	۱۹۳۱ء

۱۔۳۔روزنامچہ بھوپال،آگرہ و دہلی کے حالات از بیگم صغرا ہمایوں

اردو سفر نامہ کے اولین دور کی سفر نامہ نگار خواتین میں صغرا ہمایوں کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اپنے ان سفر ناموں میں ایک طرف تو مغربی تہذیب و معاشرت کی تصویر کشی کی ہے اور دوسری طرف مقامی سفر ناموں میں برصغیر پاک و ہند کی صورت حال، حقوق نسواں اور بیداریٔ نسواں کے لیے کی گئی جد وجہد کو بیان کیا ہے۔ ایسے ہی ایک سفر کا احوال انھوں نے اپنی تصنیف روز نامچہ بھوپال، آگرہ و دہلی کے حالات میں نہایت دلچسپ اور سبق آموز پیرائے میں بیان کیے ہیں۔ وہ سفر نامہ ابتدائی دور کے سفر ناموں میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بیگم صغرا نے اپنا یہ سفر ایک خاص مقصد کے تحت کیا تھا۔ چونکہ وہ ایک سماجی تحریک کی رکن تھیں اور ان کا اثر سارے ہندوستان کے مسلم گھرانوں تک تھا۔ ان کا یہ سفر ہندوستان کی عورتوں سے رابطے کی ایک صورت تھا۔ بیگم ہمایوں نے اپنا سفر ۲۳ مارچ ۱۹۱۸ء کو شروع کیا تھا اور انھوں نے یہ سفر نامہ روز نامچے کی صورت میں یکم دسمبر ۱۹۲۰ء میں حیدر آباد دکن سے شائع کیا۔ وہ ٹرین کے ذریعے آل انڈیا لیڈیز کانفرنس میں شرکت کے لیے بھوپال روانہ ہوئیں۔ ان کے اس سفر میں مسز خدیجہ جنگ، مسز سیّد امیر حسن صاحبہ اور بیرسٹر ہمایوں مرزا شامل تھے۔ اگرچہ اس سفر میں بیگم ہمایوں ملیریا کے بخار میں مبتلا تھیں مگر انھوں نے یہ سفر بڑی ہمت و عزم کے ساتھ کیا۔

صغرا ہمایوں مرزا نے بھوپال، آگرہ اور دہلی کا یہ سفر بیگم بھوپال کی دعوت پر آل انڈیا لیڈیز کانفرنس میں شرکت کے لیے اختیار کیا۔ اس کے علاوہ وہ مسلم گھرانوں کی عورتوں سے رابطہ بھی کرنا چاہتی تھی تاکہ ان علاقوں میں عورتوں کو منظم کر کے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا جا سکے اور ان شہروں میں انجمن خواتین دکن کی طرز کی ایک انجمن قائم کرنا بھی ان کا مقصد تھا۔ انھوں نے بھوپال میں عورتوں کے جلسے سے خطاب کیا اور انھیں انجمن خواتین کی غرض و غایت بتانے کے ساتھ ساتھ انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اب متحد ہو کر اپنے حق کے لیے آواز بلند کریں۔ بیگم صغرا عورتوں کی فلاح و ترقی کے لیے جوش و جذبہ رکھتی تھیں اور مخلوق خدا کو ہر وقت فائدہ پہنچانے کے لیے کوشاں رہتی تھیں۔ اس سفر نامہ میں وہ خدا سے ان الفاظ میں دعا گو ہیں کہ خدا کرے ہمارا بھوپال جانا کار آمد ہو۔ ہماری قوم کو ہم سے فیض پہنچے۔ میں خدا سے ہمیشہ دست بدعا رہتی ہوں کہ مجھ سے مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچے۔ [۹۰]

اس سفر نامے میں انھوں نے تین شہروں کی سیاحت کی اور سفر بھوپال میں مختلف کانفرنسوں کی روداد، نامور خواتین سے مختلف مسائل پر گفتگو، بیگم بھوپال سے ملاقات، بھوپال کے مختلف حالات اور اس کی تاریخی حیثیت کا بیان ملتا ہے۔ سفر آگرہ میں تاج محل کی تاریخی اہمیت، مغل شہنشاہوں کے حالاتِ زندگی، اکبر کے مقبرہ کی تفصیل اور اس کے شاندار عہد حکومت کو بیان کیا ہے، دہلی کے سفر میں حضرت خواجہ سلیم اللہ چشتی، جہانگیر کی ولادت، قطب مینار کی تعمیر، ہمایوں کا مقبرہ، حضرت نظام الدین اولیاء، حالات جامع مسجد، حالات لال قلعہ، مختلف لوگوں کی تقاریر اور دہلی کے تاریخی حالات کی تفصیل ملتی ہے۔ یہ سفر نامہ تاریخی معلومات کے حوالے سے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس سفر نامے میں بیگم ہمایوں مرزا نے بیگم بھوپال سلطان جہاں کی عورتوں کے لیے کی گئی کاوشوں کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ انھوں نے بیگم بھوپال سے ان کے محل میں ملاقات بھی کی اور ان سے ملک کی صورت حال اور خواتین کی حالت زار کے بارے میں کھل کر اظہار خیال کیا۔ وہ بیگم بھوپال کے رکھ رکھاؤ، نرمی، فیاضی اور بھوپال کے قصرِ شاہی کی تزئین و آرائش سے بہت متاثر ہوئیں۔ سفر نامہ میں بھوپال کے دربار کی منظر کشی پیش کرتی ہیں۔

> سنا جاتا ہے کہ بھوپال میں شاہی ایوانوں میں سب سے بڑا مکان یہی ہے گویا صدر منزل اسم با مسمیٰ ہے۔ بہر حال صدر منزل کے سب کمروں میں دربار ہال بڑا ہے اس پر مستزاد اس کی سجاوٹ اور آراستگی "نور علے نور"، تمام سبز سرخ و زرد کا شانی محل کا فرش جس پر کارچوبی کا کام کیا ہوا تھا۔ چاروں طرف سونے چاندی کی کرسیاں رکھی تھیں۔ بیچ میں ایک چوبی تخت تھا جس پر کارچوبی مسند بچھی تھی اس پر ایک بڑی سی گنگا جمنی کام کی زرنگار کرسی صدر نشین کے لیے رکھی گئی تھی۔ غرض اسی مقام کی دلکش سجاوٹ کی وجہ سے وہ مقام چوتھی کی دلہن معلوم ہوتا تھا۔[۱۹]

اس سفر نامے میں بہت سی نامور خواتین بیگمات بھوپال، بیگم صاحبہ زنجیرہ، زہرہ فیضی صاحبہ، بیگم سربلند جنگ، مسز خواجہ عبدالمجید، فاطمہ آرزو بیگم صاحبہ، مسز سروجنی نائڈو، نواب قیصر دلہن صاحبہ، مسز جمشید، خورشید بیگم صاحبہ، مسز راشد لطیف کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ بیگم صغرا نے اپنے سفر نامے میں مستقبل کی (اس وقت کی) پیش گوئی ان الفاظ میں کی ہے:

مولوی صاحبان میرے خیالات کو دیکھ کر کیا ریمارک کرتے ہیں مگر میں کسی ریمارک سے نہیں ڈرتی۔ کلمہ حق کے کہنے میں مجھے کوئی باک نہیں ہے گو اس وقت نہ سہی مگر ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ میرے خیالات موجودہ کے موافق ہی عمل ہوگا اس وقت گو میں نہ رہوں گی لیکن میرے خیالات اگر صفحۂ قرطاس پر رہ گئے تو اس زمانے والے کلمہ خیر سے مجھے یاد تو کریں گے۔ [۹۲]

بیگم صغرا ایک مہذب اور روشن خیال خاتون تھیں انھوں نے غلط قسم کے عقائد کے خلاف آواز بلند کی۔ وہ اپنے عہد کے بعض اہم سماجی اور تہذیبی مسائل سے بخوبی آگاہ تھیں ان میں سے ایک مسئلہ عورتوں کا مروجہ پردہ تھا جو کہ تعلیمی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ تھا۔ وہ اسلامی پردے کی قائل تھیں اور پردے کو ایک مہذب لباس کا نام دیتی تھیں لیکن وہ ہر گز یہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں کہ پردے کے نام پر عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں قید رکھا جائے۔ چنانچہ مروجہ پردے کے خلاف انھوں نے ایک ریزولیوشن پاس کروائی اور پردے کے متعلق اپنے دلائل کو قرآنی آیات سے پر زور بنا کر پردے کی تاریخی حالت پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔ وہ اپنی تقریر میں کہتی ہیں کہ میں یہ نہیں مانتی کہ یورپی ممالک کی طرح ہندوستانی عورت کو بھی بے پردگی و آزادی مل جائے۔ [۹۳] اسی طرح ایک اور جگہ پردے کے متعلق قرآنی حکم بتاتی ہیں:

پردہ کے متعلق جو حکم قرآنی سے ظاہر ہوتا ہے وہ اسی قدر ہے اور جس کے الفاظ یہ ہیں۔ وقل للمومنت یغفضن ابصار ھن ویحفظن جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان عورتوں سے کہہ کہ اپنی آنکھیں بند کریں اور اپنی حفاظت کریں۔ مردوں کے لیے بھی اسی طرح کا حکم ہے۔ قل للمومنین یغفظو من ابصار ھم یحفظو یعنی کہ مسلمان مردوں سے کہ اپنی آنکھیں بند کریں اور اپنی حفاظت کریں۔ اس سے ظاہر ہے کہ مرد و زن دونوں کے لیے ایک ہی قسم کا حکم ہے۔ آنکھیں بند رکھنے سے غرض اسی قدر ہے کہ بدنیتی سے نظر غیر محرم عورت نہ ڈالے اور نہ مرد عورت پر ڈالے۔ [۹۴]

بیگم صغرا ہمایوں تعلیم نسواں کی پُر زور حامی خاتون تھیں۔ انھوں نے ساری زندگی ایسی جد و جہد میں بسر کی کہ خواتین اپنے حقوق کو جانتے ہوئے زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھیں۔ اس کے لیے انھوں نے علمی اور قلمی جہاد کیا۔ سفر نامہ بھوپال میں بھی وہ خواتین کی تعلیم کے مسئلہ کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ گورنمنٹ کو لازم ہے جس

طرح لڑکوں کی تعلیم کی جانب متوجہ ہے۔ لڑکوں کی تعلیم کا بھی خیال کرے اور ہر بڑے شہر میں مدرسہ نسواں کھولے اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک یونیورسٹی جدا قائم کی جائے۔[۹۵]

اسی طرح ایک اور ریزولیوشن میں مسز سر بلند جنگ نے استدعا کی کہ لیڈی ڈاکٹروں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لیے ان کی تعلیم کا زیادہ انتظام کیا جائے اور زنانہ ہاسپٹل کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ بیگم ہمایوں کانفرنس کی کاروائی بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ گورنمنٹ سے استدعا کی جائے کہ لیڈی ڈاکٹروں کی تعداد میں افزائش کرنے کے لیے لیڈی ڈاکٹروں کی تعلیم کا زیادہ انتظام کیا جائے اور زنانہ ہاسپٹل کی تعداد بڑھائی جائے۔[۹۶]

اس سفر نامہ میں بیگم صغرا نے اپنی کانفرنس کا احوال بتانے کے علاوہ بہت سی معلومات بھی دی ہیں۔ ان کی نظر نہ صرف اپنے کام پر تھی بلکہ انھوں نے ساتھ ساتھ بہت سے واقعات، ملاقات اور سیر کے دوران میں جس جس جگہ گئیں اور لوگوں سے ملیں ان سب کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ قلعہ بھوپال کو دیکھتے ہوئے انھوں نے وہاں ایک نادر و نایاب قرآنی نسخہ دیکھا۔ اس کو دیکھ کر انھوں نے اپنی حیرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

> یہاں ایک کلام مجید نایاب زمانہ ہے۔ دو گز لانبا اور ڈیڑھ گز عریض ہے سات حصوں پر منقسم ہے۔ حروف بہت بڑے بڑے ایک رحل پر جو تقریباً تین گز طویل ہو گی۔ صرف ایک حصّہ اس پر رکھا ہے جس کو ہم چار آدمیوں نے مل کر کھولا۔ با معنی اور قلمی ہے اس کی جلد چاندی کی بہت خوبصورت بنی ہوئی ہے اور الماری میں علیحدہ رکھی ہوئی ہے۔ سنا گیا ہے کہ سرکار عالیہ کے جدا اعلےٰ نے اس کلام مجید کو کسی ایرانی سے لیا تھا اور دو لاکھ ہدیہ دیا۔ سات اونٹوں پر سات جلدیں آئی تھیں۔[۹۷]

یہ سفر نامہ ایسی معلومات بھی فراہم کرتا ہے جو صرف تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ اس میں انھوں نے اردو ادب کے قاری کے لیے ہندوستان میں مختلف حملہ آوروں کے حملے، مغل بادشاہوں کی آمد، ان کے حالاتِ زندگی، ان کے کارنامے، تاریخی عمارات، واقعات اور مقبروں کے متعلق بھی معلومات فراہم کی ہیں۔ ایک اور جگہ وہ ممتاز محل اور شاہ جہان کی قبر کے بارے میں لکھتی ہیں:

گنبد کے نیچے ممتاز محل کی قبر ہے اس سے ملی ہوئی شاہجہاں کی قبر ہے دونوں قبریں سنگِ مرمر کی ہیں جن کے چاروں طرف سنگِ مرمر کی باریک جالیاں ہیں مزار پر دو قرآن خوان رہتے ہیں۔ ممتاز محل کی قبر پر تھوڑے سے موتیا کے پھول پڑے ہوئے تھے جو کسی نے تھوڑی دیر پیشتر چڑھائے ہوں گے لیکن تعجب یہ کہ شاہ جہاں کی قبر پر ایک پھول بھی نہ تھا۔[98]

صغرا ہمایوں نے اس سفر نامہ میں حضرت خواجہ سلیم اللہ چشتی سے اکبر شہنشاہ کی عقیدت و محبت کو بیان کیا ہے۔ ان کی بدولت شہزادہ جہانگیر کی ولادت ہوئی اور جہانگیر کا نام خواجہ سلیم اللہ سے عقیدت کی بنا پر مرزا سلیم رکھا۔ اس کے علاوہ قطب مینار کے بارے میں کہتی ہیں کہ یہ قطب الدین ایبک نے تیار کروایا تھا اور دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔ اس مینار کے علاوہ دوسرے میناروں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ مغل فنِ تعمیر کے متعلق انھوں نے جابجا بہت سی مفید معلومات بھی فراہم کی ہیں۔ سفر نامہ میں وہ ایک جگہ رقمطراز ہیں:

وہاں سے ہمایوں کا مقبرہ دیکھنے کے لیے ہم سب گئے، یہ بہت عالیشان عمارت ہے بہت سے سلاطین مغلیہ بیگمات شاہی خاندان و اعزائے خاندان تیموریہ یہاں مدفون ہیں۔ بعضوں کے نام جو دریافت میں آسکے وہ یہ ہیں۔ فرخ سیر، جہاندار شاہ، عالمگیر ثانی، شاہ عالم ان کی بیوی قدسیہ بیگم۔ ہمایوں کی بیگم، حاجی بیگم اور ان کی بہن کا مزار بھی یہیں ہے۔ کھلے ہوئے چبوترے پر بھی بہت سی قبریں ہیں اور نگ زیب کے بھائی دارا شکوہ مرزا مراد و شاہ شجاع کی قبریں مرزا رفیع الدولہ اور رفیع الدرجات کی قبریں جو چند دنوں کے لیے دہلی کے تخت پر بٹھائے گئے۔[99]

یہ پورا سفر نامہ مغلیہ سلاطین کی تاریخی معلومات سے بھرپور ہے۔ صغرا ہمایوں نے ان کو بیان کرتے ہوئے تاریخ اور سنہ کا خیال بھی رکھا ہے اور اس سفر نامے کو پڑھتے ہوئے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم خود اُس عہد کی یادگار کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے تاریخی معلومات بھی بڑے لطیف انداز میں بیان کی ہیں جنھیں پڑھتے ہوئے بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا بلکہ انھوں نے سیر ہی سیر میں مغلیہ عہد اور ان کی یادگاروں کی تصویر کشی کی ہے۔ انھوں نے بڑی روانی اور آسان اردو الفاظ کے ساتھ ساتھ بہت سے انگریزی الفاظ کو بھی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ انھوں نے اپنے اس سفر نامے میں مغلیہ عہد کی تاریخ کو محفوظ کرنے کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ بہت

سے ایسے واقعات جن سے ایک عام قاری ناآشنا ہے دورانِ سیر وہ بھی بیان کرتی گئی ہیں مثال کے طور پر انھوں نے شہنشاہ بابر کا محبت بھرا واقعہ کچھ یوں بیان کیا ہے۔ واقعہ کچھ طویل ہے مگر دلچسپی سے بھرپور ہے۔

> کچھ عرصہ کے قیام کے بعد ہمایوں کو بہت تیز بخار آیا۔ بابر نے معالجہ کی غرض سے آگرہ پاس بلا لیا۔ حاذق اطبائے وقت نے معالجہ میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا لیکن مرض بڑھتا گیا۔ جوں جوں دو کی۔ بابر نے عاجز و پریشان ہو کر اپنے ندما سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ کونسی تدبیر کی جائے کہ ہمایوں مرزا کو شفا ہو۔ میر ابوالبقا نے جو ایک فاضل زبردست تھا عرض کی کہ جب دوا کارگر نہ ہو تو دعا کرنی چاہیے اور جو شے مریض کو پیاری اور عزیز ہو اس پر سے صدقہ کرنا چاہیے۔ بادشاہ نے کہا کہ ہمایوں کو سب سے زیادہ عزیز میں ہوں میں اس پر سے فدا ہوں گا چنانچہ مریض کے پلنگ کے گرد تین دفعہ جس طرح صدقہ ہوتے ہیں پھرا اور دعا کی کہ باری تعالیٰ میں اس کا فدیہ ہوں اس کے عوض مری جان لے اور اسے بخش دے۔ یہ عجیب واقعہ ہے کہ مغل بابر کی اس حرکت کے ہمایوں کی حالت زو بہ اصلاح ہوتی گئی اور بابر اُسی وقت سے مبتلائے بخار ہوا۔[۱۰۰]

بیگم صغرا ہمایوں نے اپنے سفر نامے میں آل انڈیا لیڈیز کانفرنس کی کاروائی، تقاریر، آگرہ اور دہلی میں انجمن خواتین کے قیام کی کوششوں، مغلوں کی تاریخ، دہلی، بھوپال، آگرہ کا جغرافیہ بیان کیا ہے بلکہ انھوں نے ان علاقوں کا رہن سہن، عورتوں کے زیورات کی اقسام اور یہاں کے لوگوں کے ناک و نقشہ کو بھی اپنے خوبصورت انداز سے بیان کیا ہے۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ بیگم صغرا کی معلومات بہت وسیع تھی اور ان کی ہر چیز پر گہری نظر تھی۔ وہ دلی کے لوگوں کے بارے میں لکھتی ہیں:

> دلی کے دیسی لوگوں کا رنگ عموماً صاف کھلا ہوا ہوتا ہے۔ گوری رنگت کی بی بیوں کی کمی نہیں ہے اور چہرے بھی ان کے تروتازہ۔ عام صحت بھی اچھی ہوتی ہے۔ دکن و مدراس صوبہ بہار کے باشندوں کی طرح لاغر و گندمی رنگ کے نہیں ہوتے ہیں۔ قد و قامت میں بھی دلی کے باشندے بلند و بالا توانا و فربہ ہوتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا تکیہ کلام اچھی بات ہے خاص و عام سب کی زبان پر یہ لفظ چڑھے ہوئے ہیں۔[۱۰۱]

بیگم صغرا نے مسلمان عورتوں کی زبوں حالی اوران کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی، وہ عورت اور مرد کے درمیان مساوات پر یقین رکھتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ عورت اگر تعلیم یافتہ ہو گی تو وہ اپنی نسل کے اندر بھی اخلاقیات اور آزادی کا مفاہیم واضح کر سکے گی۔ وہ تعلیمِ نسواں اور حرّیت نسواں کی بھرپور حامی تھیں اور تعلیم کو انسان کی بنیادی ضرورت تصور کرتی تھیں۔ وہ اسلام میں عورت کی تعلیم کی اہمیت سے آگاہ تھیں اس لیے اکثر مقامات پر کی گئی تقاریر اور اپنی تحریروں میں اسلامی آیات کو حوالے کے طور پر استعمال کیا کرتی ہیں وہ تعلیمِ نسواں کے فروغ کے لیے ہندوستان کے مختلف حصوں میں گئی اور جلسے منعقد کروائے جس میں انھوں نے اپنی تقاریر کے ذریعے خواتین میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ سفر نامہ لحاظ سے بڑی اہمیت اور دلچسپی سے بھرپور ہے۔

۲۔۳۔سفرنامہ پونہ و مدراس از بیگم صغرا ہمایوں مرزا

سفرِ ہندوستان کے اسفاد میں سے ایک اہم سفر پونہ و مدراس کا ہے۔ بیگم صغرا کے ان تمام اسفار سے ایک تو ان کی سیاحت سے دلچسپی ظاہر ہوتی ہے اور دوسرا اس نو آبادیاتی عہد میں برصغیر کی خواتین میں سیاسی، تعلیمی شعور بیدار کرنا نمایاں ہے۔سفرنامہ پونہ و مدراس بیگم سیّد ہمایوں مرزا کا لکھا ہوا سفر نامہ ہے۔ وہ ۱۹اا گست ۱۹۱۶ء میں پونہ، وقار آباد، گلبرگہ شریف گئیں اور وہاں کے سماجی و ثقافتی احوال اپنے اس سفر نامے میں قلم بند کیے۔

اس سفر میں ان کے ہمراہ بیرسٹر ہمایوں مرزا، بیگم صغرا کی چھوٹی ہمشیرہ، رشتے میں بھائی (مرزا محمد رضا سلمہ) اور چند ملازمین تھے۔ بیگم صغرا دورانِ سفر وہاں کے حالات اور ہر مقام کی تفصیل لکھ کر رسالہ ظل السلطان (بھوپال) میں شائع کرواتی رہیں اور بعد میں ۱۹۱۸ء میں اسے کتابی صورت میں شائع کیا۔

انھوں نے یہ سفر رشتے داروں کے اصرار پر کیا اور ان سے ملاقات کی۔ اس طرح ان کا یہ سفر ذاتی نوعیت کا اور سیاحتی مقاصد کا حامل ہے۔ اس سفر نامے کا دیباچہ مصنفہ کے احساس کا ترجمان ہے۔ اس لیے میں اس کو یہاں رقم کرنا ضروری سمجھتی ہوں تاکہ اُن کے الفاظ سے اس سفر نامے کو مرتب کرنے اور دیگر اہم باتوں کا پتہ چلے۔ وہ دیباچے میں لکھتی ہیں:

پونہ و مدراس وغیرہ کا جب میں نے سفر کیا تو وہاں کے حالات لکھ کر رسالہ ظل السلطان کو جو بھوپال سے شائع ہوتا ہے میں نے بھیجے تھے چنانچہ سلسلہ وار کئی نمبروں میں شائع ہوتے رہے مگر اب میرے دوستوں اور عزیزوں کی باصرار خواہش ہوئی کہ ان حالات کو جو کئی نمبر میں نکلے اور منتشر ہیں ایک جگہ جمع کر کے مثل سفر نامہ عراق عرب کے چھپوادوں۔ [۱۰۲]

سفر کے احوال بیان کرنے سے پہلے وہ اللہ، محمد، علی، فاطمہ، حسن، حسین اور پھر بسم اللہ لکھتی ہیں۔ اس کے بعد وہ سفر اختیار کرنے کی وجہ بیان کرنے کے بعد اپنی روانگی کی تاریخ بتاتی ہیں۔ ان کا قافلہ بذریعہ ٹرین روانہ ہوتا ہے وہ جہاں جہاں بھی گئے وہاں کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ ان کا یہ علاقائی سفر نامہ نوآبادیاتی عہد کے ہندوستان، معاشرے اور تہذیب و ثقافت کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتا ہے جس میں تاریخ بھی ہے، موسموں کا احوال بھی، صنعتوں کا عروج بھی، رسوم، واقعات بزرگانِ دین کی مرقع کشی، تہذیبوں کی رنگارنگی اور زبان کے بارے میں بھی معلومات درج ہیں۔

اس سفر نامے میں بیگم ہمایوں نے شہروں، تفریح گاہوں، مزاروں کا حال بیان کرنے کے علاوہ ہندوستان کی تہذیب اور یہاں کے لوگوں کے رسم و رواج پر روشنی ڈالی ہے۔ ہندوستان کے پہاڑ، دریا اور وادیوں کی عظمت بیان کی ہے تاکہ وہ لوگ جو ہندوستان کے دوسرے شہروں کے بارے میں ناواقف ہیں ان کے لیے یہ سفر معلومات فراہم کر سکے۔ وہ ایک رسم کا یوں ذکر کرتی ہیں کہ جس وقت گاڑی سے میں اتری بعوض تیل ماش وغیرہ دکھانے اور وارنے کے ایرانی دستور کے موافق ایک کشتی میں کلام مجید ایک آئینہ تھوڑے سے پھول رکھ کر میری ایک عزیزی کھڑی ہو گئی اور مجھے کشتی کے نیچے سے گزرنے کے لئے کہا۔ [۱۰۳]

مصنفہ نے اپنے سفر نامے میں ہندوستان کے شہروں کی تاریخ پر زیادہ زور دیا ہے وہ جس جس علاقے میں گئیں وہاں کی ایک ایک چیز کا بیان ایسے کرتی ہیں کہ قاری خود کو وہاں گھومتا پھرتا محسوس کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان شہروں کو آباد کرنے والے لوگوں کا ذکر ایسے کرتی ہیں کہ تاریخ سے واقف ان سے بڑھ کر کوئی اور نہیں۔ ان کی اس صلاحیت کو سراہے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ مدراس کی تاریخی حیثیت یوں بیان کرتی ہیں:

مدراس کوئی شہر نہیں ہے ایسٹ انڈیا کمپنی نے مدراس پر ۱۶۶۳ء میں قبضہ کیا اور یہاں ایک تجارتی منڈی قائم کی۔ ایک سال بعد ایک قلعہ مسمّٰی بہ فورٹ سینٹ جارج تعمیر کیا جس میں وقتاً فوقتاً ترمیم و

ترقی ہوتی رہی۔ حیدر علی نایک اور ان کے بیٹے ٹیپو سلطان سے اور کمپنی سے برابر لڑائیاں ہوتی رہیں۔
ایک جنگ میں حیدر علی نے کمپنی مذکور کو شکست فاش دی۔[۱۰۴]

ایک اور شہر کے بارے میں لکھتی ہیں:

> والٹیر ایک جزیرہ نما مقام ہے جس کو انگریزوں نے چالیس بیالیس سال کا عرصہ ہوا کہ آباد کیا۔ اس کے تین جانب خلیج بنگالہ کی چھوٹی بڑی اونچی نیچی بہت سی پہاڑیوں پر انگریزی وضع کے بنگلے اور کوٹھیاں ہیں جن میں عموماً یورپین اشخاص رہتے ہیں۔[۱۰۵]

مصنفہ جس بھی شہر کی سیاحت کرتی ہیں اس کے بارے میں معلومات دینے سے پہلے اس کی تاریخ بتانا ضروری سمجھتی ہیں۔ یہ خوبی ان کے تمام سفر ناموں میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنے روزمرہ کے احوال کا ذکر کرتی ہیں۔ وہ نظامِ زندگی میں صنعت و حرفت کی اہمیت سے بھی بخوبی آگاہ ہیں اس لیے یہ پہلو بھی ان کے سفر نامے میں نمایاں ہے وہ ہر علاقے کی صنعتوں کا بھی بیان کرتی ہیں کہ صنعت و حرفت بھی پونہ کی قابل تعریف ہے۔ پیتل کے برتن نہایت عمدہ بنتے ہیں ساڑیاں بہت نازک اور باریک ہوتی ہیں۔ چاندی کا کام بہت صفائی سے بنتا ہے۔ مٹی کے کھلونے لکھنو وغیرہ کی طرح بنائے جاتے ہیں۔[۱۰۶] ایک اور شہر کی صنعت کے متعلق لکھتی ہیں:

> اسحاق پٹن میں بعض صنعتیں نایاب اور لایق قدر ہوتی ہیں۔ صندل کی لکڑی کے سینگ کے اور ٹورٹویس کے یعنی کچھوے کی پیٹھ کی ہڈی کی صندوقچے و قلمدان، سگرٹ اور سگار کیس، دندان کا نہایت نازک اور باریک جالیوں کا کام قابل دید بناتے ہیں۔[۱۰۷]

مصنفہ نے جہاں دیگر حالات و واقعات پر روشنی ڈالی ہے وہاں انھوں نے تعلیم گاہوں کی صورت حال بھی بیان کی ہے۔ خاص طور پر مسلمان لڑکیوں میں تعلیم کی کمی پر وہ دل گرفتہ نظر آتی ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتی ہیں کہ وہاں کے مسلمانوں کی حالت مالی اور تعلیمی دونوں حیثیت سے ابتر ہے۔ مسلمان لڑکیوں کے لیے دو زنانہ مدرسے ہیں۔ چونکہ مسلمانوں کی تعداد کم ہے اس لیے لڑکیوں کی تعداد بھی کم ہے اس پر مستزاد شوق تحصیل علم ندارد۔ انہوں نے دونوں مدرسے جا کر دیکھے تھے۔[۱۰۸] بیگم صغرا مدراس کے تعلیمی نظام کا احوال یوں دریافت کرتی ہیں:

میں نے حکیم صاحب سے پوچھا اس میں مسلمان طلبا کتنے ہیں حکیم صاحب نے کہا دو تھے اب تو ایک بھی نہیں ہی میں نے کہا اس کا مجھے بہت افسوس ہے کیونکہ ہندوؤں کو چاہیے اپنے مسلمان بھائیوں کو اپنے ساتھ برابر رکھا کریں ان کو ترغیب دیں۔[۱۰۹]

ہندوستان کی مشہور و معروف شخصیتوں کا ذکر بھی اس سفر نامے میں ملتا ہے۔ جیسا کہ مسز آغا شمس الدین شاہ (ہز ہائی نس سر آغا خان کی عم زاد) مسز متھرا داس، لیڈی جگ موہن داس، لیڈی آغا خان، مسز مہر علی، مسز نصیر الدین، راجہ پری لال آنر بیل، مسٹر رفیع الدین، مسٹر گھاس والا بیرسٹر، مسٹر محمد علی صاحب، آغا ابو القاسم، سر سیّد علی امام، مسٹر سیّد حسن امام، مولوی وحید الزماں خان صاحب المخاطب بہ وقار نواز جنگ بہادر (مصنف انوار اللغات) حضرت محمد اسحاق مدنی اور خاص طور پر اردو ادب کے ایک صوفی شاعر حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز علیہ الرحمۃ کے متعلق ایک اہم ترین واقعہ ملتا ہے جس سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان کے سفر ناموں میں ایسی نایاب اور مفید سماجی و ثقافتی معلومات ملتی ہیں جو تاریخی کتب میں بھی کم یاب ہو گئی ہیں۔ ان کے سفر نامے بہت سے پہلوؤں سے اہمیت رکھتے ہیں۔

۳۔۳۔ رہبر کشمیر از بیگم صغرا ہمایوں مرزا

بیگم صغرا ہمایوں مرزا کا ایک اہم سفر نامہ رہبر کشمیر ہے۔ یہ ایک مقامی سفر کی روداد ہے جو انھوں نے خصوصی طور پر اپنی ہندوستانی خواتین کی بہبود و ترقی کے مقصد سے لکھا ہے۔ وہ سفر کی شوقین تھیں اور خواتین کے لیے ایک نرم گوشہ رکھتیں تھیں۔ وہ اردو ادب کی نامور مصنفہ ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ حقوقِ نسواں اور تعلیمِ نسواں کے لیے آواز بلند کی اور خواتین کو آگاہی دینے اور انھیں بیرونی حالات و واقعات سے روشناس کروانے کے لیے بہت سے سفر نامے تخلیق کیے ہیں۔

ان کا یہ سفر کشمیر ۸ جولائی ۱۹۲۸ء اور اسلامی مہینے کی مناسبت سے ۱۸ محرم کو شب کے نو بجے سکندر آباد کے ریلوے اسٹیشن سے شروع ہوا۔ ان کے ہمراہ بیرسٹر صاحب (شوہر ہمایوں مرزا) بھائی حیدر علی مرزا اور دو ملازم تھے۔ انھوں نے یہ سفر بیرسٹر ہمایوں مرزا کے ڈاکٹر کے مشورہ تبدیلی آب و ہوا کی خاطر کیا اور انھوں نے تقریباً پانچ مہینے سفر میں گزارے۔ ان کا یہ سفر کشمیر ۸ جولائی ۱۹۲۸ء کو شروع ہوا اور ۱۹ دسمبر ۱۹۲۸ء کو ختم ہوا۔ یہ سفر نامہ روزنامچے کی

ہیئت میں لکھا گیا ہے۔ مصنفہ نے اپنی سیاحت کی تفصیل تاریخ وار بیان کی ہے اور کوشش کی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تاریخی، معاشی، سماجی اور ثقافتی معلومات مہیا کریں۔

یہ سفرنامہ رہبر کشمیر ۱۹۳۱ء میں اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر چار مینار حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔ اس کا خوبصورت دیباچہ جناب عبدالماجد دریابادی نے تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

کہاں حیدرآباد اور کہاں کشمیر! مشرق و مغرب کا نہ سہی، شمال و جنوب کا فرق! اور یہ عورت ذات کے لیے۔ لیکن جو بلند ہمت خاتون یورپ تک سفر کر چکی ہیں، ان کے لیے اس فاصلہ کی کیا حقیقت تھی۔ کوئی چار سال ہوئے اور اپنے شوہر کے ہمراہ وہ کشمیر گئیں اور واپس آئیں۔ لاہور، دہلی، اجمیر، علی گڑھ، وغیرہ راستے میں پڑتے رہے۔ جو کچھ ان کی آنکھوں نے اور دل کی آنکھوں نے دیکھا، اپنے لطف میں ان اوراق کے ذریعہ سے وہ اپنے بھائیوں اور بہنوں کو بھی شریک کر رہی ہیں۔ [۱۱۰]

اور اس سفرنامہ کا ریویو ملک الشعراء استاد حضرت حافظ جلیل احمد نے ان الفاظ میں لکھا ہے:

شروع میں جو بسیط مقدمہ ہے صرف اس کے دیکھنے سے کشمیر کا پورا مرقع آنکھوں کے سامنے کھچ جاتا ہے۔ حالات پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ نگار نے کشمیر کے اعلیٰ مناظر اور مشہور مقامات کو سطحی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ تمام جزئیات پر گہری نظر ڈالی ہے۔ بیان بہت سلجھا ہوا اور زبان بہت پاکیزہ۔ میں قابل مصنفہ کو اس کامیاب تصنیف پر مبارکباد دیتا ہوں۔ [۱۱۱]

اس سفرنامے کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس کے شروع میں مصنفہ بیگم صغرا ہمایوں کی اس تخلیق پر مولانا سید علی حیدر صاحب نے یہ اشعار کہے ہیں:

لکھا صغرا ہمایوں میرزا نے بہت تفصیل سے کشمیر کا حال
زباں اُن کی ہے موجِ آبِ کوثر قلم اُن کا ہمایوں فر ہما بال
عبارت ہے کہ تصویریں کھنچی ہیں مطابق کس قدر ہے حال سے قال
یہی کشمیر کا جغرافیہ ہے یہی کشمیر کے تاریخی احوال
وہ جھیل اس کی سمندر آسمانی پہاڑ اس کے بلند اور چرخ تمثال

وہ طغیانی وہاں کی ندیوں کی   کریں جو نوح کے طوفاں کو پامال[۲۱]

رہبر کشمیر کا مقدمہ بیگم صغرا نے ان الفاظ سے شروع کیا ہے کہ قبل اس کے کہ میں اپنے حالیہ سفر وسیاحت کشمیر جنّت نظیر کے حالات وواقعات اپنی ڈائری (روزنامچہ) میں سے نقل کروں اور ایک کتاب کی شکل میں پبلک کے سامنے پیش کروں یہ مناسب خیال کرتی ہوں کہ مختصر طور پر کشمیر کے جغرافیائی وتاریخی حالات اور وہاں کی قدرتی خوبیوں کا بھی کچھ تذکرہ کروں۔[۳۱]

اس مقدمے کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے کیوں کہ مصنفہ نے سیاحت کشمیر کا احوال بیان کرنے سے پہلے کشمیر کے جغرافیہ، تاریخ، اسلامی عہد حکومت، کشمیر کی قدرتی خوبیاں اور کشمیر کے آنے جانے کے راستے کے متعلق بھرپور معلومات فراہم کی ہیں اس سے مصنفہ کی معلومات اور دلچسپی کی داد دینا پڑتی ہے۔

کشمیر، لاہور، راول پنڈی، ٹیکسلا، امرتسر، دہلی، علی گڑھ اور اجمیر شریف کے بارے میں اتنی جامع معلومات دینے میں خواتین میں بیگم صغرا کو اولیت حاصل ہے۔اس سے پہلے کشمیر کے بارے میں کسی خاتون نے اگر سیاحت نامہ تخلیق بھی کیا ہے تو نہایت مختصر اور معلومات بھی سرسری بہم پہنچائی ہیں۔

بیگم صغرا نے سکندر آباد سے اپنے سفر کا آغاز کیا اور مختلف شہروں سے ہوتے ہوئے کشمیر پہنچے۔راستے میں اور کشمیر میں وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں سے بھی ملے اور ان ملاقاتوں کا ذکر بھی سفر نامے میں کیا ہے۔مثال کے طور پر ان میں یہ معروف شخصیات شامل ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال
۲۔ مولوی ممتاز علی
۳۔ سر محمد شفیع
۴۔ امتیاز علی تاج
۵۔ خواجہ حسن نظامی
۶۔ بیگم راشد الخیری
۷۔ سید حسن جلالی

۸۔ مولابخش

بیگم صغرا ایک اچھی شاعرہ بھی تھیں۔انھوں نے اس سفر نامے میں اپنی اس شاعرانہ طبیعت سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ہمیں نثر کے ساتھ ساتھ شاعری سے بھی لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔جیسا کہ انھوں نے سفر کے دوران ملکہ نور جہاں کا مقبرہ دیکھنے کی آرزو میں یہ نظم لکھی اور اس نظم کے بارے میں وہ لکھتی ہیں کہ انھوں نے دورانِ سفر محمد اقبال کو یہ نظم دکھائی اور انھوں نے پسند فرمائی۔[۱۴] نظم کے اشعار کچھ یوں ہیں:

اے خوشا وقت کہ ہوں آج میں آئی لاہور — میری دیرینہ تمنا مجھے لائی لاہور
مرقد نور جہاں دیکھنے کی خواہش تھی — آرزو ہو گئی پوری مرے خالق دل کی
زندگی میں تھی تیرے نور سے دنیا تاباں — بعد مرنے کے ہے لاہور اسی سے رخشاں[۱۵]

سفر نامے میں وہ کشمیر کی سماجی و ثقافتی کیفیت و حالات بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ کشمیر بہت خوبصورت جگہ ہے اور وہ وہاں کے مندروں دھرم داد مندر اور مندر کھیر بھوانی میں بھی گئیں اور ان میں سے ایک مندر کی منظر کشی یوں کی ہے:

> بہت بڑا باغ ہے بیچ میں ایک حوض ہے۔اس کے سامنے مندر ہے۔اس حوض کے اندر ایک چشمہ ہے ہر وقت پانی ابلتا رہتا ہے ہزاروں پھول پانی پر پڑے تھے جو پوجا کر کے ڈال دیئے جاتے ہیں۔گھڑوں میں دودھ لالا کر اسی حوض میں ڈالتے ہیں۔[۱۶]

سفر نامے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کشمیریوں کی زبان اور لباس اس وقت کیسے تھے۔صغرا ہمایوں مرزا نے ایک ایک بات پر نظر رکھی ہے اور کوئی بھی پہلو تشنہ نہیں رہنے دیا۔وہ کشمیری زبان کے بارے میں لکھتی ہیں کہ یہاں کی بولی کشمیری ہے جو فارسی و سنسکرت سے مل کر ایک خاص زبان ہو گئی ہے۔چند باتیں کشمیری لکھتی ہوں۔بھائی کی جگہ (بابو چھ) لوگ ہیں (لوگ چھ) لڑکے تھے کی جگہ (لگت اُسی) شاید ہو گا (شاید سا)۔[۱۷]

انھوں نے کشمیر نہ صرف کشمیر کے تاریخی مقالات، مزاروں، مسجدوں بلکہ کشمیر میں موجود باغوں کے متعلق بھی خوبصورت منظر کشی کی ہے۔بیگم صغرا نے کشمیر کے نشاط باغ کی سیر کی اور اس کی خوبصورتی سے متاثر ہوئیں۔انھوں نے اس کے علاوہ نسیم باغ، نگینہ باغ اور بادام باغ کے متعلق بھی بتایا ہے:

> اس باغ کے چار تختے ہیں جو ایک دوسرے سے بلندی پر درجہ بدرجہ اونچا ہے۔ آخری طبقہ سب سے اونچا ہے ہر طبقہ میں الگ الگ قسم کے پھول ہیں اور فوارے اور آبشار ہیں۔ آخری درجہ عین دامن کوہ میں ہے جہاں ایک چھوٹا سا مکان بھی ہے۔[۱۱۸]

رہبر کشمیر میں مغلوں کی سلطنت، عروج و زوال اور تاریخی واقعات کے علاوہ انگریز حکمرانوں کی آمد کے متعلق بھی معلومات ملتی ہیں۔ اس سفر نامے میں لاہور، راول پنڈی اور ٹیکسلا کے حالات، لاہور میں ان کی دعوتوں کا احوال اور قلعہ لاہور کی یادگار سیر بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ وہ ریشم کے کیڑے کے بارے میں بھی معلومات دیتی ہیں کہ مصنوعی طریقے سے ریشم کیسے حاصل کیا جاتا ہے اور کیڑوں کی افزائش کے طریقے بھی بتاتی ہیں:

> وہ دیکھا جہاں ریشم نکلتا ہے اور تیار ہوتا ہے وہ گرنی دیکھی روزانہ چھ سو آدمی کام کرتے ہیں۔ عورتیں ایک طرف بیٹھی کیڑوں کے گھر چن رہی تھیں۔ تین قسم کے انڈے ہوتے ہیں۔ ان کی قیمت بھی اس لحاظ سے ہوتی ہے۔ جب یہ انڈے یعنی کیڑے کے گھر ضرورت سے زیادہ ہو جاتے ہیں تو انھیں کشمیر سے یورپ بھجوا دیے جاتے ہیں۔[۱۱۹]

بیگم صغرا اس سفر نامے میں ہر جگہ بہت مصروف نظر آتی ہیں۔ ان کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جس میں وہ مصروف عمل نہیں۔ وہ جس شہر بھی جاتی ہیں وہاں پر خواتین کے حقوق کی بیداری اور تعلیم کے لیے بھی کوشاں رہی ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے تقاریر بھی کیں اور پردے کے متعلق بحث و مباحثہ بھی ملتا ہے۔ اس سفر نامے میں جگہ جگہ وہ تہذیب نسواں اور عصمت (رسائل) کے ساتھ رابطے میں رہیں اور ان کے ساتھ خط و کتابت اور انھیں مسلسل مضامین لکھ کر بھیجتی رہیں۔ انھوں نے اس سفر نامے رہبر کشمیر کو بھی ان رسائل میں سلسلہ وار شائع کروایا۔ بیگم صغرا کے سفر نامے سے بیسویں صدی کے کشمیر اور دیگر علاقوں کی ثقافتی، معاشرتی اور تاریخی بہت سی اہم معلومات ملتی ہیں جسے پڑھ کر ان کی دلچسپیوں اور جدوجہد کی داد دینا پڑتی ہے۔ ان کی زندگی سے مسلسل حرکت اور پُر عزم ارادوں کا درس ملتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد امین زبیری مارہروی،حیات سلطانی، ص۲۳۸۔

۲۔ قدسیہ قریشی،اردو سفرنامہ انیسویں صدی میں، ص۶۵۔

۳۔ محمد شہاب الدین،اردو میں حج کے سفرنامے، ص۶۵۔

۴۔ نواب سلطان جہاں بیگم، حیاتِ سکندری، ص۱۵۴۔

۵۔ محمد شہاب الدین،اردو میں حج کے سفرنامے، ص۶۵۔

۶۔ رضیہ حامد،نواب سلطان جہاں بیگم، ص۵۳۔

۷۔ رضیہ حامد،نواب سلطان جہاں بیگم، ص۵۲۔

۸۔ محمد شہاب الدین،اردو میں حج کے سفرنامے، ص۶۵۔

۹۔ محمد امین زبیری مارہروی،بیگمات بھوپال، ص۵۱۔

۱۰۔ نواب سلطان جہاں بیگم، حیاتِ سکندری، ص۱۰۲۔

۱۱۔ نواب سلطان جہاں بیگم، حیاتِ سکندری، ص۲۴۷۔

۱۲۔ محمد شہاب الدین،اردو میں حج کے سفرنامے، ص۱۲۸۔

۱۳۔ نواب سلطان جہاں بیگم،روضۃ الریاحین، ص۲۔

۱۴۔ محمد امین زبیری مارہروی،حیات سلطانی، ص۲۳۴۔

۱۵۔ بیگم سربلند جنگ بہادر،دنیا عورت کی نظر میں،(دہلی: خواجہ برقی پریس، ۱۹۱۰ء)، ص۱۵۔

۱۶۔ ایضاً، ص۱۷۔

۱۷۔ ایضاً، ص۱۲۶۔

۱۸۔ مرزا حامد بیگ،اردو سفرنامہ کی مختصر تاریخ، ص۶۹۔

۱۹۔ بیگم سربلند جنگ بہادر،دنیا عورت کی نظر میں، ص۱۶۔

۲۰۔ ایضاً، ص۱۳۰۔

۲۱۔ ایضاً، ص۸۹۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۲۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۴۰۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۰۰۔

۲۵۔ صغرا ہمایوں، سفرنامہ عراق۔(حیدر آباد: مطبع نظام دکن، ۱۹۱۵ء)، سرِ ورق۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۳۵۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۶۸۔

۳۱۔ انور سدید، اردو ادب میں سفرنامہ، ص ۴۸۳۔

۳۲۔ صغرا ہمایوں، سفرنامہ عراق، ص ۶۸۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۸۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۴۵۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۶۶۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۴۸۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۲۹۔

۳۸۔ محمودہ عثمان حیدر، مشاہدات بلاد اسلامیہ، (کراچی: مشہور آفسٹ پریس، ۱۹۶۲ء)، ص ۱۱۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۳۔

۴۰۔ انور سدید، اردو ادب میں سفرنامہ، ص ۵۰۱۔

۴۱۔ شبلی نعمانی، معارف، مشمولہ محمودہ عثمان، مشاہدات، ص ۷۰۔

۴۲۔ محمودہ عثمان، مشاہدات بلاد اسلامیہ، ص ۱۷۔

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۱۷۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۲۳۔

۴۵۔ ایضاً، ص۱۳۷۔

۴۶۔ ایضاً، ص۱۳۹۔۱۴۰۔

۴۷۔ ایضاً، ص۵۶۔

۴۸۔ حامد بیگ، مرزا، اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ، ص۸۶۔

۴۹۔ سیّد شفقت رضوی، بیگم حسرت موہانی: حیات و سیرت، ص۸۵۔

۵۰۔ ایضاً، ص۱۱۱۔

۵۱۔ ایضاً، ص۱۱۰۔

۵۲۔ ایضاً، ص۱۰۵۔

۵۳۔ ایضاً، ص۱۱۱۔

۵۴۔ ایضاً، ص۱۰۲۔

۵۵۔ انور سدید، اردو ادب میں سفرنامہ، ص۲۴۷۔

۵۶۔ سیّد شفقت رضوی، بیگم حسرت موہانی: حیات و سیرت، ص۱۱۹۔

۵۷۔ ایضاً، ص۱۱۸۔

۵۸۔ نازلی رفعیہ سلطان، سیر یورپ، (لاہور: یونین ایٹم پریس، ۱۹۰۸ء)، ص۱۔

۵۹۔ ایضاً، ص۱۳۱۔

۶۰۔ ایضاً، ص۱۵۔

۶۱۔ ایضاً، ص۵۲۔

۶۲۔ انور سدید۔ اردو ادب میں سفرنامہ۔ ص۱۹۹۔

۶۳۔ ایضاً، ص۱۹۶۔

۶۳۔ ایضاً، ص۱۹۴۔

۶۵۔ نازلی رفعیہ سلطان، سیر یورپ، ص۱۶۳۔

۶۶۔ ایضاً، ص۴۲۔

۶۷۔ شاہ بانو، سیاحت سلطانی، (آگرہ: مطبع مفید عام، ۱۹۱۵ء)، ص۶۔

۶۸۔ ایضاً،ص۴۹۔

۶۹۔ فرحت جہاں،بیسویں صدی میں خواتین کی غیر افسانوی نثر: ایک مطالعہ، ص۱۲۳۔

۷۰۔ شاہ بانو،سیاحت سلطانی،ص۷۰۔۷۱۔

۷۱۔ ایضاً،ص۶۹۔

۷۲۔ انور سدید،اردو ادب میں سفر نامہ،ص۲۰۲۔

۷۳۔ محمد امین،مارہروی،بیگمات بھوپال،ص۱۳۳۔

۷۴۔ شاہ بانو،سیاحت سلطانی،ص۵۶۔

۷۵۔ ایضاً،ص۶۱۔

۷۶۔ عطیہ فیضی،زمانۂ تحصیل،(آگرہ:مطبع مفید عام،۱۹۲۱ء)،ص دیباچہ۔

۷۷۔ انور سدید،اردو ادب میں سفر نامہ،ص۱۹۹۔

۷۸۔ عطیہ فیضی،زمانۂ تحصیل،ص۷۸۔

۷۹۔ ایضاً،ص۷۶۔

۸۰۔ ایضاً،ص۶۲۔

۸۱۔ ایضاً،ص۱۲۸۔

۸۲۔ صغرا ہمایوں،سفر نامہ یورپ(حصہ دوم)،(حیدر آباد دکن:اعظم اسٹیم پریس،چار مینار،۱۹۲۶ء)، ص۸۶۔

۸۳۔ ایضاً،ص۱۹۲۔

۸۴۔ ایضاً(حصّہ اوّل)،ص۱۲۲۔

۸۵۔ فرحت جہاں،بیسویں صدی میں خواتین کی غیر افسانوی نثر : ایک مطالعہ،ص۳۴۔

۸۶۔ صغرا ہمایوں،سفر نامہ یورپ،ص۱۳۴۔

۸۷۔ حامد بیگ،مرزا،اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ،ص۸۰۔

۸۸۔ صغرا ہمایوں مرزا،سفر نامہ یورپ،ص۱۳۵

۸۹۔ شفیع عقیل،زندگی پھر کہاں،بک ہوم،(لاہور:۲۰۰۶ء)،ص۹

۹۰۔ سیمیں فضل ثمر،ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی ناولوں کا حصہ،ص۲۵۶

۹۱۔ بیگم ہمایوں مرزا،روزنامچہ سفر بھوپال و آگرہ و دہلی کے حالات،(دکن:انجمن خواتین،۱۹۱۸ء)،ص۲

۹۲۔ ایضاً،ص۶

۹۳۔ ایضاً،ص۴

۹۴۔ ایضاً،ص۶

۹۵۔ ایضاً،ص۹

۹۶۔ ایضاً،ص۱۰

۹۷۔ ایضاً،ص۳۰

۹۸۔ ایضاً،ص۴۱

۹۹۔ ایضاً،ص۶۰

۱۰۰۔ ایضاً،ص۶۲

۱۰۱۔ ایضاً،ص۷۱

۱۰۲۔ صغرا ہمایوں،سفر نامہ پونہ مدراس۔مقدمہ۔

۱۰۳۔ ایضاً،ص۲۔

۱۰۴۔ ایضاً،ص۳۷۔

۱۰۵۔ ایضاً،ص۲۷۔

۱۰۶۔ ایضاً،ص۵۔

۱۰۷۔ ایضاً، ص ۵۲۔

۱۰۸۔ ایضاً، ص ۳۳۔

۱۰۹۔ ایضاً، ص ۳۲۔

۱۱۰۔ ایضاً، ص ۵۲۔

۱۱۱۔ عبدالماجد دریابادی، رہبر کشمیر (دیباچہ)، ص ا

۱۱۲۔ ایضاً، رہبر کشمیر (ریویو)، ص ا

۱۱۳۔ ایضاً، ص ا

۱۱۴۔ صغرا ہمایوں، رہبر کشمیر (مقدمہ)، ص ۳

۱۱۵۔ ایضاً، ص ۱۹

۱۱۶۔ ایضاً، ص ۹۲

۱۱۷۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۱۱۸۔ ایضاً، ص ۱۰۴

۱۱۹۔ ایضاً، ص ۶۱

باب پنجم

خواتین سفر نامہ نگاروں کے امتیازی خصائص:

تہذیبی و تمدنی مظاہر

باب پنجم

خواتین سفر نامہ نگاروں کے امتیازی خصائص:

تہذیبی و تمدنی مظاہر

برعظیم پاک وہند کی سرزمین مسلمانوں کی آمد سے علم و ادب کا گہوارہ بنی۔ مسلمانوں میں شجاعت کی صلاحیتوں کے علاوہ علوم و فنون کی بھی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ ان ہی کی بدولت ہندوستان میں طب، ہیئت، ریاضی، کیمیا، ادب، فقہ، تفسیر، حدیث، تاریخ اور سیرت نگاری میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ انھوں نے علوم کی بھی سرپرستی کی۔ ان علمی سرگرمیوں اور تمام شعبہ ہائے زندگی میں خواتین بھی مردوں کے ساتھ حصّہ لیتی تھیں۔ خواتین میں یہ علم و فن کا شوق اسلام کی وجہ سے پیدا ہوا۔ اسلام نے عورت کو بلند مقام و مرتبہ عطا کیا اور اسی وجہ سے دیگر مذاہب میں سے صرف مسلمان خواتین کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے ہر علم و فن میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور مردوں سے کسی طور پیچھے نہیں رہیں۔ ان خواتین میں رقیہ سلطان، گل بدن بیگم، نور جہاں، زیب النساء، جہاں آرا بیگم، گل رخ بیگم اور ممتاز محل کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔

اس دور کی سیاسی و سماجی صورت حال کا طائرانہ جائزہ لیا جائے تو بدقسمتی سے مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد سے مغل سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو گیا تھا۔ نااہل حکمرانوں کی نااہلی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت سی ریاستوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ساتھ ہی مرہٹے، فرانسیسی، انگریز اور دوسرے سیاسی گروہ مرکزی حکومت کے زوال کے بعد اپنا اقتدار مضبوط کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ ان حالات میں ہر طرف معاشی، تہذیبی، معاشرتی، اخلاقی، بدحالی پھیل گئی اور پوری قوم تنزلی کا شکار نظر آنے لگی۔ مسلمانوں کے عہد زوال سے پورے معاشرے پر جمود طاری ہو گیا۔ جس سے تہذیبی اور تمدنی قدریں بدل گئیں۔ خواتین جو مسلم معاشرے میں مردوں کے شانہ بشانہ ہر علمی و ادبی سرگرمیوں میں حصّہ لیتی تھیں۔ وہ معاشرے کی زبوں حالی سے گھر کی چار دیواری میں مقید ہو گئیں۔

ا۔ تعلیم نسواں اور اس کے اثرات:

برصغیر پاک و ہند میں انیسویں صدی کے شروع میں عورتوں کی تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ ملک میں جو کوششیں ہو رہی تھیں ان کی رفتار بھی کافی سست تھی۔ بنگال میں خواتین کی پست تعلیمی حالت کے بارے میں ایک رپورٹ کے مطابق "بنگال کی ۴۹۶۹۷۴ کی کل آبادی میں سے (۲۱۹۰۷ مردوں کے مقابلے میں) صرف چار خواتین خواندہ تھیں۔ اسی طرح بمبئی کی صورت حال بھی کچھ اسی نوعیت کی ہی تھی۔ ۱۸۲۵ء اور ۱۸۲۹ء میں کی گئی دونوں تحقیقات میں کسی ایسی لڑکی کا ذکر نہیں ملتا جو کسی دیسی سکول میں پڑھتی ہو۔ لیکن ایک محقق جروس نے مسلمان عورتوں کی نجی تعلیم کا ذکر ضرور کیا ہے اور اس قسم کی تعلیمی حالت کی گواہی اونچی ذات کے ہندو گھرانوں میں بھی ملتی ہے۔ ان علاقوں کی نسبت مدراس کی تعلیمی حالت قدرے بہتر تھی۔ وہاں کے اعداد و شمار کے مطابق ۱۸۴۱۱۰۰ لڑکوں میں سے ۵۴۸۰ لڑکیاں تھیں۔ ان تمام صوبوں کے مقابلے میں پنجاب کی حالت بہتر تھی۔ جہاں طالبات کے مخصوص سکول موجود تھے۔[۱] ہندوستان میں ایسی پست تعلیمی صورت حال کو دیکھتے ہوئے پہلی بار ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۱۳ء کے چارٹر ایکٹ کے مطابق ہندوستان کے لوگوں کی تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کی ذمہ داری تو لی مگر افسرانِ اعلیٰ نے لڑکیوں کی تعلیم کی بجائے اپنی تمام تر توجہ لڑکوں کی تعلیم تک محدود رکھی۔ کیوں کہ ان لوگوں نے جان لیا تھا کہ ہندوستانی معاشرہ لڑکیوں کی تعلیم کے سخت خلاف ہے اور اس معاملے کو چھیڑنا اپنی مشکلات کو دعوت دینا ہے۔[۲]

ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں مسیحی مشنریوں کا بڑا اہم حصہ ہے۔ انھوں نے ۱۸۱۹ء میں علیحدہ سکولوں کے ذریعے لڑکیوں کو تعلیم دینے کا آغاز کیا اور خاص طور پر ۱۸۱۹ء تا ۱۸۳۷ء کا عہد ان لوگوں کی زبردست تعلیمی جدوجہد کا زمانہ ہے۔ لیڈی امہرسٹ (Lady Emehrist) کی سرپرستی میں ۱۸۲۴ء میں Ladies Society for Native Female Education قائم ہوئی۔ جس کی سرپرستی میں لڑکیوں کے تیس سکول کھولے گئے۔ ان مشنریوں کے قائم کردہ سکولوں میں مغربی انداز کی تعلیم دی جاتی تھی۔[۳] لیکن اس تمام جدوجہد کے باوجود عورتوں کی تعلیمی حالت بہتر نہ ہو سکی کیوں کہ مسلمان اور اونچی ذات کے ہندو اپنی بچیوں کو ان مغربی اندازِ تعلیم کے سکولوں میں بھیجنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان سکولوں کی ذمہ داری خود ایسٹ انڈیا کمپنی نے قبول نہیں کی تھی۔ کیوں کہ یہ لوگ جانتے تھے کہ ہندوستان کے مذہب اور سماج میں عورتوں کی تعلیم کے خلاف تعصب کی شدت اتنی شدید ہے کہ تعلیمِ نسواں کی ذرا سی بھی کوشش ان کے لیے مسائل کھڑے کر سکتی ہے۔ لیکن کمپنی کے اس

فیصلہ میں تبدیلی لانے کی جرأت لارڈ لہوزی (Lord Dilhosi) نے کی اور انھوں نے تعلیمِ نسواں کے لیے امداد اور حکومت کے تعاون کا تاریخ ساز فیصلہ ۱۱ اپریل ۱۸۵۰ء میں کیا۔[۴]

عورتوں کی تعلیم کو فروغ دینے میں ایف۔ ای۔ ڈی بیتھون (F-E-D Bethune) کی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔ وہ یہ بات جانتا تھا کہ اونچی ذات کے ہندو کبھی بھی اپنی بچیوں کو مسیحی مشنریوں کے اسکولوں میں نہیں بھیجیں گے۔ اس لیے بیتھون نے ۱۸۴۹ء میں انفرادی طور پر ایک سکول قائم کیا۔ پھر اس سکول کی کارکردگی سے اور ہندوستانیوں کے رجحان میں تبدیلی سے اسی طرز کے سکول کھولے جانے لگے۔ بعد میں یہی سکول ترقی کر کے بیتھون کالج کے نام سے ہندوستانی خواتین کا پہلا اور اہم ادارہ بن گیا۔[۵]

برطانوی حکومت کے مکمل تسلّط کے بعد برعظیم پاک وہند کی سیاسی، تہذیبی، تعلیمی اور ثقافتی میدان میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ ان روز بروز کی تبدیلیوں اور مغربی نظام کی ترقیوں کی وجہ سے ہندوستانی لوگوں میں بھی شعور بیدار ہونا شروع ہوا۔ ان کے ذہنوں میں ایک انقلاب برپا ہوا اور سوچنے سمجھنے کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ تعلیم کے سلسلے میں کے۔ ایم۔ پنکر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جہاں برطانوی نظام حکومت نے ہندوستان کے لوگوں کے لیے بہت کچھ کیا ہے مگر وہاں صرف انگریزی تعلیم کے نفاذ سے ہی ہندوستانیوں کے فرسودہ رسم ورواج، مافوق الفطرت عقائد اور ان کے تعصبات دور کرنے اور ان کے اندر ایک نئے فکر و عمل کی جلا بخشنے میں کافی مدد ملی۔[۶]

جب ہندوستانیوں میں انگریزی تعلیم کی وجہ سے شعور بیدار ہوا تو پھر ہندوستان کے دانش وروں اور مصلحین نے بھی معاشرے میں موجود جہالت، فرسودہ رسم ورواج، عقائد کا قلع قمع کرنے کے لیے مختلف شہروں میں انجمنیں اور تحریکیں قائم کیں مثلاً مذہبی تحریکیں، علی گڑھ تحریک، آریا سماج، برہمو سماج، تھیوسی فیکل سوسائٹی وغیرہ۔ ان کے ذریعے انھوں نے اپنی اصلاحی مہمیں شروع کیں اور لوگوں میں شعور بیدار کرنے کے لیے ان تھک کوششیں کیں۔

برہمو سماج (۱۸۲۶ء) کی قیادت راجہ رام موہن رائے کر رہے تھے۔ انھوں نے ہندوستان میں تعلیمِ نسواں اور عورتوں کو خاص حیثیت دلانے کے لیے ایک مہم شروع کی۔ لیکن اس اصلاحی تحریک کو پورے ہندوستان میں متعارف کروانے کا اعزاز کیشب چندر سین کو حاصل ہے۔ جن کی کوششوں سے اس کی شاخیں ملک کے مختلف حصوں

میں قائم ہوئیں۔اسی طرح آریا سماج (۱۸۷۵ء)اور تھیوسی فیکل سوسائٹی (۱۸۷۹ء) نے بھی ہندوستانی عورتوں کی تعلیمی حالت کو سدھارنے کے لے ملک گیر تحریکیں شروع کیں۔ غرض کہ اس صدی میں ہندوستان میں مذہبی اور سماجی اصلاحات کی تحریکیں کافی شدت سے نکلیں۔اس میں جہاں مردوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، وہاں خواتین بھی کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد بہت قلیل تھی مگر ان کی موجودگی سے ایک عام عورت کو بھی طاقت ملی۔ تعلیمِ نسواں کی تحریک کو مہارانی تپسوینی (Maharani Tapasvini) ، رانی شرنومی (Rani Sharnomoyee) سورن کماری دیوی، رانا بائی راناڈے وغیرہ جیسی شخصیات نے نئی شاہراہ پر گامزن کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

لاہور میں ۱۹۰۹ء میں ایک سوشل کانفرنس منعقد کی گئی جس کی صدارت پرتاب گڑھ کی رانی صاحبہ نے کی تھی۔ اس کانفرنس میں ایک تجویز پیش کی گئی کہ ہندوستان میں "بھارت استری منڈل" کے نام سے ہندوستان کی خواتین کی ایک سبھا قائم کی جائے لیکن اس وقت کوئی عملی جامہ نہ پہنایا گیا۔ تاہم نومبر ۱۹۱۰ء میں لاہور ہی میں ایک جلسہ میں، جس کی صدارت مسز سین کر رہی تھیں اس تجویز کو قبول کر لیا گیا۔اس طرح عورتوں کی تعلیم کے فروغ کے لیے "بھارت استری منڈل" کا قیام ہوا۔اس تجویز کی محرک شریمتی سرلا دیوی چودھرانی تھیں اور وہ ہی اس کی سیکرٹری مقرر ہوئیں۔ اس کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کی پردھان رانی صاحبہ پرتاب گڑھ تھیں اور مسند دیب نارائن سنگھ، مسز سچدانند سہنا، مسز موتی لال نہرو، مسز للت موہن برجی، مسز جیوتی سروپ وغیرہ اس کمیٹی کی ممبر تھیں۔ بیگم صاحبہ جنجیرہ نے اس منڈل کی پہلی کانفرنس کو اپنی صدارت سے اعزاز بخشا اور بیگم بھوپال بھی اس جلسے میں شریک تھیں۔ [۲]

ہندوستان میں تعلیمِ نسواں کی تحریک طبقہ اشرافیہ کی چند خواتین نے شروع تو کی تھی لیکن کم وسائل ہونے کی وجہ سے اس کے نتائج بھی بہت کم حاصل ہو رہے تھے۔ کیوں کہ ایک تو تربیت یافتہ خواتین اساتذہ کی بہت کمی تھی اور دوسرا اسکول بھی کم تھے۔اس کے علاوہ حکومت کا رویّہ بھی اس معاملے میں زیادہ سازگار نہیں تھا۔ان تمام مشکلات کے باوجود کچھ تنظیمیں اور تحریکیں اس جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں اور اس کے فروغ کے لیے مالی وسائل بھی فراہم کر رہی تھیں۔ اگرچہ ۱۸۶۶ء تا ۱۸۸۲ء کے درمیانی عرصہ میں عورتوں کی تعلیمی حالت کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں تھی مگر بیسویں صدی کے اوائل تک لوگوں میں کافی شعور پیدا ہوا اور وہ اس کی اہمیت سے آگاہ ہوئے اور

انھوں نے اس کی طرف توجہ کی۔ جیسے بعض ترقی یافتہ ریاستوں میسور، بڑودہ اور ٹراونکور میں تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ دی گی۔ اس کے علاوہ برطانوی افسران نے بھی جن علاقوں میں اس میں دلچسپی لی وہاں بہت اچھے اثرات برآمد ہوئے۔[۸]

ہندوستان میں جس وقت عورتوں کی سماجی اور تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کی تحریک شروع ہوئی اس وقت دوسرے ممالک میں بھی عورتوں کی حالت کو بہتر بنانے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ ان تحریکوں کے اثرات ہندوستان کی تعلیم نسواں کی تحریک پر بھی اثر انداز ہو رہے تھے اور ان کاوشوں نے ہندوستانی تحریک کو بھی نئی سمت دی اور لوگوں نے بڑھ چڑھ کر اس میں حصّہ لینا شروع کیا۔ مختلف رسالوں اور اخباروں میں عورتوں کے حقوق کے لیے تحریریں شائع ہونے لگیں اس کے علاوہ خواتین کے جلسے اور کانفرنسیں بھی منعقد ہونے لگیں تاکہ عورتوں میں بیداری پیدا کی جا سکے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد کا عرصہ مسلمانوں کے لیے ہر میدانِ زندگی میں بڑا کٹھن اور آزمائش کا زمانہ تھا۔ اس کے برعکس ہندو ہر میدان میں مسلمانوں سے آگے تھے۔ انھوں نے انگریزی تعلیم کی طرف توجہ کر کے انگریزوں کے خیر خواہ اور مددگار بننے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس نازک مرحلے پر سرسید احمد خان نے ملت اسلامیہ کو تعلیم کی افادیت سے روشناس کروانے کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے جب جدید تعلیمی تحریک کا آغاز کیا۔ اس سے تقریباً پچاس سال پہلے راجہ رام موہن رائے اسی قسم کی تعلیمی تحریک شروع کر چکے تھے مگر تب تعلیم کے نام پر صرف مقامی مکاتب اور مذہبی مدرسے تھے۔ لڑکوں کو اخلاقیات، مذہب اور شریعت کی ہی تعلیم دی جاتی تھی۔ مگر سرسید نے جدید انگریزی تعلیم کے فروغ کے لیے کوشش کی۔ ان دونوں مصلحین کی تعلیمی کوششیں صرف لڑکوں کی تعلیم تک محدود تھیں۔ لڑکیوں کی تعلیم کو کسی نہ کسی مصلحت کی وجہ سے نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ ان حالات میں سر سیّد احمد خان مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے میدانِ عمل میں نکلے۔ انھوں نے اپنی کاوشوں کا آغاز دو چیزوں سے کیا۔ ایک تو انھوں نے اپنے رسائل (اسباب بغاوت ہند۔ رائل محمڈنز آف انڈیا) کے ذریعے انگریزوں کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری ثابت کرنے کی کوشش کی اور دوسرا مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانے میں برسرپیکار ہوئے۔ سرسید کو اس بات کا گہرا احساس تھا کہ مسلمان تعلیم کے میدان میں ہندوؤں سے بہت پیچھے ہیں اور وہ انگریزی تعلیم سے گریزاں ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ یہ وقت انگریزوں سے تصادم کا نہیں بلکہ مفاہمت کا ہے۔ اس لیے انھوں نے مسلمانوں کو جدید

تعلیم سے آراستہ کرنے کی جدوجہد کی اور احیائے علوم کی تحریک شروع کی۔اس مقصد کے لیے سائنٹیفک سوسائٹی (۱۸۶۳ء)اور ایم۔اے۔او کالج ۱۸۷۷ء کی بنیاد رکھی۔انھوں نے برعظیم پاک و ہند میں جدید تعلیم کا آغاز کیا۔اس مقصد کی بارآوری کے لیے رسائل "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق" جاری کیے تاکہ ان رسائل میں مختلف موضوعات پر مضامین شائع کرواکر مسلمانوں کو شعور و آگاہی دی جاسکے۔ سرسید جدید تعلیم کے زبردست حامی ہونے کے باوجود تعلیم نسواں کے معاملے میں قدامت پرست تھے۔ان کا خیال تھا کہ لڑکوں کی تعلیم ہی لڑکیوں کی تعلیم کا پیش خیمہ ہے لیکن ان کے دوسرے رفقا کی سعی و کوشش سے ۱۸۸۹ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے تیسرے اجلاس منعقدہ لاہور میں پہلی مرتبہ تعلیم نسواں کا مسئلہ زیرِ غور آیا۔ مختلف اجلاسوں میں بحث و تمحیص کے بعد ۱۸۹۶ء میں تعلیمِ نسواں کا ایک شعبہ قائم ہوا جس کے سیکرٹری مولوی کرامت حسین بار ایٹ تھے۔ ۱۹۰۲ء میں جب شیخ عبداللہ اس شعبے کے سیکرٹری ہوئے تو یہ فعال ہوا اور زنانہ مدرسے قائم ہونے لگے۔[۹] سرسید کے رفقا میں سے ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا الطاف حسین حالی ایسی شخصیات ہیں جنھوں نے خواتین میں شعور بیدار کرنے کے لیے اصلاحی ناول لکھے۔اس علمی و ادبی تحریک کی برکات سے معاشرے کے دوسرے افراد نے بھی عورتوں کی تعلیم کے بارے میں سوچنا شروع کیا اور خواتین کے اخبار جاری کیے۔اس کاوش میں مولوی ممتاز علی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔انھوں نے "تہذیب نسواں" کا اجراء کیا جس میں خواتین کے لیے خواتین نے مضامین نگاری کی۔جہاں سے خواتین کی تعلیم و ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

اسی طرح تعلیم نسواں کی تحریک کو آگے بڑھانے میں مولوی ممتاز علی کی خدمات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے ایک رسالہ "تہذیب نسواں" کا اجرا کیا۔ وہ عورتوں کی تعلیم و اصلاح کے بہت بڑے حامی تھے۔ ممتاز علی نے ۱۸۹۸ء میں عورتوں کے حقوق کے متعلق ایک کتاب "حقوق نسواں" بھی تحریر کی۔ "ہندوستانی خواتین میں بیداری و اصلاح پیدا کرنے میں علامہ راشد الخیری کا نام بھی بڑا اہم ہے۔انھوں نے ایک رسالہ "عصمت" جاری کیا۔ اس میں زیادہ تر ایسے مضامین شائع ہوتے تھے جن کا تعلق مذہبی تعلیم سے تھا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں شیخ عبداللہ کی عملی جدوجہد سے نہ صرف عورتوں کی تعلیم کو فروغ حاصل ہوا بلکہ ان میں بیداری بھی آئی۔ وہ تعلیم نسواں کی تحریک کے سب سے بڑے محرک تھے۔انھوں نے خواتین کے لیے ۱۹۰۶ء میں ایک رسالہ "خاتون" بھی جاری کیا۔اس میں عورتوں کے لیے مختلف موضوعات پر مضامین شائع ہوئے

تھے۔" شیخ عبداللہ نے علی گڑھ میں ۱۹۰۶ء میں لڑکیوں کا ایک سکول قائم کیا۔ ان تمام فلاحی کاموں میں ان کی بیوی بھی ان کے قدم بہ قدم رہیں۔ اس اسکول کو قائم کرنے میں انھیں رجعت پسند عناصر کی طرف سے بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن انھوں نے تمام صعوبتوں کو بڑے حوصلے کے ساتھ برداشت کیا۔ مگر جلد ہی انھیں اس جدوجہد میں حکمران بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم کی سرپرستی اور حمایت حاصل ہو گئی۔ وہ شیخ عبد اللہ کی تعلیمی کاوشوں سے بہت متاثر ہوئیں۔ کیوں کہ وہ خود بھی تعلیم نسواں میں خصوصی دلچسپی رکھتی تھیں۔ انھوں نے ریاست بھوپال میں نہ صرف لڑکیوں کے لیے سکول قائم کیے بلکہ خواتین کی اصلاح و بہبود کے لیے کوششیں بھی کیں۔ نواب بیگم نے تعلیمی نظام کے لیے بہت سے فنڈ بھی مختص کیے۔ اس طرح ہندوستان میں تعلیم نسواں کی پہلی منظم تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک کے پیشِ نظر شیخ عبداللہ نے "انجمن خواتین اسلام" کی بنیاد رکھی۔"[۱۰] ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم کے فروغ کے لیے نہ صرف اجتماعی بلکہ انفرادی سطح پر بھی کوششیں جاری تھیں۔ اس وقت مسلم بچیوں کے لیے علیحدہ سکولوں کی بہت کمی تھی کیوں کہ مسلمان اپنی لڑکیوں کو عیسائی مشنریوں کے زیرِ سایہ چلنے والے سکولوں میں بھیجنا پسند نہیں کرتے تھے۔ انھیں تبدیلی مذہب اور بے پردگی کا خطرہ تھا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے مسلمان رہنماؤں کی یہی کوشش رہی کہ وہ جگہ جگہ مسلمان لڑکیوں کے لیے سکولوں کا انتظام کریں تاکہ وہ اپنی مذہبی روایات کے مطابق جدید تعلیم حاصل کر سکیں۔ چنانچہ اس مقصد کے تحت بیگم بھوپال نے اپنی ریاست بھوپال کے علاوہ دیگر علاقوں میں بھی سکول قائم کیے۔ شیخ عبداللہ نے علی گڑھ میں اور نظام حیدر آباد کی اجازت سے حیدر آباد میں سکول قائم کیے گئے۔[۱۱] مسلمانوں کے ایک گروہ نے جہاں اپنی عملی کوششوں سے تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے قدم اٹھایا تو وہیں دوسرے گروہ نے اپنی تحریروں کے ذریعے عورتوں کی تعلیم سے متعلق بے حسی اور بے زاری کو دور کرنے کی تحریک شروع کی۔ ان میں زیادہ تر وہ لوگ شامل تھے جو سر سیّد کی تحریک سے یا تو وابستہ تھے یا اس کے پُرزور حامی تھے۔ ان لوگوں میں حالی، شبلی، نذیر احمد، محسن الملک نمایاں ہیں۔ ان شخصیات کے علاوہ بیگم صغرا ہمایوں، محمدی بیگم، عطیہ فیضی، نازلی بیگم، زہرا فیضی، نفیس دلہن، فاطمہ بیگم، نذر سجاد حیدر، اکبری بیگم وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان خواتین کے علاوہ بھی بے شمار خواتین نے اپنی تحریروں کے ذریعے ہندوستانی خواتین کی اصلاح کی اور انھیں تعلیم کی اہمیت و افادیت سے آگاہ کیا۔ تعلیمی اصلاح کی ان کوششوں کی وجہ سے ہندوستان میں تعلیم یافتہ مسلمان خواتین کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جس نے مزید آگے چل کر تعلیم نسواں کے فروغ میں اہم خدمات انجام دیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے عورتوں میں اصلاح، بیداری اور آزادی کی ایک لہر دوڑا دی۔

انگریز حکومت نے مشنری سکول قائم کیے۔انگریزی نظام کے ہندوستانی معاشرے پر اثرانداز ہونے سے عام خواتین پر بھی تعلیم کے اثرات مرتب ہوناشروع ہوئے۔خواتین کی تعلیم کے حوالے سے ایسا کہنا بالکل درست نہیں کہ خواتین کی ساری تعلیمی ترقی انگریز تسلط کے بعد ہوئی بلکہ مسلم فاتحین کی خواتین کے علاوہ طبقہ اشرافیہ کی خواتین بھی علمی و ادبی صلاحیت سے مالامال تھیں۔ صرف ہندوستانی معاشرے کی عام خواتین جاگیر دارانہ اور قدامت پرست نظام میں جکڑے ہونے کی وجہ سے تعلیم سے دور تھیں۔انگریزوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں روایتی تعلیم کا نظام تھا۔ معقولات اور منقولات کی درس گاہیں تھیں اور اسلامی علوم کے ساتھ عربی اور فارسی ادبیات کی دانش گاہیں بھی تھیں، لیکن جدید تعلیم اور صنعت و ٹیکنالوجی کی تعلیم کا رواج نہیں تھا۔ تعلیمِ نسواں کے ادارے بھی نہیں تھے۔ خواتین کی بیداری کے آثار تو اسی وقت سے ملنے لگتے ہیں جب انگریز باقاعدہ قابض ہو کر سر گرم ہو گئے تھے۔ [۱۲]

انیسویں صدی کے اختتام تک تعلیم و بیداری نسواں کی تحریک میں شدت آگئی اور پاک و ہند کے طول و عرض میں ایسے ادارے قائم ہونے لگے جن میں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا باقاعدہ انتظام تھا۔لوگوں میں بھی شعور کی بیداری نے انہیں اپنی بچیوں کو مدارس بھیجنے پر اکسایا۔انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں کئی ایسے رسائل و جرائد بھی منظرِ عام پر آئے جن میں خواتین کی اصلاح و تعلیم پر زور دیا گیا تاکہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے معاشرے کی تعمیر اور خاندانی نظام میں فعال کردار ادا کر سکیں۔ان تمام کوششوں کے نتیجہ میں خواتین کی موجودگی سیاست، ادب اور معاشرے میں ہر جگہ نظر آنے لگی۔انھوں نے تحریکِ آزادی کی جدوجہد میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کیا۔ معاشرے میں اس تبدیلی کی لہر چلنے اور تحریکِ آزادیِ نسواں کے تحت صنفی عدم مساوات کے خلاف خواتین میں بیداری پیدا ہوئی تو انھوں نے فرضی ناموں کا پردہ ہٹا کر براہِ راست عوام سے مخاطب ہونے کی کوشش کی۔اس کوشش نے انھیں باعزت مقام کا احساس دلایا اور پھر آہستہ آہستہ معاشرہ اور ادب ان کی اہمیت تسلیم کرنے لگا۔اس حوالے سے ترنم ریاض صاحبہ یوں رقم طراز ہیں:

> اردو ادب میں ادیباؤں کے کارنامے ایک پوری صدی پر محیط ہیں۔اردو ادب کے اس سارے منظر پر نظر ڈال کر یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ادیباؤں نے اس منظر نامے کو اور بھی دل کش اور جاندار بنانے میں خاصا کردار ادا کیا ہے۔ گزشتہ ایک صدی میں خواتین ناول نگار، سفر نامہ نگار، افسانہ نگار، شاعرات، انشائیہ نگار، مزاح نگار حتیٰ کہ خاتون تنقید نگاروں نے بھی اردو ادب کی بقا میں ایک اہم حصہ ادا کیا ہے۔ [۱۳]

اردو میں سفر نامہ نگاری کی ابتدا برطانوی سامراج کے تسلط کے بعد سے ہوتی ہے۔ خاص طور پر ۱۸۰۰ء کے بعد جب برصغیر پاک وہند کی سیاسی، تہذیبی، تعلیمی اور سماجی زندگی میں ایک زبردست تبدیلی رونما ہوئی تو اس کا نمایاں اثر ادب پر پڑا۔ اس لیے اس عہد کے شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں نے ادب کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ اردو سفر نامہ عربی، انگریزی اور فارسی کے توسط سے ہمارے یہاں آیا اور انگریزی زبان وادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ اسے بھی فروغ حاصل ہوا۔ چنانچہ سفر نامہ کا آغاز بھی اسی وقت ہوا جب ہندوستان کی تہذیبی وسیاسی زندگی میں تبدیلیاں پیدا ہورہی تھیں۔ اس تبدیلی کے متعلق ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

> ملک میں پیداواری وسائل کی تبدیلی صنعتی ترقی کا فطری اور منطقی نتیجہ نہیں تھی بلکہ وہ ایک غیر ملکی سامراجی اقتدار کے زیرِ اثر مصنوعی طور پر وقوع میں آرہی تھی اور بعض حیثیتوں سے اس عہد کی اصلاحی تحریکوں کا نتیجہ تھی۔ [۴۱]

ان بدلتے ہوئے ماحول میں ادیبوں نے بھی زندگی کے تقاضے کو ایک مخصوص زاویے سے دیکھنا شروع کیا۔ اب حقیقت پسندی کا دور شروع ہوا اور زندگی کے مصائب کا مقابلہ اپنے عمل اور ہمت سے کرنے کا شعور پیدا ہوا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو میں سفر نامہ کی شروعات بھی ہندوستان میں چلنے والی اصلاحی تحریکوں کا نتیجہ ہے۔ ابتدائی دور میں لکھے گئے سفر ناموں میں ہمیں اس عہد کے سفر نامہ نگاروں کے ایک مخصوص نقطۂ نظر کا بھرپور احساس ہوتا ہے، جو ان کی شخصیتوں اور ان کے خیالات وتصورات کو بے نقاب کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے سفر ناموں کے ذریعے ہی معاشرتی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ ان میں اولیت تعلیمِ نسواں کو حاصل ہے کیوں کہ تعلیم ہی اس عہد کی اولین ضرورت تھی۔ خصوصاً مسلمان عورتوں کی تعلیمی حالت اور بھی غیر تسلی بخش تھی۔ اس لیے ہندوستان کی پڑھی لکھی خواتین نے مسلمان خواتین کی تعلیمی اصلاح کے لیے اپنے اپنے طور پر جدوجہد کی۔ اس لیے ابتدائی دور کے سفر ناموں میں سرسید احمد خان کی جدید تعلیم کی تحریک کے علاوہ ہندوستان کی سیاسی وسماجی اور مذہبی تحریکوں کے اثرات نظر آتے ہیں۔

گزشتہ باب میں نوآبادیاتی عہد کے اردو سفر ناموں کا جائزہ ان کی موضوعاتی تقسیم، دیارِ مقدسہ، دیارِ مغرب اور اندرونِ ہندوستان کے سفر کے تحت لیا جاچکا ہے، جس سے ان کی تاریخی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ سفر نامے ہمیں مختلف ملکوں اور شہروں کی سماجی، سیاسی، ثقافتی اور تمدنی حالات کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے مطالعے سے وہاں کے جغرافیائی وتاریخی حالات اور دوسری باتوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ کوئی بھی سفر نامہ نگار

کسی نہ کسی مقصد کے تحت سفر اختیار کرتا ہے۔ کوئی علمی و مذہبی مراکز کو دیکھتا ہے تو کوئی سیاحت کی لذتوں سے آشنا ہونے کے لیے سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ مقصد خواہ کوئی بھی ہو مگر ان سفر ناموں میں تخلیق کار کے جذبات واحساسات اہمیت رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ اس کا دوسروں کے بارے میں نقطۂ نظر اہم سمجھا جاتا ہے۔ ان کی اہمیت کے پیشِ نظر نوآبادیاتی عہد میں بہت سے سیاحوں نے اپنے اپنے تجربات میں دوسروں کو شاملِ حال کرنے کے لیے اس صنف میں طبع آزمائی کی اور اپنے مشاہدے اور حالات و واقعات کی سچی تصویر کشی کرنے کی وجہ سے ان کے سفر ناموں کو اہمیت حاصل ہوئی۔ اس لیے اس باب میں ان سفر نامہ نگار خواتین کے امتیازی خصائص کا ان کے سفر ناموں کے حوالے سے جائزہ لیا جائے گا۔

اس نوآبادیاتی عہد اور اردو سفر نامہ نگاری کی صنف کی اولین سفر نامہ نگار خواتین کا تہذیبی و تمدنی اور سیاسی و سماجی شعور بھی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ خود بھی ان حالات سے متاثر ہوئیں اور انھوں نے اپنے سفر ناموں میں بھی انہی حالات کے تناظر میں دوسری جگہوں کا مشاہدہ کیا۔ ان خواتین میں نواب سکندر بیگم، نواب سلطان جہاں بیگم، نازلی رفیعہ سلطان، بیگم سربلند جنگ بہادر (اختر حمید)، بیگم صغرا ہمایوں مرزا، شاہ بانو (میمونہ سلطان)، عطیہ فیضی، محمودہ عثمان حیدر اور بیگم حسرت موہانی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ خواتین اردو سفر نامہ نگاری کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس عہد کی طبقہ اشرافیہ کی خواتین کو تعلیم کے مواقع میسر تھے۔ انہوں نے تہذیبی، سیاسی، اور تمدنی تعلیم پر خصوصی توجہ سے اور ایسے گھرانوں سے تعلق ہونے کی وجہ سے جو اپنے وقت کے اہل ثروت تھے، یورپی ممالک کی سیاحت کی۔ حجاز مقدسہ کے بھی سفر کیے۔ اب یہ تعلیم سے مزین خواتین کہیں بھی جاتیں تو وہاں کے حالات وواقعات کا مشاہدہ کرتیں اور ان کو ساتھ ساتھ لکھ لیا کرتیں۔ ساتھ ہی ان کو سلسلہ وار رسالوں میں بھی شائع کرواتیں تاکہ ہندوستان کی دوسری کم تعلیم یافتہ اور اپنے گھروں میں گھرداری کے امور انجام دینے والی خواتین بھی ان تمام معاملات سے مستفید ہو سکیں جن سے وہ خود آشنا ہوئیں ہیں۔

برعظیم پاک و ہند کی سیاسی، سماجی، تعلیمی اور اقتصادی تبدیلیوں کے پیش نظر جب اردو میں خواتین نے سفر نامہ نگاری شروع کی تو انھوں نے اپنے دور کے سب سے اہم ترین مسئلے یعنی تعلیم نسواں کو نظرانداز نہیں کیا۔ سفر نامے کی صنف کو انہوں نے ہندوستانی عورتوں اور بالخصوص مسلمان عورتوں کی تعلیمی اور سماجی اصلاح کے لیے ایک موثر وسیلہ بنا کر پیش کیا۔ ان ابتدائی سفر نامہ نگار خواتین نے ہندوستانی خواتین کی ذہنیت بدلنے، ان کی ناخواندگی

دور کرنے اور ان کو جدید تعلیم کی اہمیت سے روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ جہاں کہیں بھی گئیں انھوں نے وہاں کے نظام تعلیم، مدارس اور خواتین کی تعلیمی حالت کا بغور جائزہ لیا اور انہیں سفر نامے میں تحریر کیا۔ اردو ادب کی سب سے پہلی خاتون سفر نامہ نگار نواب سکندر بیگم جس کا شمار بھوپال کی بیگمات میں سے دوسرے نمبر پر ہوتا ہے۔ انھوں نے اور اس خاندان کی دوسری خواتین نے اپنی ریاست میں عورتوں کی بہبود اور تعلیم کے لیے عملی اقدامات کیے ہیں۔ ان کی یہ خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ انھوں نے ہند میں سب سے پہلے عورتوں کے حقوق اور تعلیم کے لیے ادارے قائم کیے کیوں کہ یہ نواب خواتین خود بھی علم کی اہمیت سے واقف اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں۔ انھوں نے اپنے زمانے کے مشہور علما اور باکمال اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اور فنون سپہ گری سیکھنے، ملک داری کی تربیت و تعلیم اپنی ماں کے معتبر وزرا حکیم شہزاد مسیح، میاں کرم محمد خان اور راجہ خوشوقت رائے کی نگرانی میں حاصل کی۔[۱۵] اس لیے وہ تعلیم کی اہمیت سے بخوبی واقف تھیں۔ اس کے علاوہ وہ معاشرے کے تہذیبی و سیاسی حالات سے بھی آگاہ تھیں۔

خواتین کے لیے کی گئیں ان تمام تعلیمی کوششوں کے نتیجہ میں بیسویں صدی میں بہت سی خواتین دیگر اصناف کے علاوہ سفر نامہ نگاری کی صنف میں آئیں۔ اردو ادب میں خواتین سفر نامہ نگاری کا آغاز تو انیسویں صدی کے وسط میں نواب سکندر بیگم والئی بھوپال کے سفر نامے یادداشت تاریخ وقائع حج (۱۸۶۵ء) سے ہوا۔ البتہ یہ سفر نامہ اس وقت اشاعت کے مرحلہ سے ہم کنار نہ ہو سکا۔ اس کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رام میں موجود ہے مگر ۱۸۷۰ء میں اس کو انگریزی زبان میں ولیم اچ السن و کمپنی، واٹرلو (برطانیہ) نے شائع کیا اور ملکہ وکٹوریا کی خدمت میں پیش کیا۔[۱۶] اسی انگریزی ترجمے کو ۲۰۰۷ء میں *Princess Pilgrimage* کے نام سے آکسفورڈ پریس نے شائع کیا۔ اس لحاظ سے یہ سفر نامہ اردو ادب کا پہلا سفر نامہ شمار ہوگا۔

بیگم نواب اپنی ریاست میں بھی عورتوں کی خیر خواہ تھیں اور سفر کے دوران بھی انھوں نے عورتوں کی تعلیمی پسماندگی کا ذکر کیا ہے۔ ریاست بھوپال کی آخری خاتون حکمران نواب سلطان جہاں بیگم نے عورتوں کی فلاح و بہبود اور تعلیم کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی کیوں کہ نواب سلطان جہاں کا عہد انگریز استعماری طاقتوں کی مکمل عمل داری کا عہد ہے۔ اس دور میں انگریزوں نے برصغیر میں ترقیاتی کاموں کا جال بچھا دیا اور خود کو ہر لحاظ سے ہندوستان اور ہندوستانی عوام کا خیر خواہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ بیگم سلطان جہاں کی تعلیم و تربیت پر بھی خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ محمد امین زبیری ان کی تعلیم کے متعلق کہتے ہیں:

> نواب سکندر بیگم نے ولادت کے چند ماہ بعد ہی ہر ہائی نس کی پرورش اپنی خاص نگرانی میں لی اور غذا، سواری، مقامات ہواخوری وغیرہ کا ایک دستور العمل بنایا اور جب تعلیم کا وقت آیا تو تعلیم کے ہر خزینہ اور کلیہ کو خود ہی قائم کیا۔ حتیٰ کہ تعلیم کا ضابطہ بھی خود متعین کیا۔[۱۷]

نواب سلطان جہاں کی اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبان کے لیے ملک میں سے اساتذہ منتخب کیے گئے اور اس کے ساتھ ان کو شہ سواری، نشانہ بازی کے لیے بھی باکمال تعلیم دینے والوں کے سپرد کیا گیا۔ ان کو امورِ سلطنت میں ماہر کرنے کے لیے بیگم سکندر نے اپنے تمام تجربات کی روشنی میں تربیت دی اور فرماں روا ریاست بننے کے بعد انھوں نے اپنی ریاست کا نظم و نسق ایسے احسن طریقے سے چلایا اور پورے ہندوستان میں ان کے کمالات، سخاوت اور علم پروری کی مثال دی جاتی تھی۔ برصغیر میں ۱۸۵۷ء کے بعد تعلیمِ نسواں کی تحریک دن بدن زور پکڑتی جارہی تھی اور اس کے اثرات ہر خاص و عام پر پڑ رہے تھے۔ عام طبقہ اپنی تہذیبی و تمدنی اور سماجی روایات سے انحراف کا حوصلہ نہ رکھنے کی وجہ سے اپنی عورتوں کو جدید تعلیم دلوانے سے ہچکچا رہا تھا۔ ان میں سے اعلیٰ طبقہ کی خواتین تعلیم کے ثمرات سے فیض پارہی تھیں۔ ان تمام صورت حال سے نواب سلطان جہاں آگاہ تھیں۔

انھوں نے اپنی اقدار و روایات کی بھی پاسداری کی اور انگریزی نظام کی بھی حمایت میں کسی طور کمی نہ چھوڑی۔ انھوں نے انگریزی و دیسی تعلیم کو باہم کر کے اپنے قائم کردہ مدرسوں میں لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام کیا۔ عورتوں کی تعلیمی اصلاح کی کوششوں میں ان کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔ نواب بیگم کے دیگر کارناموں کے علاوہ ایک اہم ترین کارنامہ ان کی تصانیف کی تعداد ہے۔ وہ قدیم خواتین ادیبوں میں واحد خاتون ہیں جن کی تصانیف کی تعداد ڈاکٹر رضیہ حامد کے مطابق بیالیس (۴۲) ہے۔[۱۸] ان تصانیف میں سے زیادہ تر عورتوں کے لیے تحریر کی گئی ہیں۔ ان کی عورتوں کے لیے تخلیق کی گئی کتابوں کے بارے میں محمد امین زبیری لکھتے ہیں:

> ہندوستان میں جب سے تصنیف و تالیف کا مذاق پیدا ہوا ایسی بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں جو عورتوں کی خصوصیت کے ساتھ مفید ہوں اور ان کو امورِ خانہ داری اور تربیت اولاد میں مدد دیں اور ان میں مذہبی روح پیدا کر سکیں جو ہمیشہ سے عورتوں کی خصوصیت رہی ہے۔[۱۹]

بیگم سلطان جہاں نے دیگر تصانیف کے ساتھ سفر نامے بھی تحریر کیے۔ انھوں نے ۱۳۲۱ھ بمطابق ۲۳ فروری ۱۹۰۴ء میں فریضہ حج کی ادائیگی اور اپریل ۱۹۱۱ء میں یورپ کی سیاحت کی۔[۲۰] یہ دونوں سفر ان کی شاہانہ

مسافت کو بیان کرتے ہیں۔ سفرِ حج کی روداد کو انھوں نے خود روضۃ الریاحین کے نام سے قلم بند کیا اور یورپ کے سفر کے احوال انھوں نے اپنی بہو شاہ بانو سے سیاحت سلطانی کے نام سے تحریر کروائے۔ ان دونوں سفر ناموں سے ایک عورت کا زاویہ نظر دکھائی دیتا ہے۔ سفر نامہ حج زیادہ تر سعودی عرب کے جغرافیائی و سماجی احوال پر مبنی ہے مگر یورپ کے سفر نامے میں برصغیر کی عورت ان کے ساتھ ساتھ جلوہ گر رہتی ہے۔ وہ یورپ کے نظامِ تعلیم اور عورتوں کی آزادی سے متاثر ہو کر اس کا اظہار سفر نامے میں بھی برملا کرتی ہیں۔

ان سفر نامہ نگاروں کے بعد نازلی رفیعہ سلطان کا نام آتا ہے۔ ان کا سفر نامہ سیرِ یورپ ان کی دل چسپ سیاحت کا خوب صورت مرقع ہے۔ ان کا سفر نامہ کسی مسلمان خاتون کا یورپ کا پہلا سفر نامہ ہے۔ انھوں نے اپنی ریاست میں لڑکیوں کی تعلیم کا اہتمام کیا اور حقوق و تعلیمِ نسواں کے لیے مختلف رسائل میں مضامین بھی تحریر کرتی رہیں۔ وہ اہلِ علم حضرات کی دل سے قدر کرتیں اور اپنی ریاست میں انھیں مدعو بھی کرتی رہیں۔ ان کے کئی دانش وروں سے تعلقات بھی رہے جن میں علامہ شبلی نعمانی اور علامہ اقبال نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر فرحت جہاں کہتی ہیں کہ علامہ شبلی نے اپنی سیرت النبی کی کتاب، ان کی تحریک اور رعانت سے مکمل کی۔ [۲۱]

بیگم نازلی نے اپنے سفر نامے میں یورپ کی تہذیبی و ثقافتی، سماجی و سیاسی اور تعلیمی حالات کے بارے میں لکھا ہے۔ وہ یورپی ممالک کا ہندوستانی ماحول اور حالات سے موازنہ بھی کرتی ہیں۔ مصنفہ نے ایک عورت کی نظر سے یورپ کو دیکھا اور عورتوں کے معاملات، ان کا لباس، تعلیم، آزادی، زیورات کے بارے میں بہت سی معلومات دی ہیں۔ مصنفہ ایک جگہ یورپی عورت کے متعلق لکھتی ہیں:

> یہاں کی امیر عورتیں بھی عجیب عجیب مفید کام کرتی ہیں مثلاً انھوں نے ایک مجلس قائم کی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ یہاں کے دیہات کے غربا کو مرغیوں کے پالنے اور انڈے جمع کرنے کا کام سکھایا جائے گا تاکہ انگلستان اپنی ضروریات کے مطابق انڈے خود پیدا کر سکے۔ اس وقت بے حد و شمار انڈے باہر سے آتے ہیں۔ خدا جانے ہر سال کتنے پونڈ یا کتنے کروڑ روپے کے انڈے انگلستان میں باہر آکر بکتے ہیں جن کا نفع دوسرے ملکوں میں جاتا ہے۔ یہ ڈچز صاحبہ اس کوشش میں ہے کہ اس نفع کا بہت سا حصہ ملک میں ہی رہے۔ ان کی ترقی کا یہی باعث ہے کہ ہر چھوٹے بڑے کے دل میں ملک کی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ [۲۲]

سفر نامے میں ایک جگہ مصنفہ تعلیم کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> باتوں کا سلسلہ تو اکثر ہندی لباس، موسیقی، تعلیم نسواں وغیرہ پر جاری رہا۔ اثنائے راہ میں عطیہ سے مادام نے جب علی گڑھ سکول کا ذکر سنا تو صدق دل سے کہنے لگیں کہ میرا شوہر اب ہے نہیں۔ اس لیے کوئی خاص علاقہ پیرس سے نہیں رکھتی ہوں۔ واسطے بہت خوشی سے میں ہندوستان آ کر اس سکول کے لیے مدد کروں گی، میرے رہنے اور کھانے پینے کا بندوبست کر دو گی تو کافی ہو گا۔ [۲۳]

سرسید کی علمی تحریک سے متاثر ہو کر جن لوگوں نے مسلمان عورتوں کی تعلیمی اصلاح کی کوشش کی ان میں اردو کی خواتین سفر نامہ نگاروں کا بھی حصہ ہے۔ انھوں نے جہاں عورتوں کی تعلیمی اصلاح کے لیے راستہ ہموار کیا وہیں انھوں نے اپنے سفر ناموں کے ذریعے ایسی معلومات بہم پہنچائیں جن سے اس دور کی عورتوں کی نصابی کتابوں کی ضرورت بھی پوری ہوئی۔ سفر کے دوران یہ خواتین جس خطے میں بھی گئیں۔ انھوں نے وہاں کی تعلیمی، سماجی، ثقافتی اور اقتصادی معلومات سے اپنی ہم عصر بہنوں کو مطلع کیا۔ ان سفر نامہ نگاروں میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس نے مسلمان عورتوں کو جدید تعلیم کی اہمیت سے روشناس کرانے کا بیڑا اٹھایا، کیوں کہ اس وقت اس بات کی اشد ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ جب تک عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں تعلیم یافتہ نہیں کیا جائے گا اس وقت تک برصغیر کے مسلمانوں کی ازدواجی زندگی خوش گوار نہیں ہو سکتی۔ اس وقت تک مسلمانوں کا ایک طبقہ جدید تعلیم سے آراستہ ہو چکا تھا لیکن بد قسمتی سے ان کی عورتیں جاہل تھیں۔

بیگم صغرا ہمایوں بھی اس عہد کی ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ انھیں بھی ہندوستان کی عورتوں کی فلاح و بہبود سے خصوصی دل چسپی تھی۔ انھوں نے تعلیم نسواں کے لیے بڑا فعال کردار ادا کیا ہے۔ وہ برصغیر پاک و ہند کی عورتوں کو اپنے حق کے لیے منظم کرنا چاہتی تھیں اور ان تمام رسم و رواج کی مخالف تھیں جنھوں نے برصغیر کی عورتوں کی شخصیت کو تباہ کر دیا تھا۔ صغرا ہمایوں ایک ترقی پسند خاتون تھیں۔ اس لیے وہ تمام عورتوں کو آزاد اور تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے عورتوں کی کئی انجمنیں قائم کیں۔ بقول نصیر الدین ہاشمی:

> یہ انجمنیں نہ صرف حیدر آباد بلکہ مدراس اور دہلی وغیرہ شہروں میں بھی قائم کی گئیں۔ انجمن خواتین دکن کو انھوں نے ہی قائم کیا تھا اور انجمن خواتین اسلام کی وہ ایک عرصہ تک سیکرٹری رہیں۔ ۱۹۰۶ء میں جب لیڈی ڈاکٹرز زنانہ سوچل ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی گئی تو وہ ان کی دست راست تھیں۔ [۲۴]

عورتوں میں شعور بیدار کرنے اور حقوقِ نسواں حاصل کرنے کی ہمت پیدا کرنے کے لیے وہ تقریریں بھی کیا کرتی تھیں۔ انھوں نے نہ صرف عورتوں بلکہ مردوں کے جلسوں میں بھی تقاریر کیں تاکہ مرد بھی عورتوں کی جہالت اور ان کی حالتِ زار سے واقف ہوں اور ان کی ترقی کے لیے وہ خود بھی اٹھ کھڑے ہوں۔

سیر و سیاحت کے علاوہ بیگم صغرا کا دوسرا محبوب مشغلہ اشاعتِ تعلیمِ نسواں تھا۔ انھوں نے اپنی تصانیف و تالیف کے ساتھ ساتھ اس کوشش کو بھی جاری رکھا۔ اس مقصد کے لیے بیگم صاحبہ نے شہروں شہروں اور قصبہ و دیہات کا دورہ کیا اور عورتوں کی تعلیمی حالت کا جائزہ لیا اور اس مسئلے کی پسماندگی کو دور کرنے کے سلسلے میں حکمرانِ ریاست جیسے بیگمات بھوپال اور دوسری پڑھی لکھی و باشعور خواتین سے ملاقاتیں کیں، جلسے اور سیمیناروں میں شرکت کی اور ان اجلاسوں میں اپنے مطالبات پیش کیے۔ مثال کے طور پر ان کا سفر نامہ بھوپال و آگرہ ، دہلی کے حالات کا زیادہ حصّہ ان تعلیمی کاروائیوں پر مشتمل ہے۔

صغرا ہمایوں کی تعلیم و تربیت ایک پڑھے لکھے گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود گھر پر ہی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں شرفا اپنی لڑکیوں کو اسکول بھیجنا پسند نہیں کرتے تھے۔ انھیں خود بھی پڑھنے کا شوق تھا اور انھوں نے گھر پر ہی اپنی تعلیم کو جاری رکھا۔ مگر جب ان کی شادی نواب ہمایوں مرزا سے ہوئی تو انھوں نے ان کے شوق کو دیکھتے ہوئے علمی اور اصلاحی کاموں میں پوری آزادی دے دی۔ بیگم صغرا نے صحافت کے میدان میں بھی قدم رکھا اور ایک عرصہ تک حیدرآباد سے نکلنے والے خواتین کے رسالے "النساء" کی مدیر بھی رہیں۔ انھیں علمی و ادبی کام کرنے کا جنون تھا۔ ان کے ادبی اور اصلاحی کارنامے ان کے جنون کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ انھوں نے عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے اور عورتوں سے رابطہ رکھنے کے لیے اندرونِ ہند کے بہت سے سفر کیے۔ اپنے سفر کے حالات و واقعات اور مشاہدات و تجربات سلسلہ وار رسالوں (تہذیب نسواں اور عصمت) میں شائع کرواتیں تاکہ برصغیر کی خواتین ان معلومات سے فائدہ اٹھائیں اور اپنی آزادی کے لیے آواز بلند کریں۔ ہندوستان کے سفر نامے یہ ہیں۔ سفر نامہ پونا مدراس، روزنامچہ سفر بھوپال و آگرہ و دہلی کے حالات، رہبر کشمیر، سیر بہار و بنگالہ۔ ان تمام اسفار میں وہ ہر دم متحرک رہیں اور مختلف جلسوں اور کانفرنسوں میں عورتوں کی نمائندگی کی۔ انھوں نے مختلف شہروں میں خواتین کی انجمنوں کی رہنمائی کے علاوہ لڑکیوں کے سکول بھی قائم کیے۔ ایک جگہ سفر نامے میں وہ عورتوں سے یوں مخاطب ہوتی ہیں کہ آپ حضرات جو

سمجھدار اور پڑھی لکھی بیبیاں دلّی کی ہیں ایک انجمن قایم کریں تاکہ آپس میں اتحاد باہمی قایم ہو تبادلہ خیالات ہو اور اسی کے تحت میں اس مدرسہ کو چلائے۔[۲۵]

ایک اور جگہ عورتوں کی ترقی کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

> کانفرنس کی رائے میں بخیال ترقی دستکاری نسواں سال بھر میں تین دفعہ کم از کم ایک دفعہ ہر صوبہ کے مشہور شہر میں نمائش دستکاری نسواں ہوا کرے تاکہ ہند کی صنعت و حرفت میں بھی ترقی ہو اور اس ضمن میں کانفرنس کے مقاصد میں تکمیل میں بھی ترقی ہوتی رہے۔[۲۶]

بیگم صغرا ہمایوں کا سب سے بڑا کارنامہ ہندوستان کی مسلمان عورتوں کو جدید علم کی روشنی سے منور کرنا اور انھیں اپنے حقوق کے لیے منظم کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے نہ صرف ایک تحریک شروع کی بلکہ ان تحریکوں کی حمایت بھی کی جو ہندوستان میں اس مقصد کے لیے چلائی جا رہی تھیں۔ بیگم صغرا کا سفر نامہ یورپ بھی ہندوستان میں چلنے والی اصلاحی اور تعلیمی و سیاسی تحریکوں کے متعلق معلومات سے بھرا ہے۔ وہ یورپی ممالک کے نظام تعلیم اور مدارس کا جائزہ لیتی ہیں اور ایک ایسا ہی تعلیمی نظام وہ ہندوستان میں قائم کرنے کی خواہش رکھتی ہیں۔ سفر نامہ یورپ میں وہ عورتوں کی تعلیم و تربیت پر تقریر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ہمارے زنانہ مدرسے بھی قائم کیے جائیں اور ہر مدرسہ میں دار الاقامہ بھی ہو تاکہ طالبات کی تربیت اچھی ہو اور غیر مذاہب کی لاوارث لڑکیاں مسلمان بنا کر یہاں رکھی جائیں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ جس قوم کی عورتیں جاہل ہوں گی ہر گز وہ قوم ترقی نہیں کر سکتی۔[۲۷]

مصنفہ سفر نامہ یورپ میں فرانس کے تعلیمی نظام کے بارے میں لکھتی ہیں:

> میری ملاقات فرانسیسی لیڈی میڈم ڈوبرنی سے ہوئی انگریزی اچھی بول لیتی تھی۔ ان سے گفتگو رہا کرتی تھی۔ فرانس کے تعلیمی حالات جو ان سے معلوم ہوئے وہ یہ کہ پرائمری تعلیم کے عرض و طول فرانس میں ہزاروں مدرسے ہیں جن کا معیار مڈل تک سمجھنا چاہیے۔ یہاں تک تعلیم حاصل کرنا ہر لڑکے اور لڑکی کا گورنمنٹ کی طرف سے فرض ہے اور فیس بالکل معاف ہے۔ اس کے بعد سیکنڈری تعلیم کے مدارس بھی بہت ہیں۔[۲۸]

مصنفہ اس سفر نامے میں ہر ملک کا نظام اور تعلیم کے لیے گورنمنٹ کی کی گئی کوششوں کے بارے میں معلومات دیتی ہیں۔ بعض جگہوں پر وہ ہندوستان کی صورت حال پر کافی رنجیدہ بھی نظر آتی ہیں۔ ان کا پورا سفر نامہ کتب خانوں، کالجوں، آرٹ گیلری، ایسٹرن و ویسٹرن کلچر، سوسائٹی اور ہندوستان کی اصلاحی تحریکوں پر مشتمل ہے۔ سفر نامہ لکھتے ہوئے مصنفہ نے انگریزی کے الفاظ کثرت سے استعمال کیے ہیں جو ان کی تعلیم سے وابستگی کا ثبوت ہیں۔

عطیہ فیضی بھی اس عہد کی نامور خاتون ہیں۔ ان کی بھی ساری زندگی تعلیم و آزادی نسواں کے لیے جدوجہد کرتے گزری۔ وہ ایک علمی و ادبی گھرانے کی چشم و چراغ تھیں اور یہ خاندان بمبئی میں کاروباری حوالوں سے کافی شہرت رکھتا تھا۔ ان کی والدہ امیر النساء بیگم اپنے زمانے کی معروف ادیبہ و شاعرہ تھیں۔ اس کے علاوہ عطیہ فیضی کی بہنیں زہرا فیضی، نازلی رفیعہ سلطان بھی ادبی حلقوں میں کافی شہرت رکھتی تھیں اور رسالوں میں عورتوں کے مسائل پر باقاعدہ مضمون نگاری بھی کرتی رہیں۔

بیگم عطیہ فیضی کے اس عہد کے نامور سیاسی اور ادبی لوگوں سے گہرے مراسم بھی تھے اور وہ اپنے وقت کی آزاد خیال اور تعلیم یافتہ خاتون شمار ہوتی تھیں۔ ان کی نظر عمیق اور مطالعہ وسیع تھا۔ اپنے عہد کی تحریکوں سے بھی وہ متاثر تھیں اور بڑے سے بڑے سیاسی لیڈروں کی دلیرانہ گفتگو کرتیں۔ انہیں شاعری کا بھی اچھا ذوق تھا۔ ان کو ترکی کے سلطان نے تمغۂ "شفقت نشان" سے نوازا۔ پورے ہندوستان میں یہ واحد مسلمان خاتون ہیں جنہیں اس نشان کو حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ سماجی، اصلاحی اور خواتین کی تعلیم و ترقی میں بھی ان کا کردار نمایاں ہے۔[۲۹]

عطیہ فیضی ۱۹۰۶ء میں برطانوی سکالر شپ پر حصولِ تعلیم کے لیے انگلستان گئیں اور وہاں ایک کالج میں داخلہ لیا مگر اپنی دوسری اصلاحی اور ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے تعلیم پر توجہ نہ دے سکیں۔ ان کے سفر نامے زمانہ تحصیل سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ بعض وجوہات کی بنا پر ان کا تعلیمی سفر نامکمل رہا مگر ان کے علمی امور، ثقافت کی معلومات اور دانشوروں کے ساتھ روابط کی وجہ سے یہ سفر نامہ کافی اہم ہے۔ وہ انگلستان میں ایک تعلیم یافتہ ہندوستانی خاتون ہونے کے ناطے انگلستان کے علمی و ادبی، ثقافتی، میڈیا اور اہلِ سیاست کی توجہ کا مرکز بھی رہیں۔ انھوں نے یورپ کے مختلف شہروں کی سماجی، ادبی، علمی اور ثقافتی محفلوں اور اداروں کو قریب سے دیکھا۔ ان سے خود بھی متاثر ہوئیں اور ہندوستان کی عورتوں کو بھی اس معلومات میں شریک کیا۔ ان کا یہ سفر نامہ زہرا بیگم فیضی نے مرتب کیا

اور تہذیب نسواں میں شائع کرواتی رہیں، جس کی وجہ سے ہند کی گھریلو عورت کو باہر کی دنیا جاننے کا موقع ملا۔ اس عہد میں سفر نامے اس مقصد کی تکمیل کے لیے زیادہ تر لکھے جاتے تھے کہ بیرونی دنیا کے حالات سے آگاہ ہو کر خواتین اپنی زندگیوں میں تبدیلیاں لائیں۔ سفر نامہ زمانہ تحصیل کا زیادہ حصہ عطیہ کی اپنی تعلیمی سرگرمیوں پر مبنی ہے اور وہ اسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگلستان کی خواتین کے تعلیمی نظام پر روشنی ڈالتی ہیں:

> آج میں کہیں آئی گئی نہیں، کالج کا کام بہت تھا مثلاً نمبر ۴ اور نمبر ۵ کے کمروں کو درست حالت میں رکھنا یعنی صبح، شام کالج چھوڑنے کے پیشتر دیکھتے رہنا کہ سب کچھ وہاں پر درست ہے پھر چند کاغذ لکھ کر تیار کرنے ہوتے ہیں جس میں چند سوال دیے جاتے ہیں۔ ان کے جواب بغیر کسی کتاب دیکھنے کے دینے ہوتے ہیں گویا یہ چھوٹے چھوٹے امتحان ہیں ہر مضمون کا الگ الگ پرچہ ہوتا ہے۔ [۳۰]

اسی طرح ایک اور جگہ سفر نامے میں وہ اپنی ہندوستانی بہنوں کو لائبریری کے بارے میں معلومات یوں فراہم کرتی ہیں:

> اس عجائب خانے میں کتب خانہ ہے جہاں کتب بینی کی جگہ ہے۔ اس کمرے کی زمین موٹے ربڑ کی ہے کہ چلنے میں آواز نہ ہو۔ خاصے ہزار آدمی ایک وقت میں بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں مگر بناوٹ کی خوبی کا کیا بیان کروں۔ تمام میزوں کی قطار اور چو گرد دیوار جس میں پچاس ساٹھ لاکھ کتابیں موجود ہیں۔ اگر کتب بینی کا شوق ہے تو میز کے قریب بیٹھے اور کتاب کے نام کی چٹھی ایک جگہ رکھ دیجیے وہ کمرے کے ایک حصے میں جاتی ہے اور چند دقیقوں میں اپنے آپ وہ مطلوبہ کتاب چلی آتی ہے۔ کوئی کتاب ایسی نہیں جو شائع ہوئی ہو اور وہاں موجود نہ ہو۔ [۳۱]

بیگم عطیہ ہندوستان کے حالات کا موازنہ بھی کرتی ہیں اور اس کے اندر یہ آرزو ہے کہ ہندوستانی عورتیں بھی علم کی دولت سے مالا مال ہو جائیں۔ سفر نامے میں وہ ہر جگہ برطانوی معاشرت اور نظام سے خاصی متاثر نظر آتی ہیں۔ وہاں کی ایجادات، سائنس اور صنعت کے میدان میں ترقی انہیں خاصا مرعوب کرتی ہے۔ ان تمام چیزوں کا ذکر وہ حسرت سے کرتی ہیں کہ ہندوستان بھی ایسے ہی ترقی کر جائے۔ یہ سفر نامہ اپنے دور کی اہم دستاویز ہے جس میں عورتوں کی فلاح کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی ترقی کی خواہش بھی نظر آتی ہے۔

بیگم عطیہ فیضی کی طرح نشاط النساء (بیگم حسرت موہانی) کا نام بھی اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ وہ بیسویں صدی کی سیاسی و سماجی اور نسوانی تحریک کا حصہ تھیں۔ نشاط النساء نے چھوٹی سی عمر میں باقاعدہ تعلیم کا آغاز کیا اور اردو، فارسی، عربی کی ممکنہ تعلیم حاصل کی۔ ان کی تمام تعلیم و تربیت زمانے کے حالات کے مطابق گھر کی چار دیواری میں ہوئی۔ اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے قصبے کی لڑکیوں کو بھی لکھنا پڑھنا سکھاتی تھیں۔ ان کی تعلیمِ نسواں کی کوششوں کے متعلق عبدالشکور کا کہنا ہے کہ زمانہ دوشیزگی میں آپ کا مشغلہ یہ تھا کہ پس ماندہ قصبہ کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سیکھاتی تھیں اور آج اگر موہان میں تعلیم نسواں کی جھلک نظر آتی ہے تو محترمہ نشاط النساء کی کوشش اور مالی ایثار کا ثمر ہے۔ [۳۲]

بیگم حسرت نے مولانا کے ساتھ فریضہ حج کی ادائیگی اور مقامات مقدسہ کی زیارت کا شرف بھی حاصل کیا اور ان مقدس مقامات کے تجربات و مشاہدات اور واقعات کو سفر نامہ حجاز اور سفر نامہ عراق کے نام سے مولانا حسرت نے سفر ناموں کی شکل میں ترتیب دیا۔ نشاط النساء کا شمار بھی ان خواتین کی فہرست میں آتا ہے جنھوں نے برصغیر پاک و ہند کی مسلمان عورتوں کے اندر عصری تقاضوں کو سمجھنے کا شعور پیدا کیا اور انھیں جدید تعلیم اور برطانوی علوم و افکار کی حقیقتوں سے روشناس کرانے کے لیے عملاً اور تخلیقی میدان میں بھی کوشش کی۔ ان کے سفر ناموں کا تعلیم اور بیداریٔ نسواں کے حوالے سے مطالعہ کریں تو اس بات کا گہرا یقین ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی اپنے سفر ناموں کے ذریعے خواتین کی اصلاح کا فریضہ بخوبی نبھایا ہے۔ انھوں نے ہندوستانی خواتین کی دلچسپی کے تحت زیورات، ملبوسات، انواع و اقسام کے تعام کے ساتھ ان کو مختلف شہروں کی سماجی و تعلیمی صورت حال سے بھی آگاہ کیا ہے۔ بیگم حسرت اگرچہ مشرقی روایات و اقدار کی مثال تھیں مگر عورتوں کی آزادی اور تعلیم کی حامی تھیں۔ انھوں نے پسماندہ ہندوستان سے جب باہر نکل کر سرزمین عراق کی ترقی یافتہ عورتیں دیکھیں تو اس کا اظہار سفر نامہ عراق میں کرنے سے خود کو باز نہ رکھ سکیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> یہاں عیسائی اور یہودی بھی ہیں۔ مسلم اور غیر مسلم عورتوں کے پہننے کے لباس میں صرف اسی قدر فرق ہے کہ مسلمان لڑکیاں برہنہ سر اور ٹیڑھی مانگ نکالے، فراک گون موزے پہنے پنڈلیاں کھلی نظر آتی ہیں۔ یہودی اور نصرانی عورتیں بھی بالکل اسی طرح رہتی ہیں۔ بس ورنہ صورت، شکل اور کسی بات میں فرق نہیں۔ [۳۳]

بیگم حسرت کی پوری زندگی ایثار و قربانی اور آزادی کا نعرہ بلند کرتے ہوئے گزری۔ قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں ان کا نام کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ وہ ہر سفر و حضر میں مولانا کی دست راست رہیں۔ ان کے سفر نامے سے بھی ان کی جدوجہد کا پتہ چلتا ہے جیسے کہ وہ لکھتی ہیں، شام کو انجمن میں ایک جلسہ بھی تھا۔ خیر ہم سب عصر کے وقت دعوتوں میں چلے اور میرا ارادہ نہ تھا مگر مولانا نے کہا جلسہ میں چلو تو میں بھی ساتھ ہو گئی۔[۳۴]

تعلیم کے متعلق بھی اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کرتی ہیں کہ بغداد کے باشندے سب کچھ نہ کچھ اردو بول لیتے ہیں اور مطلب تو خوب سمجھ لیتے ہیں۔ انگریزی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔[۳۵]

اختر حمید (بیگم سربلند جنگ بہادر) اپنے عہد کی ایک روشن خیال و تعلیم یافتہ اور روایت شکن خاتون تھیں۔ انھوں نے بیگمات بھوپال کی سرپرستی میں قائم آل انڈیا لیڈیز کانفرنس کی شمولیت اختیار کی اور برصغیر کی مسلمان عورتوں کے حقوق اور آزادی کے لیے اس کانفرنس میں ریزولوشن پیش کیے۔ وہ دوسری مسلم خواتین کے ساتھ اس جدوجہد میں شامل رہیں۔ ان کی مستعدی اور فعال رکن آل انڈیا لیڈیز کانفرنس کے حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> قیصر دلہن صاحبہ نے کرسی صدارت پر ممکش ہو کر خطبہ صدارت پڑھا۔ اس کے بعد مسز سربلند جنگ بہادر صاحبہ نے ریزولوشن نمبر (۴،۵) کی تحریک کی۔ ان ریزولوشن کا منشاء یہ تھا کہ گورنمنٹ سے استدعا کی جائے کہ لیڈی ڈاکٹروں کی تعداد میں افزائش کرنے کے لیے لیڈی ڈاکٹروں کی تعلیم کا زیادہ انتظام کیا جائے اور زنانہ ہاسپٹل (شفاخانے) کی تعداد بڑھائی جائے۔[۳۶]

بیگم سربلند جنگ (اختر حمید) ایک ایسے ماحول کی پیداوار تھیں جہاں ایک طرف تو مغربی تہذیب و تمدن کا ایک نیا سورج طلوع ہو رہا تھا تو دوسری طرف ایک قدیم تہذیب کی قدریں مٹ رہی تھیں۔ اس دوراہے پر تمام ادیب و شاعر ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہیں۔ وہ مشرقی تہذیب کی پیداوار اور دلدادہ ہونے کے باوجود بھی مغربی طرز و تمدن کے حامی نظر آتے ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ مسلمان قوم جدید تعلیم حاصل کر کے اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر لیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہندوستان کے مرد و خواتین تمام کوشش کر رہے تھے۔ بیگم اختر حمید بھی اسی جدوجہد میں کسی سے پیچھے نہیں تھیں۔ انھوں نے عورتوں کے حقوق کے لیے تقاریر کیں جو "رسالہ تہذیب نسواں" اور "عصمت" میں شائع بھی ہوتی رہیں۔ بیگم اختر کا تعلق بھی طبقہ اشرافیہ کے نواب گھرانے سے تھا۔ وہ نواب سرور جنگ

محبوب علی خان کی بیٹی تھیں جو کہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے چیف آرکیٹکٹ تھے اور ان کی شادی بھی نواب گھرانے کے مولوی سمیع اللہ خان (سفر نامہ لندن) جو سر سید احمد خان کے قریبی دوست اور دستِ راست تھے۔ ان کے بیٹے حمید اللہ خان (چیف جسٹس حیدر آباد دکن) سے ہوئی۔ جنھیں انگریزوں کی طرف سے افضل العلماء اور سر بلند جنگ کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔

بیگم اختر نے نواب حمید اللہ کے ہمراہ ۱۲ نومبر ۱۹۰۹ء کو حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کے ساتھ یورپ کی سیاحت بھی کی اور سفر نامہ دنیا عورت کی نظر میں تخلیق کیا۔ اس عہد کی تمام تعلیم یافتہ خواتین اس دور میں چلنے والی تحریکوں سے متاثر تھیں اور وہ جہاں کہیں بھی جاتیں وہاں کی تعلیم اور عورتوں کی سماجی حالت کا بغور مشاہدہ کرتیں اور اپنے سفر ناموں میں بیان کرتیں تاکہ ہندوستانی عورتیں جو گھر کی چار دیواری کی دنیا سے ناآشنا ہیں وہ بھی دوسرے ملکوں کی خواتین کی سماجی حالت سے آشنا ہو سکیں۔ بیگم اختر بھی اسی نظریے اور مقصد کے تحت اپنے سفر کی معلومات دینے کے لیے روزنامچہ تحریر کرتی رہیں۔ سفر نامے میں سے عورتوں کی زبان اور لباس کے بارے میں ملاحظہ کیجیے:

> عورتیں صرف ایک ڈریسنگ گون یا مثل نیچی فراک پہنتی ہیں۔ سر پر ایک رومال کانوں تک باندھ لیتی ہیں۔ بچوں کو وہی فراک پہناتی ہیں۔ زبان خاص عربی بولتے ہیں۔ عیسائی تک عربی بولتے ہیں بلکہ یہاں کے عیسائیوں کو انگریزی آتی بھی ہے۔[۳۷]

ایک جگہ اسکول کے بارے میں یوں لکھتی ہیں:

> اس جگہ مشن اسکول بہت ہیں۔ بچوں کی تعلیم انگریزی، جرمن اور فرنچ زبان میں دی جاتی ہے۔ میں نے راستے میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو علاوہ ان ہر سہ زبان کے عربی زبان بولتے خوب سُنا۔ مجکو اپنے حال پر افسوس آیا کہ عیسائی تک عربی بولتے ہیں اور میں مسلمان ہوں مگر عربی نہیں بول سکتی۔[۳۸]

مصنفہ انگریزی زبان سے بھی خوب واقفیت رکھتی تھیں۔ انھوں نے دورانِ سفر جہاز پر انگریز خواتین سے دوستی کی اور ان کے ساتھ گفتگو کرتی رہیں۔ اسی طرح جب وہ لندن میں پرنس آف ویلز کے ہاں دعوت پر گئیں تو ان

سے اسی زبان میں بات چیت کی۔انھوں نے مغربی تہذیب و تمدن اور انگریزی تعلیم کے لیے اپنے بیٹوں کو بھی انگلستان بھیجا تھا۔دورانِ سفر انھوں نے اپنے بیٹوں سے بھی ملاقات کی اور پرنس نے ان کے بیٹے کی انگریزی کی تعریف بھی کی۔

محمودہ عثمان حیدر نے مشاہدات بلادِ اسلامیہ کے نام سے دو حصوں میں سفر نامہ لکھا۔مصنفہ کا تعلق ایک علمی وادبی خانوادے سے تھا۔وہ سید سجاد حیدر یلدرم کی حقیقی چچازاد بہن اور حکیم سید غلام حیدر کی بیٹی تھیں۔ان کی شادی بھی خاندان میں سجاد حیدر یلدرم کے بھانجے سید عثمان حیدر سے ہوئی جو کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ایک فرم اینگلو پرشین آئل کمپنی لمیٹڈ میں ملازم تھے۔مصنفہ کو اپنے اس مرتبے اور شان و شوکت کا احساس تھا۔پورے سفر نامے میں اس ملازمت سے اٹھائی گئی مراعات کا خصوصی کا تذکرہ بار بار آیا ہے۔مصنفہ بھی اپنے دور کی پڑھی لکھی خاتون تھیں اور ان کا گھرانہ بھی علم اور فضیلت میں بڑھ کر تھا۔ان کے پیشِ نظر بھی عورتوں کی فلاح و بہبود کا فریضہ بھی ضروری رہا اور سفر نامے میں بھی وہ ہندوستانی عورتوں کی حالت زار پر رنجیدہ ہیں۔ایک جگہ وہ یوں لکھتی ہیں کہ:

> ہمارے مرد بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرتے ہیں مگر عورتوں کی یونیورسٹی صرف گھر ہی میں ناظرہ قرآن پڑھنے تک محدود ہے۔ہزار میں دو چار اگر کچھ پڑھی لکھی ہیں تو وہ بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔وہ غیر ممالک کی نسوانی ترقی و گھر کی ہونہار لڑکیوں کو ویسا بنانے کی کوشش کریں۔یہ ہے ہمارے ملک و قوم کی حالت جہاں غلامی و زبان بندی کے اٹل قانون پر عمل کیا جاتا ہے۔[۳۹]

اس آزادی اور اپنے حقوق کی آواز بلند کرتے ہوئے وہ تمام بلادِ اسلامیہ کے مسلمانوں سے ایک عورت کی طرف سے دکھی فریاد یوں کرتی ہیں:

> اے بلادِ اسلامیہ میں آزادی کی زندگی بسر کرنے والو۔ہماری مدد کرو،ہمیں غلامی کی جکڑ بندیوں سے خدارا جلد آزاد کراؤ۔ہم دولت نہیں مانگتے حکومت نہیں مانگتے۔بس اپنا جائز حق مانگتے ہیں جو ہمارے اور تمھارے لیے یکساں قابلِ احترام ہے۔ہمارے مردوں کو شمشیر سے نہیں بلکہ اپنی تحریر و تقریر سے یہ بتادو کہ ہمارا بھی کتنا اور کیا حق ہے؟[۴۰]

اس اقتباس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ کے نزدیک عورت کی آزادی اور حق کتنی اہمیت رکھتا ہے۔انہی ہندوستانی بہنوں کی حالت زار پر وہ افسوس کرتی ہیں۔اس سفر نامے میں اس عہد کے سیاسی حالات کی بھی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔کوئی بھی ادیب اپنے ماحول یا معاشرے سے کٹ کر ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔اس کا ادب

اس کے معاشرے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اگر ہم خواتین کے سفر ناموں کا بھی جائزہ اسی تناظر میں لیں تو تمام خواتین نے اپنے عہد کے منظر نامے کو اپنے سفر ناموں میں بیان کیا ہے۔ ان کے سفر کا مقصد خواہ دیارِ مقدسہ کی زیارت تھا یا علمی سیاحت پر مبنی تھا یا ہندوستانی مقامات میں جلسے جلوس کی کاروائیاں، ہر جگہ اِن پڑھی لکھی سفر نامہ نگار خواتین نے اپنی دوسری پسماندہ بہنوں کے حق کے لیے آواز بلند کی اور انھیں دوسری قوموں کی عورتوں کی تعلیم و ترقی اور سماجی صورت حال سے آگاہ کرنے کے لیے اپنے سفر ناموں میں شعوری اور لاشعوری ان تمام باتوں کے بارے میں معلومات دیتی رہیں۔

۲۔ برصغیر کی مذہبی تحریکیں اور ان کے اثرات:

برسا برس سے ہندوؤں کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے شہنشاہ اکبر اپنی اوائل عمری سے ہی ہندوؤں کے قریب تھا۔ اس قربت کی وجہ سے انھوں نے نہ صرف ہندومت کے بہت سے عقائد و رسوم کو اپنا لیا تھا بلکہ کچھ فرائض اسلامی کو ممنوع بھی قرار دیا اور اس نے کبیرؔ اور گرونانک کی طرح باہمی اخوت کی پالیسی اختیار کی اور اسلام کی برتری ختم کر کے پورے ہند کو دار السلام سے لادینی سلطنت میں تبدیل کر دیا۔[۴۱] ایسے حالات میں حضرت مجدد الف ثانی کفر و الحاد کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے اکبر کی حکمت عملیوں کی خلاف جن کی وجہ سے اسلام تصوف کی غیر اسلامی صورتوں کی وجہ سے ملنے لگا تھا، ان لوگوں نے جہاد کیا۔ حضرت مجدد الف ثانی اور خواجہ باقی باللہ اس تحریک احیائے دین کے بانی تھے۔[۴۲]

بادشاہ اکبر نے بعد مغل شہزادہ دارا شکوہ بھی اکبر جیسے خیالات رکھتا تھا بلکہ لگتا کہ تھا کہ وہ اکبر سے بڑھ کر ثابت ہوگا۔ اس نے ہندومت اور اسلام کو بالکل ایک مذہب ہی سمجھا۔ جس کی وجہ سے راسخ العقیدہ لوگوں کی امیدیں اورنگ زیب سے وابستہ تھیں۔[۴۳] اورنگ زیب نے امور سلطنت سنبھالتے ہی حضرت مجدد الف ثانی کی راہ کو اختیار کیا اور سلطنت کو غیر اسلامی عناصر سے پاک رکھنے کی جدوجہد کی۔ مگر اس کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا اور نااہل حکمرانوں کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی اور ہندوؤں کو استحکام حاصل ہوا۔ پورا معاشرہ انحطاط اور انتشار کا شکار ہوا۔ مسلم معاشرہ نہ صرف سیاسی بلکہ اخلاقی لحاظ سے بھی کمزور سے کمزور تر ہوتا جا رہا تھا۔ ایسے حالات میں شاہ ولی اللہ نے اپنی فکری تحریک کا آغاز کیا۔ وہ ملت اسلامیہ کے عوارض سے آشنا تھے اور ان کے ذہن میں اسلام کا عملی تصور

موجود تھا۔ سب سے پہلے تو وہ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کو تباہی سے بچانا چاہتے تھے تاکہ ملک میں امن وامان قائم ہو اور پھر سیاسی و سماجی، مذہبی و ثقافتی اصطلاحات کا انقلاب برپا کیا جاسکے۔ ان کی یہ کوشش امرائے سلطنت کو سنبھالنے اور احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان بلانے کی صورت میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ [۴۳] یہ اور بات ہے کہ کاہل اور کوتاہ بین مغل حکمرانوں نے ان حالات سے فائدہ نہیں اٹھایا جنھیں شاہ ولی اللہ نے پیدا کیا تھا۔ لیکن پھر بھی انھوں نے لوگوں میں جو شعور بیدار کر دیا تھا اس سے بعد میں آنے والے مجاہدین و مصلحین شاہ عبد العزیز، سید احمد شہید، شاہ اسمٰعیل شہید، حاجی شریعت اللہ، تیتو میر آزادی کی جدوجہد میں مصروف رہے۔ اس تحریک سے وابستہ مجاہدین اسلام نے تحریک قیامِ پاکستان تک کفر کے خلاف جہاد کیا۔

حاجی شریعت اللہ نے اصلاح دین کی خاطر فرائضی تحریک شروع کی۔ اس کا دور تحریکِ مجاہدین کے ساتھ ساتھ ہے۔ اس تحریک کا اہم مقصد ان رسوم وعقائد کی اصلاح کرنا تھا جنھیں مسلمانوں نے غیر مسلموں سے روابط کے باعث اختیار کر لیا تھا۔ اس تحریک نے مسلمانوں کو اسلام کی حقیقی تعلیمات کی جانب متوجہ کرایا۔ فرائض کی پابندی اور بجاآوری پر زور دیا۔ وہ تمام رسومات اور تقریبات جس کی سند قرآن وسنت سے نہ ملتی تھی بدعت قرار دے کر ترک کرنے کی تلقین کی۔ بہت جلد اس تحریک نے بنگال کے ایک وسیع علاقے میں اپنے لاتعداد کی ایک اچھی خاصی جماعت تیار کر لی جو اسلام کے عقائد کردہ فرائض کی تکمیل کو مقدم سمجھتے اور اس لیے وہ فرائضی کہلاتے۔ [۴۵] یہ تحریک اپنی نوعیت کے اعتبار سے اسلامی ہونے کی وجہ سے عام مسلمانوں میں بہت مقبول ہوئی۔ اس کی مقبولیت کے بعد اس میں ایسی تعلیمات شامل ہو گئیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کے مقاصد سیاسی بھی تھے۔ حاجی شریعت اللہ نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ بنگال اب دار الاسلام نہیں رہا۔ اس لیے عیدین اور جمعہ کی نماز باجماعت اب یہ طریق مناسب نہیں ہو سکتی۔ اس فتویٰ سے حاجی صاحب کا مقصد اپنے پیروؤں اور عام مسلمانوں میں برطانوی حکومت کے خلاف جذبات پیدا کرنا تھا۔ ۱۸۴۰ء میں حاجی صاحب کے انتقال کے بعد اس کی قیادت آپ کے صاحب زادے محمد محسن دودو میاں کے سپرد ہوئی انھوں نے اس تحریک کو باقاعدہ منظم، سرگرم اور فعال سیاسی طاقت اور سماجی تبدیلیوں کی محرک وآئینہ دار بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ [۴۶]

اسی طرح تیتو میر کی تحریک نے انیسویں صدی کے وسط میں بنگال کے مسلمانوں کو کافی متحرک رکھا۔ لوگوں میں جوش وجذبے کو بیدار کیا اور انھیں انگریزوں کے خلاف نبرد آزما کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا اور یہ فرائضی تحریک

ایک ہی عہد کی پیداوار ہیں۔ تیتومیر تحریک کا آغاز بھی مذہبی اصلاح کی خاطر ہوا اور یہ بھی بعد میں سیاسی تحریک بن گئی۔ اس نے برطانوی تسلّط کے خلاف اور دوبارہ اسلامی حکومت کے قیام کے لیے آواز بلند کی۔ تیتومیر تحریک کے پیروؤں نے اسلامی تعلیمات اور مقاصد کو بنگالی مسلمانوں میں آزادی حاصل کرنے تک جاری رکھا۔[۵۷]

۳۔ سیاسی وسماجی تحریکیں:

بنگال پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی مکمل اجارہ داری کے بعد ہندوؤں نے انگریزوں کے ساتھ تعاون کیا اور ہر طرح کی مراعات حاصل کیں۔ ان دونوں کے باہمی اشتراک نے مسلمانوں کے تمام طبقات کو متاثر کیا۔ بنگال کے مختلف طبقوں میں انگریزی حکمت عملی نے مختلف اثرات مرتب کیے۔ ہندوؤں میں مسلمانوں کی نسبت انگریزی تعلیم سے دل چسپی کا رجحان پایا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ مسلمانوں سے آگے تھے۔ بنگال میں باضابطہ انگریزی مدارس کے قیام سے پہلے بنا۔ اس (ہندو قومیت کے احساس پر مبنی) ۱۷۹۱ء میں سنسکرت کالج قائم ہو چکا تھا۔ اس کالج کا مقصد ہندوؤں کے قوانین، علم وادب کی ترقی اور ہندو مذہب کی تعلیم قرار دیا گیا تھا۔[۵۸] اس دور میں ہندوؤں کی سرگرمیوں کا محور صرف تعلیم تھا۔ انگریزی تعلیم کے لیے ہندو مصلحین نے ۱۸۱۶ء میں سرکاری امداد کے بغیر ہی ایک ہندو کالج کی بنیاد رکھی اور چیف جسٹس ایڈورڈ ہائڈ اسٹ نے اس کالج کی تعمیر کے لییے بہت مدد کی۔ اس کالج کے لیے منظور شدہ تین زبانیں انگریزی، فارسی، بنگالی تھی مگر سب سے زیادہ زور انگریزی پر دیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کالج میں قدیم ہندو مذہبی نظریات کا پرچار بھی کیا جاتا تھا۔ اس طرح ایک اور ادارہ گودودھن آورتے نے ۱۸۲۳ء میں "اورینٹل سیمزی" کے نام سے قائم کیا۔ اسی سلسلے کی ایک اور کاوش راجہ رام موہن رائے نے دردیدانتا کالج کی صورت میں کی۔ جس میں بھی قدیم مذہبی علوم کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم کا بھی بندوبست کیا گیا تھا۔[۵۹]

مقامی زبانوں اور انگریزی تعلیم کے درمیان کوئی تناسب برقرار نہ رہنے کی وجہ سے تعلیمی حلقوں میں بے چینی اور فاصلے پیدا ہو گئے۔ اس دور میں مسلمان انگریزوں سے سیاسی اور مذہبی اعتبار سے مفاہمت پر آمادہ نہ ہوئے اور وہ انگریزی سے بھی دور رہے۔ انھوں نے فارسی اور اردو کو اپنے لیے کافی سمجھا اور اپنی تہذیب وثقافت سے دور نہ ہوئے۔ ان کے برعکس ہندوؤں نے انگریزی حکومت اور تعلیم کا خیر مقدم کیا۔ اس طرح وہ تمام شعبۂ ہائے زندگی پر چھا گئے۔ انگریزی تعلیم سے جو ہندو فیض یاب ہوئے۔ انھوں نے اپنے مذہب کے احیاء اور اس کی اصلاء اور اس کی

اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ راجہ رام موہن وہ پہلے رہنما ہیں جنھوں نے اپنے مذہب کی اصلاح کے لیے "برہمو سماج" کے نام سے ایک تحریک کا آغاز کیا۔ یہ پہلی اصلاحی تحریک تھی جس نے ہندو مت کے احیاء اور اصلاح کے علاوہ انگریزی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات سے اپنے عقائد کو سہارا دینا تھا۔ [۱۰] رام موہن کے بعد "برہمو سماج" کی ذمہ داری دوندر ناتھ ٹیگور نے اٹھائی۔ اس کے ساتھ ہی ٹیگور نے ۱۸۳۹ء میں ایک علیحدہ "انجمن تبلیغ حق" قائم کی جس کے مقاصد بھی برہمو سماج سے ملتے جلتے تھے۔ برہمو سماج کو بعد میں کیٹسب چندر سین نے چلایا۔ مگر ۱۸۶۵ء میں اس جماعت میں تفرقہ پیدا ہو گیا اور اسی انداز کی کئی تحریکیں اور انجمنیں مثلاً مدنا پور، کرشن نگر اور ڈھاکہ سماجین پیدا ہو گئیں۔ [۱۱]

ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کبھی اتحاد نہ ہوا اور وہ کسی نہ کسی مسلہ پر ایک دوسرے سے بد ظن رہے۔ ایسے حالات میں انگریزوں کے لیے یہ قطعی شکل نہ تھا کہ ہندوؤں کے ذہن میں مسلمانوں کے خلاف سازشی عناصر کو ہوا دے کر اپنے مقاصد کی تکمیل کرنا۔ لہذا انھوں نے ہندوستان پر اپنا تسلط قائم رکھنے کی غرض بارہا ایسی کوششیں کیں۔ انگریزوں نے ہندوستان کے بڑے طبقے ہندوؤں کو تعلیمی میدان اور سماجی انجمنوں کی تشکیل میں امداد فراہم کر کے انھیں برتری کا احساس دلایا اور ۱۸۵۷ء تک نہ صرف ہندو اور سکھ بلکہ یورپی اقوام بھی مسلمانوں کے خلاف ہو گئیں تھیں۔ ہندوؤں نے انگریزوں کی حمایت حاصل کر کے مسلمانوں کے خلاف ہر طرح کا پروپیگنڈا کرنے کی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ پھر رہی سہی کسر ان غیر مسلم انجمنوں اور تحریکوں نے پوری کر دی جو انھوں نے ایسے مذہبی احیاء کے نام پر قائم کیں۔

ان تحریکوں میں قومی وسیاسی رہنما بہت مستعد وفعال ہوئے۔ "انھوں نے اس کے ذریعے ہندوؤں میں قومی جذبہ حب الوطنی اور اپنے مذہب کی ترویج کی۔ اس سلسلے میں "آریہ سماج" نے بہت کام کیے۔ اس کا بانی دیانند سرسوتی مسلمانوں کا شدید ترین دشمن تھا۔ اس تحریک سے ہندو قومیت کو بڑی تقویت ملی۔ ہندوؤں کا مقصد ایک ہندوستانی قوم کی تشکیل اور ایک مشترکہ مذہب اور تہذیب کی بنیاد پر۔ اس لیے ان کا خاص منصوبہ "شدھی" تھا۔ یہ لوگ برملا کہتے تھے کہ ایک دن انگریز اور مسلمانوں سے بدلہ لیں گے۔ یہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان ہندوستان میں رہیں اور انھوں نے مسلمانوں کی جتنی مخالفت کی، کسی اور جماعت نے نہیں کی۔ انیسویں صدی کے اواخر تک ہندوستان میں اسی طرز کی ہندوؤں کی تحریکیں اور جماعتیں قائم ہوئیں۔ [۱۲]

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کے لیے حالات بڑے خراب تھے۔ وہ اپنے سیاسی زوال، دشمنوں کی معاندانہ سرگرمیاں اور معاشرتی ابتری کی وجہ سے ہر طرف سے مشکلات کا شکار تھے۔ لیکن ان تمام نامساعد حالات کے باوجود بھی وہ مطمئن اور خاموش نہ بیٹھ سکے۔ اس جنگ کی ناکامی کے بعد مسلمانوں میں طرزِ فکر کے اعتبار سے دو گروہ بن گئے۔ ان میں سے ایک گروہ اپنے قدیم طرزِ زندگی اور فکر پر قائم تھا اور یہ انگریزی کی ہر چیز سے متنفر تھے۔ مگر دوسرا گروہ اس کے برعکس تھا کیوں کہ انھوں نے انگریزی تہذیب کے اثرات اور ہندوؤں کا جدید مغربی نظام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے ثمرات دیکھ لیے تھے۔ [۵۱]ان لوگوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ ان کی موجودہ پستی اور ناکامی کی اصل وجہ انگریزوں سے عداوت اور دشمنی ہے۔ انھیں اپنے اختلافات کے باوجود اپنے رویّے پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور زمانے کی چال کا ساتھ دیتے ہوئے انھیں انگریزی حکومت میں ملازمتیں ملیں اور وہ ذلت کی زندگی سے نکل سکیں۔ ان لوگوں نے اپنی دور اندیشی اور مصلحت بینی سے مسلمانوں کے لیے عافیت کا راستہ جدید نظام کو اپنا لینے میں سمجھا۔ اس گروہ نے روایت پرستی اور مراجعت پسندی کے ساتھ ساتھ ترقی پسندی کو زیادہ اہم جانا اور انگریزی تعلیم و جدید نظریات کے حصول کو مسلمانوں کے لیے ضروری قرار دیا۔ اس طرح کے طرزِ فکر کی ایک ہمہ گیر تحریک جس نے ہندوستان کے متوسط اور اونچے طبقے کے مسلمانوں کو متاثر کیا اور انھیں اپنے حلقہ میں لے کر ان میں ایک انقلاب برپا کر دیا وہ سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک تھی۔ [۵۲]اس تحریک نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے عملاً اور قولاً ایسے اقدامات کیے کہ جس کے ثمرات قیامِ پاکستان کی صورت میں ظاہر ہوئے۔

ہندوستان میں ہندوؤں نے ابتدا سے ہی انگریزی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی تھی اور تعلیم کے پیدا کردہ شعور کی وجہ سے ان میں مختلف اصلاحی، مذہبی تحریکوں قائم کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔ جس نے ہندوؤں میں "ہندو قومیت کے احیاً" کا جذبہ شدید تر کر دیا اور ان کے عمل و فکر کا رخ صرف ہندو فرقہ پروری کی جانب مائل ہو گیا تھا۔ "انیسویں صدی کے آخر تک ہندوؤں نے قومیت، وطنیت اور مغربی جمہوریت کے تصورات اخذ کر لیے تھے۔ اس لیے ان میں یہ سوچ بیدار ہوئی کہ وہ بھی ہندوستان میں اپنے لیے ایک باقاعدہ تحریک چلائیں اور انگریزوں کی سرپرستی میں جمہوری قومی حکومت کا مطالبہ کریں اور ہندوستان میں وہ اکثریت کی تعداد میں ہیں اس لیے ان کو کوئی حیثیت دیں۔ [۴۸]

۱۸۶۱ء کی انڈین کونسل کی معرفت غیر سرکاری اراکین کی نامزدگی ۱۸۰۷ء سے انڈین سول سروس میں ہندوؤں کی کامیابی اور اعلیٰ عہدوں کا حصول اور ۱۸۶۲ء کی اصلاحات کی رو سے انتخابات کے ذریعے ہندوستانی اراکین کا انتخاب، ایسے اقدامات تھے جن سے ان کے طرزِ فکر کو تقویت مل رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی طور پر ایک ایسا ہی سیاسی فکر و تصور ہندوؤں میں ابھر رہا تھا جس کی اساس قومیت، وطنیت اور جمہوریت کے نظریہ حیات پر تھی اور جو قطعی طور پر مغرب سے مستعار تھا۔ اس صورت حال کو جب انگریزوں نے دیکھا کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم اور سیاسی نظریات سے ہندوستانی قومیت کی تشکیل ہو رہی ہے تو انھوں نے خود ہی یہ کوشش کی کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم اور سیاسی نظریات سے ہندوستانی قومیت کی تشکیل کی کوئی ایسی قوتی وسیاسی جماعت قائم ہو مگر وہ جماعت برطانوی حکومت کے ماتحت اور زیرِ سایہ ہو۔ ہندوستان میں پہلے بھی مختلف علاقوں میں ہندو تنظیمیں اور انجمنیں وجود میں آچکی تھیں اور البرٹ بل کی ناکامی سے ان میں کافی ہلچل پیدا ہو گئی تھی کیوں کہ اس بل کو ناکام بنانے میں انگریزوں نے جو کوششیں کیں تھیں۔ ان کو ہندوستانیوں نے بڑی حد تک محسوس کر لیا تھا۔ انگریزوں کو ہندوستانیوں کی بڑھتی ہوئی بے چینی سے یہ خطرہ پیدا ہوا کہ یہ صورت حال کوئی سنجیدہ صورت اختیار نہ کر لے۔ اس لیے اے۔ او۔ ہوم نے انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو ایک قومی و سیاسی جماعت قائم کرنے کا مشورہ دیا اور اس طرح ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس وجود میں آئی۔[۴۹] اس جماعت کی قیادت اور نگرانی کافی عرصہ تک انگریزوں کے ہاتھ میں رہی اور سر ولیم ویڈر برن دو مرتبہ اور ڈیوڈ یول، ڈبلیو ایس کین، چارلس بریڈیو، سیموئیل اسمتھ اور ڈاکٹر کلارک ایک ایک بار اس کے صدر مقرر ہوئے۔ کانگرس کے اجلاس میں شرکت کے لیے عہدہ داران انگلستان سے خصوصی طور پر آتے تھے۔ یہ کانگرس جماعت حکومت برطانیہ کے اس قدر قریب تھی کہ ابتدا میں اے۔ او۔ ہوم نے کافی کوشش کی کہ گورنر اس جماعت کی صدارت کیا کرے۔[۵۰] اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جماعت کو قائم کرنے سے انگریزوں کا اصل مقصد کیا تھا اور سلطنت برطانیہ سے مکمل وفاداری اس کی بنیاد تھی۔

مسلمانوں میں سر سید احمد خان وہ پہلے شخص تھے کہ جنھوں نے کانگرس کے مقصد کو صحیح طور پر سمجھا تھا اور کانگرس کے خلاف ان کے دیئے گئے بیانات کو ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کا نصب العین قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ بیانات انھوں نے دسمبر ۱۹۸۷ء کو لکھنؤ میں اور ۲ مارچ ۱۸۸۸ء میں میرٹھ سے دیے تھے۔[۵۱] سر سید احمد خان کے بیانات کو ۱۸۹۲ء کے آئین کے جواب میں مسلمانوں کا نقطۂ نظر سمجھنا چاہیے اور اس آئین کو ۱۸۶۱ء کے آئین کی ترمیم کہا جا سکتا ہے۔ اس آئین کی رو سے مرکزی اور صوبائی کونسلوں کی رکنیت کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ اس کے تحت

۱۸۹۳ء میں انتخابات ہوئے اور انتخابی حلقے مخلوط تھے۔ ان انتخابات میں مسلمان نمائندوں کو شدید ناکامی اٹھانا پڑی۔ اس سے پہلے میونسپل اور ڈسٹرکٹ کونسل کے انتخابات میں بھی مسلمانوں کے ساتھ ایسا ہو چکا تھا مگر ہندوؤں نے اس طریقہ کار کو بخوشی قبول کر لیا۔ اس تمام صورت حال سے مسلمانوں کو خطرہ محسوس ہوا کیوں کہ وہ اقلیت میں تھے۔ انھوں نے اپنے تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے جداگانہ انتخابات اور علیحدہ نشتوں کا مطالبہ کر دیا۔ [۵۴]

ہندوؤں کی مختلف سیاسی تحریکوں اور جماعتوں کے جواب میں یہ بات بہت ضروری تھی کہ سر سید احمد خان بھی مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے ایک مسلم جماعت "محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا" کی تنظیم کرتے۔ ان کے تصورات یہ کہ (۱) ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ بر عظیم ہے۔ (۲) ہندو اور مسلمان ایک نہیں، دو الگ الگ قومیں ہیں۔ (۳) علیحدگی بہر حال لازمی ہے۔ (۴) ایک اکثریت ووٹ سے قائم کردہ نظامِ حکومت میں نہ مدغم ہو سکتے ہیں نہ انھیں کہا جانا چاہیے۔ یہ مطالبے پاکستان کی بنیادیں استوار کرتے ہیں۔ [۵۵]

یہ ایک حقیقت ہے کہ سر سید کی تحریک مسلمانوں میں قومیت کا احساس پیدا کرنے کا سبب بنی ہے۔ اس تحریک نے نہ صرف ہندوستان میں ایک متحدہ مسلم قومیت کے خیال کو زندہ رکھا بلکہ آگے چل کر تحریک آزادی میں جان ڈالی اور دوسرا وفادار اور جان نثار رہنما بھی اس تحریک کو دیئے۔

حکومت برطانیہ کچھ عرصہ سے اس سوچ و بچار میں تھی کہ بنگال کی جس میں مشرقی و مغربی بنگال، اڑیسہ اور بہار کی ریاستیں شامل تھیں۔ اس کو از سرِ نو تقسیم کر دیے۔ اس تقسیم کے منصوبے کا اعلان ۱۹۰۳ء کے آخر میں کیا گیا اور پھر ۱۹۰۵ء میں اس کو نافذ کر دیا گیا۔ اس تقسیم کا ایک اتفاق یہ ہوا کہ آسام اور مشرقی بنگال نے صوبے میں مسلمان اکثریت میں تھے اور مسلمانوں نے اس تقسیم کا خیر مقدم کیا۔ نواب سلیم اللہ خان اور ان کے ساتھیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے سیاسی امور کی ترجمانی کے لیے ایک الگ جماعت ہونی چاہیے چناں چہ محمڈن پراونشل یونین قائم کی گئی۔ [۵۶]

مسلمانوں کے برعکس ہندوؤں نے اس تقسیم بنگال کے خلاف بہت زیادہ اشتعال کا مظاہرہ کیا اور کانگرس جماعات نے ہر سطح پر اس کی مخالفت کی۔ جب مسلمانوں کو اس بات کا پتہ چلا کہ حکومت برطانیہ ۱۸۹۲ء اور ۱۹۰۴ء کے بعد نئی اصطلاحات کرنا چاہتی ہے جو مجالس مقننّہ میں توسیع اور انتخابات کے میدان کو وسیع کرنا چاہتا ہے تو مسلمانوں

نے اپنے تحفظ کے لیے اپنا ایک وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس وفد نے یہ مطالبہ کیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو صرف ایک اقلیت نہ سمجھا جائے بلکہ ان کے حقوق اور ذمہ داری کا تحفظ کیا جائے۔ مسلمانوں نے تنسیخ بنگال کے فیصلے کے بعد محسوس کیا کہ کانگرس صرف اپنے مفادات کا تحفظ کر رہی ہے اور مسلمانوں کو اپنے مفادات اور تشخص کی حفاظت کے لے ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو تمام مسلمانوں کی نمائندگی کر سکے اور بالآخر ۱۹۰۶ء میں سلیم اللہ خان کی دعوت پر برصغیر کے مسلمانوں کے اجتماع نے مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔[۵۷]

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) میں ترکی کا ممالک وسطیٰ سے اتحاد پر مسلمان ہند میں بڑی بے چینی پھیل گئی۔ سلطنت عثمانیہ کے بہت سے علاقے ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۶ء تک مغربی طاقتوں کے قبضے میں آچکے تھے۔ برصغیر پاک وہند کے مسلمان مغربی شہنشاہیت کی اسلامی ممالک میں مچائی گئی تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ مسلم اُمہ کی سیاسی قوت کا آخری قلعہ سلطنت عثمانیہ تھی جو اپنے دشمنوں کے نرغے میں پھنسی ہوئی تھی۔ برصغیر کے مسلمانوں کو سلطنت عثمانیہ سے کافی ڈھارس تھی۔ یہ لوگ خود بے شک اپنے سیاسی حقوق کھو چکے تھے مگر سلطنت عثمانیہ سے انھیں یہ تسلی ملتی تھی کہ ایک آزاد اسلامی مملکت موجود ہے جسے خلافت کا خرچ طلب بار اٹھانے کا امتیاز بھی حاصل ہے۔[۶۳] چناں چہ مسلمانوں کے جذبات شدت سے ترکی کے حق میں تھے جو ایک طویل عرصہ تک اتحاد اسلامی کا خواب دیکھ رہا تھا۔

ترکی میں پے در پے جو واقعات رونما ہوئے وہ مسلمانوں کے لیے مایوس کن اور دردناک تھے۔ انگریزوں نے قسطنطنیہ پر ظالمانہ قبضہ، موصل پر جارحانہ اقدامات اور پھر ترکوں پر ۱۹۲۰ء میں معاہدہ سیورے عائد کیا گیا جس نے سلطنت عثمانیہ کو ختم کر کے ترکی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا۔[۶۴] سلطنت عثمانیہ کے مسلمانوں کے جذبات کو اس قدر مشتعل کیا کہ اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ لوگ تقریباً دو صدیوں سے انگریزوں کی محکومی میں تھے اور ان کی سیاسی چال بازیوں اور مصائب سے آگاہ تھے۔ مگر ترکی کے معاملے میں وعدہ خلافی پر، ان کے سارے جذبات ایک تحریک کی صورت میں بہہ نکلے۔ جس تحریک نے برصغیر میں دوسری تمام تحریکوں سے بڑھ کر حکومت برطانیہ کو متزلزل کر دیا وہ تحریک خلافت تھی۔[۶۵] مسلمانوں نے اس تحریک میں حصہ تمام نتائج سے بے نیاز اور مصائب و آرام سے بے پرواہو کر لیا۔

پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر حکومت برطانیہ نے یہ اعلان کیا تھا کہ جنگ کے دوران ہندوستان کے لوگوں کی وفاداری کے صلے میں انھیں حکومت میں زیادہ حصہ دیا جائے گا۔ مگر انھوں نے اپنے اس فیصلہ کے برعکس "رولٹ ایکٹ" نافذ کر دیا۔ اس ایکٹ میں حکومت کو یہ اختیار دیا تھا کہ جن لوگوں پر دہشت گرد سرگرمیوں میں حصہ لینے کا شبہ ہو ان کو بغیر کسی عدالتی کارروائی کے قید کر دیا جائے گا۔[۶۶] یہ قانون ہندوستانیوں کی سخت مخالفت کے باوجود ۱۹۱۹ء میں منظور ہر گیا۔ جس کے نتیجہ میں گاندھی جی نے "سینہ گرہ" کی مہم شروع کی۔

اس کے علاوہ امرتسر میں مسلم لیگ، کانگرس اور خلافت کانفرنس کے بیک وقت سالانہ اجلاس منعقد ہوئے۔ اس اجلاس میں مسلمان اور ہندو رہنماؤں کے درمیان ایک مفاہمت ہوئی جس نے ہندوستانیوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ سلطنت برطانیہ کے خلاف ایک تحریک منظم کر سکیں۔ اگست ۱۹۲۰ء میں برطانوی حکومت سے عدم تعاون کا ایک منصوبہ تیار کیا گیا اور کانگرس کے اجلاس میں اس کی قرارداد متفقہ منظور ہوتی۔ اس میں تمام ہندوستانیوں کو یہ مشورہ دیا گیا کہ وہ برطانوی حکومت کے عطا کردہ تمام اعزازی عہدے اور خطاب واپس کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی سرکاری اور نیم سرکاری تقریبات میں شرکت سے بھی انکار کریں۔[۶۷] برطانوی عدالتوں، ان کے انتخابات مجالس مقننّہ اور غیر ملکی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔ تمام تعلیمی ادارے جن کو حکومت چلاتی ہے یا ان کی امداد کرتی ہے ان تعلیمی اداروں سے طلبہ کو ہٹا لیا جائے۔ اس تحریک کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی اور مسلمانوں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

بیسویں صدی کے شروع میں ہی برعظیم کی سیاست میں اہم تبدیلیاں ہوئیں جو بلاشبہ ہندوستان کی سیاست پر اثرانداز ہوتی ہے جو اردو ہندی تنازعہ، مسلم لیگ کا قیام، بنگال کی تقسیم اور پھر سودیشی تحریک شامل ہیں۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ اہل ہندوستان کو صرف ہندوستانی مصنوعات ہی استعمال کرنی چاہیے۔ اس طرح ہندوستانی تجارت اور صنعت ترقی ہو سکتی ہے اور مزدوروں و غریبوں کا معیارِ زندگی بہتر ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں برصغیر کے لوگوں نے بیسویں صدی کی ابتدا میں ہی سوچنا شروع کر دیا تھا۔[۶۸] رسائل واخبارات میں اس تحریک سے متعلق قومی وسیاسی رہنما اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے تھے۔ مولانا حسرت موہانی پہلے شخص تھے جنھوں نے سودیشی تحریک میں عملاً حصہ لیا اور اس کی قیادت کی۔ انھوں نے سودیشی کپڑوں کی دکان "سودیشی اسٹور" کے نام سے کھولی اور ملک میں اس طرح کی جابجا شاخیں قائم کرنے کے بارے میں چاہا۔ اس تحریک میں مولانا شبلی اور نواب وقار الملک نے بھی مدد کی۔[۶۹]

۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ اور اس کے بعد رونما ہونے والے واقعات نے مسلمانوں کو پہلے سے زیادہ سیاست میں ملوث کر دیا تھا۔ اب وہ اپنے حالات کے علاوہ ان حادثات سے بھی متاثر ہو رہے تھے جو بلادِ اسلامیہ کو پیش آرہے تھے۔ مغربی استعماری طاقتیں ہر جگہ مسلمانوں کا استحصال کر رہی تھیں اور ان کی سیاسی سازشیں ظاہر ہو رہی تھیں۔ ان حالات میں برصغیر کے مسلمان اب بیدار ہو کر عملی سیاست میں حصہ لے رہے تھے۔ ان کوششوں میں مولانا ظفر علی خان، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر کی خدمات نمایاں ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے اسلامی ممالک میں جمال الدین افغانی کی سیاسی قیادت سے غیر ملکی استعماریت سے چھٹکارا پانے اور قوم، وطن اور نسل کے محدود تصورات سے بالاتر ہو کر اسلام کے تصورات کو اپنانا اور تمام اسلامی ممالک کے باہمی تعاون سے ایک مضبوط اسلامی اتحاد کی تحریک شروع ہو گئی تھی۔ مسلمانوں کے دلوں سے برطانوی حکومت کا اعتبار مختلف حادثات مثلاً کان پور میں مسجد مچھلی بازار کا حادثہ، تقسیم بنگال کی منسوخی کی وجہ سے اٹھ گیا تھا۔[۷] اور جب ہندوستان کے علاوہ دوسرے اسلامی ممالک میں مسلمانوں کو برطانوی حکومت نے نقصان پہنچانا شروع کیا تو اخوت اسلامی کا جذبہ ہندوستان کے مسلمانوں میں بھڑک اٹھا۔ جب ۱۹۱۱ء میں اٹلی اور بلقانی ریاستوں نے سلطنت عثمانیہ کو تقسیم کرنے کے لیے جارحانہ کاروائیاں کیں تو مسلمانوں کی ہمدردیاں ترکی کے ساتھ اتنی بڑھ گئیں کہ انھوں نے اٹلی اور برطانیہ کے سامان کا مقاطعہ شروع کر دیا اور ترکی کی امداد کرنے کے لیے چندہ جمع کیا۔[۸] ہندوستان میں سیاسی و قومی رہنماؤں کے علاوہ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کی تحریروں نے مسلمانوں میں اتحاد اسلامی کے جذبات پیدا کر دیے تھے۔

تحریک ریشمی رومال کے سرکردہ رہنما مولانا محمد الحسن اور مدرسہ دیوبند کے فارغ التحصیل طلبأ تھے۔ انھوں نے اس تحریک کے ذریعے مغربی استعماری طاقتوں کے خلاف عملی اقدامات کرنے کے سلسلے میں سلطان عبدالمجید سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مولانا محمود الحسن نے اپنے ایک شاگرد مولانا عبیداللہ سندھی کو افغانستان بھیجا[۹] تاکہ وہ وہاں کے قبائل فرقوں اور حکومتی افراد کو ترکوں کی حمایت کے لیے آمادہ کریں۔ اس تحریک کے شرکا آپس میں پیغام رسانی کے لیے ریشمی پارچے استعمال کرتے تھے جس پر ہندوستان کی آزادی اور ترکوں کی امداد کے متعلق تحریریں درج ہوتی تھیں۔ اس جہادی پیغام رسانی کی کوشش کو تحریک ریشمی رومال کہا جاتا ہے۔

اس تحریک کو ۱۹۲۵ء میں مرہٹہ ڈاکٹر بجوری نے شروع کیا۔ یہ تحریک مرہٹہ قوم پرستی اور ہندو مذہب کے

فروغ پر مبنی تھی۔اس تحریک کے متشددانہ فکر سے بعد میں "بھارتیہ جن سنگھ" پیدا ہوئی جو آج تک بھارتی مسلمانوں سے متصبانہ اور اشتعالی جذبات کا اظہار کرتی رہتی ہے۔[43] اسی طرح کی ایک اور سیاسی ہندو مہاسبھا تھی۔ یہ بھی کانگرس کی طرح متحدہ قومیت کی حامی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کانگرس ہندوستانی کا لفظ استعمال کرتی تھی مگر مہاسبھا وہاں صرف ہندو کا۔ یہ جماعت اس قدر کٹر تھی کہ کسی مسلمان کو اس میں شامل نہ کیا۔اس کا مقصد صرف مسلمانوں کی مخالفت ہی رہا۔

اردو سفر نامے کی ابتدا بھی اس عہد میں ہوئی جب ہندوستانی سماج ایک غیر ملکی سامراجی اقتدار کے زیرِ اثر سیاسی، تعلیمی اور سماجی تبدیلیوں سے دوچار تھا۔ خاص طور پر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد مغربی افکار وعلوم کے فروغ نے ہندوستان کے سیاست دانوں، ادیبوں اور دانش وروں کو ایک نئے تصورات، نئ اقدار اور نئ تہذیب سے روشناس کیا۔ اس نو آبادیاتی ہندوستان میں جو اصلاحی، سیاسی اور سماجی تحریکیں چل رہی تھیں۔ ان سے متاثر ہو کر بہت سی خواتین بھی گھر کی چاردیواری سے نکل کر ان میں شامل ہو گئیں تھیں۔انھوں نے آزادی کے اس سفر میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا جیسے بی اماں، مسز گاندھی، بیگم حسرت اور دیگر خواتین وغیرہ۔ان خواتین نے نہ صرف خود حصّہ لیا بلکہ اس تحریکِ آزادی کی جدوجہد کے دوران مردوں کی اچھی خاصی تعداد جب انگریز زندانوں میں قید تھے تو ان گھرانوں کی عورتوں نے جس طرح اپنے گھروں کو سہارا دیا اور معاشرتی سرگرمیوں میں بھی فعال رہیں یہ ہماری قومی تاریخ کا ایک شاندار باب ہے۔

انیسویں صدی کا دور ہندوستان کی سیاسی، ثقافتی، اقتصادی اور سماجی زندگی میں کئی تبدیلیوں کا آئینہ دار ہے۔ خصوصاً مغربی اور مشرقی تہذیب کے تصادم نے کئی رجحانات کو جنم دیا جس کی جھلک اس نو آبادیاتی عہد کے تقریباً تمام سفر ناموں میں نظر آتی ہے۔ خواتین سفر نامہ نگاروں نے اپنے عہد کے بدلتے ہوئے حالات کو اپنے سفر ناموں میں بھی بیان کیا ہے۔اس لحاظ سے ان سفر ناموں کی اہمیت ایک سیاسی وسماجی دستاویز کی سی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس دور میں لکھے گئے سفر ناموں میں اس عہد کے سفر نامہ نگاروں کے ایک مخصوص زاویہ نگاہ کا احساس ہوتا ہے جو ان کی شخصیتوں، خیالات اور تصورات کو آشکار کرتا ہے۔انھوں نے اپنے سفر ناموں سے معاشرتی اصلاح کا کام لیا ہے۔اردو میں نواب سکندر بیگم نے سفر نامہ نگاری کا آغاز کیا۔ وہ پہلی سفر نامہ نگار خاتون ہیں جنھوں نے ہندوستانی اور عرب معاشرے کی سیاسی، سماجی اور اخلاقی زندگی کی تصویر کشی کی۔انھوں نے بہت سی سیاسی شخصیات شریف و پاشااور

فریخ قونصل جدّہ کی بیگم سے ملاقات کی اور اس کی معرفت نپولین کو سلام بھیجنے کا ذکر بھی موجود ہے۔ یہ سفر نامہ چوں کہ اس ابتدائی دور کا نمونہ ہے جب ہندوستانی خواتین تبدیلیوں کے پُر آشوب دور سے گزر رہی تھیں اور کسی بھی چیز کا تعیّن کرنا نا ممکن تھا۔ حکمران بھوپال ہونے کے باوجود وہ انگریزوں کی مخالفت کرنے کی بجائے ان کی خیر خواہ نظر آتی ہیں۔ بقول محمد امین زبیری "جس طرح وہ ہندوستان میں بہ لحاظ اپنے نظامِ حکومت اعتبار، وفاداری، خیر خواہی تاج برطانیہ میں سب سے ممتاز تھیں۔"[۷۴]

اسی طرح نواب سلطان جہاں جب یورپ کی سیاحت پر جاتی ہیں تو سلطنت برطانیہ کی شاہی مہمان بنتی ہیں۔ ان کی رسم تاج پوشی میں شرکت کرنے کے علاوہ دیگر تقریبات میں بھی مدعو ہوتی رہیں۔ اس سفر نامہ سیاحت سلطانی میں سیاسی امور اور معاملات حکومت کی کہانی بھی پوشیدہ ہے۔ وہ خود ایک حکمران تھیں اور برصغیر کی سیاست پر اثر انداز ہونے والے واقعات اور تحریکات کا حصّہ تھیں۔ اس لیے سفر نامہ میں بھی اس کے اثرات نظر آتے ہیں۔

بیگم نازلی نے اپنے سفر نامے میں ہند و یورپ کی تہذیب و ثقافت اور سماجی و سیاسی حالات کے بارے میں لکھا ہے۔ جہاں کہیں وہ یورپی سماج سے متاثر ہوتی ہیں وہاں دونوں ممالک کا موازنہ بھی غیر شعوری کرنے لگتی ہیں۔ چوں کہ مصنفہ نے ایک عورت کی نظر سے یورپ کو دیکھا ہے تو وہاں کی سیاست و معیشت کے بارے میں بھی بہت سی معلومات دیتی ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں سیاسی اور اصلاحی تحریکیں بھی چل رہی تھیں تو مصنفہ کے ساتھ ساتھ بیرونی ممالک کے لوگ بھی ہندوستان کی صورت حال سے بے چینی میں تھے۔ سفر نامے میں مصنفہ سیاست کے حوالے سے یوں لکھتی ہیں کہ بعد ازاں ہندوستان کے متعلق دریافت کیا گیا کہ ہندی کیا چاہتے ہیں کہ آزاد یا خود مختار ہو جائیں، جمہوری حکومت انھیں پسند ہے یا نہیں۔[۷۵] ایک اور جگہ لکھتی ہیں کہ آج کل کی سیاسی حالت پر بہت دیر تک بحث ہوئی۔ خاص کر ہندوستان کی موجودہ حالت پر۔ یہ سب یہاں بہت بے چین ہو رہے ہیں کہ اس بلوے کو کس طرح فرو کریں۔[۷۶] اس سفر نامہ میں بیگم نازلی اور ان کے شوہر کی سلطنت برطانیہ کے اکابرین سے ملاقاتیں اور شاہی محل میں دعوت و ملاقات کا احوال پایا جاتا ہے جیسا کہ لکھتی ہیں کہ وہاں لوگ کہتے ہیں کہ کسی مسلمان بیگم کے ایسے دربار میں شریک ہونے کا یہ پہلا ہی واقعہ ہے۔ معلوم نہیں یہ کہاں تک درست ہے۔[۷۷]

بیگم صغرا بھی ان سفر نامہ نگاروں خواتین میں شمار کی جاتی ہیں جن کے سفر ناموں میں ان کے عہد کے

تہذیبی، سیاسی و سماجی حالات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ انھوں نے اپنے سفرناموں میں سیاسی بیداری اور ہندوستانیوں کی کم مائیگی کو بیان کیا ہے۔ انھیں اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ مسلم معاشرہ تب تک آزادی کی جدوجہد میں کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک عورتوں کو جہالت کی گمراہی سے نہ نکالا جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے نہ صرف ایک تحریک شروع کی بلکہ تحریکوں کی حمایت بھی کی جو ہندوستان میں اس وقت چلائی جارہی تھیں۔ وہ اپنے سفرنامہ پونا و مدراس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے متعلق لکھتی ہیں "ایسٹ انڈیا کمپنی نے مدراس پر ۱۶۶۳ء قبضہ کیا اور یہاں ایک تجارتی منڈی قائم کی، بعد میں ایک قلعہ مسمّٰی بہ "فورٹ سینٹ جارج" تعمیر کیا۔ جس میں وقتاً فوقتاً ترمیم و ترقی ہوتی رہی۔ حیدر علی نایک اور اس کے بیٹے ٹیپو سلطان سے اور کمپنی سے برابر لڑائیاں ہوتی رہیں۔ ایک جنگ میں حیدر علی نے کمپنی مذکور کو شکست فاش دی اور کمپنی کے دارالامارۃ مدراس میں حیدر علی کی فوج داخل ہو گئی تھی۔ اس وقت فریقین میں مصالحت ہوئی۔ "[۴۸] اس کے علاوہ بہمنی سلطنت کے قیام اور احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر حملوں کی داستان بھی پائی جاتی ہے۔ ان کا ہر سفرنامہ برصغیر پاک و ہند کی سیاسی و سماجی صورت حال سے بھرپور ہیں۔ مصنفہ نے ہر ایک بات اور واقعات کو جزئیات سمیت بیان کیا ہے۔ ان کے ہاں معلومات کی فراوانی پائی جاتی ہے۔ نو آبادیاتی عہد کی سفرنامہ نگار خواتین ہندوستان میں چلنے والی تحریکوں سے کسی نہ کسی طور پر متاثر رہیں اور انھوں نے تحریری اور عملاً اس جدوجہد میں حصّہ لیا۔ بیگم صغرا ہمایوں کی ساری زندگی اسی کوشش میں گزری۔ ان کا ہر سفرنامہ ان کوششوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کا سفرنامہ بھوپال و آگرہ دہلی کے حالات جلسے اور کانفرنسوں کی روداد پر مشتمل ہے۔ اس سفرنامے میں وہ ایک جگہ لکھتی ہیں۔ "انجمن کے قواعد و ضوابط مرتب کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی قائم کی گئی۔ یہ امر بھی طے پایا کہ انجمن کی آمدنی کا ایک حصّہ اشتیاق بیگم کے مدرسہ کی امداد میں صرف کیا جائے اور ایک حصّہ شریف غریب بیوہ مستورات کی امداد میں دیا جائے۔ یہ امر بھی طے پایا کہ انجمن کے سرپرست حاذق الملک بہادر حکیم اجمل خان صاحب بنائے جائیں۔ "[۴۹]

بیسویں صدی کے اوائل سے ہی خواتین پہلے کی نسبت زیادہ سرگرم اور مستعد نظر آتی ہیں کیوں کہ معاشرے میں مردوں کی سوچ میں تبدیلی آنے سے ان کے لیے خاطر خواہ آسانیاں پیدا ہونا شروع ہو گئیں تھیں۔ اب وہ ہر پلیٹ فارم سے اپنی آواز بلند کر رہی تھیں اور جلسے جلوسوں اور کانفرنسوں میں اپنی نمائندگی کا اظہار کرنے لگیں۔ بیگم عطیہ فیضی نے اپنی ساری زندگی سماجی و اصلاحی کاموں میں گزاری۔ وہ ایک آزاد خیال اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ انھوں نے خود بھی سیاسی و اصلاحی تحریکوں سے اثر لیا اور جدوجہد آزادی و حقوق نسواں کے لیے آواز بلند کرتی

رہیں۔ مگر جب ان کا سفر نامہ زمانۂ تحصیل کا جائزہ لیتے ہیں تو ایک بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ وہ جب انگلستان گئیں تب ہندوستان میں تمام تحریکیں عروج پر تھیں اور ہندوستانی عوام کا ہر دن بے چینی اور جدوجہد آزادی میں بسر ہو رہا تھا مگر ان کا سفر نامہ ان تمام سیاسی سرگرمیوں کے اثرات سے پاک ہے۔ اگر کسی جگہ ہندوستان کے سیاسی حالات کا ذکر آیا بھی ہے تو وہ بھی سرسری سا ہے۔ جیسے ایک جگہ وہ بے ضرر کا تبصرہ بیان کرتی ہیں کہ لیوانز صاحب نے بھی موقع پا کر بیان کر دیا کہ میں ہندوستان میں عرصے تک قیام کر چکا ہوں اور جو کچھ میں نے مسلمانوں کی حالت ملاحظہ کی ہے اُس سے اُن کی آئندہ ترقی کی کوئی امید اور خوبی دکھائی نہیں دیتی ہے۔ بڑی سُست قوم ہے وہ توکل کے سوا کچھ نہیں جانتے وغیرہ وغیرہ۔ پیاری بہنو بات تو سچ کہی ہم بُرا مان جائیں یہ ہماری خوشی ہے۔[۵۰]

ان کے علاوہ بھی کچھ سفر ناموں میں سلطنت برطانیہ کے ساتھ خیر خواہی کا رجحان نظر آتا ہے اور یہ تمام خواتین برطانوی نظام اور معاشرت سے خاصی متاثر دیکھائی دیتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے شعوری طور پر سیاسی گفتگو یا ان کے خلاف کسی بھی طرح کی رائے دینے سے احتراز اختیار کیا ہے۔ حالاں کہ تب پورا ہندوستان برطانوی تسلّط سے آزادی کا خواہاں تھا اور وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

بیگم عطیہ فیضی کی طرح نشاط النساء (بیگم حسرت موہانی) کا نام بھی اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ وہ بیسویں صدی کی سیاسی و سماجی اور نسوانی تحریک کا حصہ تھیں۔ انھوں نے آزادی وطن کے لیے کی گئی جدوجہد میں اپنے شوہر کا ساتھ دیا اور انہیں کبھی اپنے مقصد سے ہٹنے نہیں دیا بلکہ ہر مشکل میں اس کا حوصلہ بڑھاتی رہیں اور اس راہِ خار دار کی مشکلوں کو تن تنہا برداشت کیا مگر کبھی کسی لمحے نہ خود کسی کے آگے جھکیں اور نہ مولانا حسرت کو ایسا کرنے پر مجبور کیا۔

مولانا حسرت نے شادی کے بعد صحافت اور سیاست میں حصہ لیا تو بیگم حسرت آزادی کی جدوجہد، مزدوروں اور عورتوں کے حقوق کے لیے اپنی آخری سانس تک اپنے شوہر کی وفادار اور غمخوار رہیں۔ مولانا نے جب یہ عہد کیا کہ وہ سودیسی چیزیں استعمال کریں گے تو انھوں نے اس معاملے میں بھی مولانا حسرت کا ساتھ دیا اور وہ اپنے ہاتھ سے بُنے سوت کے کپڑے پہنتی رہیں۔ بیگم حسرت نے مولانا کے ساتھ فریضہ حج کی ادائیگی اور مقامات مقدسہ کی زیارت کا

شرف بھی حاصل کیا اور ان مقدس مقامات کے تجربات ومشاہدات اور واقعات کو سفر نامہ حجاز اور سفر نامہ عراق کے نام سے مولانا حسرت نے سفر ناموں کی شکل میں ترتیب دیا۔ بیسویں صدی کی دوسری سفر نامہ نگار خواتین کی طرح وہ اپنے عہد کی سیاسی و تعلیمی اور اصلاحی تحریکوں سے متاثر تھیں بلکہ سیاسی تحریکوں کے حوالے سے تو ان کا نام بھی مولانا حسرت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

بیگم سربلند جنگ بہادر کا سفر نامہ دنیا عورت کی نظر میں بھی برطانوی سلطنت سے میل جول اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی سعی و کوشش پر مشتمل ہے۔ جیسے ایک جگہ مصنفہ لکھتی ہیں کہ پھر فرمایا کہ لندن تم کو پسند آیا؟ میں نے عرض کیا کہ بہت پسند آیا۔ فرمایا، ہندوستان بہت اچھا ہے۔ میں نے کہا وہ بھی آپ کا ہی ہے۔[۸۱]

اور جب اندرونِ ہندوستان مصنفہ کی زندگی کا جائزہ لیں تو وہ ہر سیاسی و اصلاحی تحریک کا حصّہ رہیں اور ان کے اپنے عہد کی تمام نامور خواتین بیگم بھوپال سلطان جہاں، بیگم صغرا ہمایوں، سروجنی نائیڈو، نازلی بیگم، مسز خدیو جنگ صاحبہ، مسز امیر حسن اور زہرا فیضی کے ساتھ گہرے تعلقات تھے اور وہ ہر جلسے و کانفرنس میں ان کے ہمراہ شرکت کرتی تھیں۔

نوآبادیاتی عہد کے یہ سفر نامے اس عہد کا ایک ایسا منظر نامہ ہے جس میں بہت سی تحریکیں سانس لے رہی تھیں اور ان تحریکوں سے وابستہ لوگ اپنے اپنے طور پر آزادی کی جدوجہد میں کوشاں تھے۔ ہندوستان کا ہر فرد کسی نہ کسی تحریک سے اپنی وابستگی کا اظہار عملی یا تحریری طور پر کر رہا تھا اور خواتین بھی اس فریضہ کی انجام دہی میں کسی سے پیچھے نہ تھیں۔

۴۔مذہبی وابستگی اور اس کے مظاہر:

برصغیر پاک وہند میں برطانوی تسلط کے ساتھ ہی جدید تعلیم کا بھی آغاز ہوا کیوں کہ اس سے پہلے یہاں کا نظام تعلیم مشرقی علوم وفنون پر مبنی تھا۔ لڑکوں کے لیے تو دیسی مدارس قائم تھے اور وہ ان میں تعلیم پاتے تھے مگر عورتوں کو گھر میں ہی مذہبی اور فارسی کی چند کتب کو رٹوا دیا جاتا تھا۔ اس وقت نصابی کتابوں کی سخت قلت تھی۔ اردو میں تو مذہبی کتابیں تھیں یا شاعری یا پھر داستانوں کا ذخیرہ۔ چنانچہ اس عہد کی لڑکیوں کو صرف ان ہی دو طرح کی کتابوں کا مطالعہ

کرنے کا موقع ملتا تھا لیکن جیسے جیسے انگریزوں کا اقتدار بڑھنے لگا اور سیاسی استحکام حاصل ہونے لگا تو انھوں نے ہندوستانیوں کی تعلیم کی طرف بھی توجہ دی۔ ان کی اس توجہ کے پیچھے بھی ان کے مذموم مقاصد تھے۔ وہ مسلمانوں کا فارسی زبان سے رابطہ ختم کرنا چاہتے تھے کیوں کہ اس زبان میں مسلمانوں کا صدیوں پرانا سرمایہ تھا۔ مسلمان ہزار ہا سال سے اس خطہ پر اپنی کامیابی و کامرانیوں کے جھنڈے گاڑھے ہوئے تھے اور اسلامی علوم و فنون کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ اسی علم کو کتابوں میں بھی محفوظ کرتے۔ اس طرح برصغیر کے مسلمانوں کا ادبی و علمی سرمایہ فارسی میں تھا۔ ایک دانشور کا قول ہے کہ اگر کسی قوم کو مفلوج کرنا ہو تو اس کا رابطہ اس کی زبان اور اس کے ادب سے کاٹ دو۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس زرخیز خطے پر بڑی منصوبہ بندی سے اپنے پنجے گاڑ لیے اور ان کا مقصد ہندوستان کی دولت کو برطانیہ لے جانا تھا۔ اس مقصد کے پیشِ نظر کمپنی نے خام مال کی پیداوار میں اضافہ کرنے، رسل و رسائل کے ذرائع کو بڑھانے اور انتظامیہ کے طرز میں تبدیلی لانے کی کوشش کی تاکہ زیادہ سے زیادہ معاشی فائدہ اٹھایا جا سکے۔ چنانچہ اس مقاصد کے حصول کے لیے انھوں نے تعلیم کا بھی سہارا لیا کیوں کہ انھیں اپنے دفاتروں میں افسران یا دوسرے چھوٹے موٹے انتظامی امور کے لیے مقامی لوگوں کی ضرورت تھی اور اس سلسلہ میں سب سے بڑا مسئلہ زبان کا تھا۔ اس لیے انگریزوں نے جدید تعلیم پر خصوصی توجہ دینا شروع کی تاکہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان زبان کا مسئلہ نہ رہے۔ مگر مسلمانوں کی انگریزی تعلیم کو اپنے لیے ان بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کی سیاسی، تہذیبی، ثقافتی، تعلیمی اور ادبی زندگی میں بھی کئی تبدیلیاں آئیں۔ ہندوستانی معاشرہ جس پر مغل سلطنت کے زوال اور انگریز قوم کے عروج کے بعد جمود کی کیفیت طاری ہو چکی تھی اور وہ سماجی برائیوں اور جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کٹھن وقت میں ہندوستان کے کچھ دانش وروں نے ایک اصلاحی و تعلیمی تحریک شروع کی جس نے جدید تعلیم کے رجحان کو فروغ دیا۔ مگر اس تحریک کے تعلیمی ثمرات صرف لڑکوں کے لیے تھے۔ لڑکیوں کے لیے صرف وہی صدیوں پرانا تعلیمی نظام کافی سمجھتے ہوئے ان کو نظرانداز کیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جنھوں نے وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے عورتوں کی تعلیم پر زور دیا اور ان لوگوں کو اپنی تحریروں کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی۔ جو یہ سمجھتے تھے کہ لڑکیوں کو تعلیم دینا شرم و حیا کو کھو دینا ہے اور وہ بے پردگی کا شکار ہوں گی۔

ہندوستان کے تنگ ذہن لوگوں نے مذہب کی آڑ میں بہت سی فرسودہ روایات کو گلے سے لگایا ہوا تھا۔ لڑکوں کی تعلیم کے معاملے میں پھر بھی اُن میں لچک پائی جاتی تھی مگر عورتوں کا گھر کی چار دیواری سے نکلنا اور انگریزی سکولوں

میں جانا ان کو معیوب لگتا تھا۔ طبقہ اشرافیہ میں یہ صورت حال کچھ مختلف تھی مگر انھیں بھی ایک حد تک آزادی حاصل تھی۔ ہندوستان کی دوسری خواتین کی طرح یہ بیگمات بھی اپنی تحریریں اپنے اصلی نام کی بجائے اپنے خاوند کے نام سے شائع کرواتی تھیں۔ جیسا کہ بیگم سربلند جنگ بہادر اور بیگم حسرت موہانی اور بیگم ہمایوں مرزا زیادہ تر انہی ناموں سے ادبی حلقوں میں جانی جاتی ہیں۔ ابتداء میں عورتوں کے متعلق تعلیم اور آزادی میں رکاوٹ تمام طبقوں میں تھی مگر نچلا اور متوسط طبقہ اس کا زیادہ شکار تھا۔ مذہبی روایات و اقدار کی پاسداری کا بہانہ بنا کر انھیں ہر شعبۂ زندگی میں پیچھے رکھا جا رہا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ہی تعلیمِ نسواں کی کوششوں میں تیزی آگئی اور علی گڑھ تحریک میں بھی سرسید کے ارکان خمسہ میں سے ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی نے عورتوں کے لیے قصہ کہانیاں لکھیں۔ اس عہد کے دیگر دانشوروں مولوی ممتاز علی، راشد الخیری، شیخ عبد اللہ ہارون نے خواتین کے رسالے جاری کیے جن میں مختلف موضوعات پر عورتوں نے قلمی ناموں سے مضامین لکھے اور دوسری عورتوں کو بھی اس طرف مائل کیا۔ اس کوشش میں بیگمات بھوپال کی خدمات کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے مذہب کی پاسداری کرتے ہوئے سالوں حکمرانی کی اور پردے کو اپنے راستے کی رکاوٹ نہ بنایا۔ نواب قدسیہ بیگم، نواب سکندر اور نواب سلطان جہاں بیگم جب حج کی سعادت حاصل کرنے گئیں تو انھوں نے ہر عام و خاص سے پردہ کیا اور ارکانِ اسلام بھی پورے کیے۔ ان کے سفر ناموں میں مذہب کے ساتھ دلی وابستگی کا برملا اظہار ہوتا ہے۔ نہ صرف حج بلکہ جب نواب سلطان جہاں یورپ کی سیاحت پر گئیں اور انھوں نے سلطنت برطانیہ کے ارکانِ سلطنت کے ساتھ پردے میں ملاقات کی اور روشن خیال ہونے کے باوجود اپنی لڑکیوں شاہ بانو، برجیس بیگم کو دعوت و تعام سے دور رکھا۔ سیاحت سلطانی میں بہت سی جگہوں پر وہی صدیوں پرانی مذہب کے نام پر عورتوں کا استحصال نظر آتا ہے۔ دینِ اسلام کے تاریخی معرکے دیکھیں تو پوری تاریخ عورتوں کے کارناموں سے بھری ہوئی ہے۔ اسلام و باطل کا کوئی ایسا معرکہ نہیں جس میں آنحضور ﷺ نے عورتوں کو زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے اور انھیں مدد کرنے سے منع فرمایا ہو۔ حضرت خدیجہؓ تجارت کرتی تھیں، حضرت عائشہؓ بھی جنگ و جدل میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں۔ اسی طرح اسلام کی سربلندی میں بہت سی عورتوں کے نام اور کام کسی سے پوشیدہ نہیں لیکن برصغیر پاک و ہند کی سرزمین پر مذہب کے نام پر بہت سی من گھڑت روایات تقویت پا چکی تھیں اور ان سے چھٹکارا پانا مردوں کو اپنی غیرت کا معاملہ لگتا تھا۔

ہندوؤں کے مذہب میں ایسی کوئی سختی نہ تھی اور وہ نہ صرف خود تعلیم کے میدان پیش پیش تھے بلکہ ان کی لڑکیاں بھی انگریزی مدارس میں تعلیم پاتی تھیں۔ اسلامی معاشرے کی خواتین صدیوں سے مذہب کے نام پر پسماندہ

سے پسماندہ ہوتی جارہی تھیں۔ مسلمانوں کو اس حقیقت کے قبول کرنے میں کافی وقت لگا کہ کسی بھی عورت کی تعلیم پورے کنبے کی تعلیم ہے۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں تحریکِ نسواں قائم ہوئی جس کی باگ ڈور اور جدوجہد میں نازلی رفیعہ سلطان، عطیہ فیضی، زہرا فیضی، بیگم صغرا ہمایوں، بیگم سربلند جنگ بہادر، شاہ بانو، راحیل شروانیہ اور محمودہ عثمان حیدر اہم ہیں۔ ان خواتین نے اپنے سفر ناموں سے عورتوں کی بیداری کا کام لیا۔ ان کے سفر نامے بیسویں صدی کی مذہبی اور تعلیمی تحریکوں کا ایک مستند حوالہ ہے کیوں کہ کوئی بھی ادیب و شاعر اپنے معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ ان سفر ناموں کے ذریعے اگر ہم اس عہد کی تاریخ مرتب کرنا چاہیں تو بڑی آسانی سے کر سکتے ہیں۔ اس صدی کی خواتین کہیں بھی گئیں اُن کا ماحول اور حالات ان کی ذات کا حصہ بنے رہے۔ اب اگر مذہبی حوالے سے ان کے سفر ناموں کا جائزہ لیں تو ہمیں جگہ جگہ ان کی مذہب سے وابستگی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اس کو اپنے راستے کی رکاوٹ نہیں سمجھا۔ بیگمات بھوپال کے سفر نامے دیکھیں تو ان کے علم کی داد دینا پڑتی ہے کہ وہ ہر بات کا حوالہ قرآنی آیات کی روشنی میں دیتی ہیں۔ بیگم سلطان جہاں کا سفر نامہ "روضۃ الریاحین" میں وہ گورنمنٹ انگلیشیہ کا سفر کا اہتمام کرنے پر شکریہ ادا کرنے کے حوالے سے قرآن کی آیات لکھتی ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے:

"جس نے شکر نہیں کیا لوگو نکا اوسنے شکر نہیں کیا اللہ کا۔" [۸۲]

انھوں نے حج کی اہمیت و فضیلت آیاتِ قرآنی کی روشنی میں بیان کی ہے۔ اس سفر نامے کے پہلے حصے میں ہر بات کا ثبوت اسلام کی دلیلوں سے دیا ہے۔

بیگم سربلند جنگ بہادر (اختر حمیدیہ) کا سفر نامہ دنیا عورت کی نظر میں مذہبی جذبات سے بھرپور ہے۔ ان کی روانگی سے ہی ان کے مذہبی عقیدے پر روشنی پڑتی ہے جیسا کہ انھوں نے گھر کے دیگر افراد سے حج بیت اللہ کی اجازت طلب کی۔ اسی طرح اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا مولوی محمد قیام الدین عبدالباری سے بھی خط کے ذریعے اجازت لیتی ہیں اور ان کے مقام و مرتبہ کے بارے میں لکھتی ہیں کہ یہ حضرت میرے پیر و مرشد جناب مولانا الحاج مولوی محمد عبدالوہاب صاحب قبلہ کے چھوٹے صاحب زادے ہیں اور بہت ہی سچے پیر ہیں۔ آج ان کا ثانی دوسرا نہیں ہے۔ ان سے بھی اجازت حج بیت کی لے لی تھی۔ [۸۳]

مصنفہ نے اپنے عزیز واقارب سے ملنے والے امام ضامن کی تعداد چھ سو بتائی ہے، جو صرف ان کو دیئے گئے ہیں۔ نواب حمید خان کے امام ضامن ان کے علاوہ ہیں۔ اس کے علاوہ ان لوگوں نے جانے سے پہلے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی درگاہ شریف پر بھی حاضری دی۔ ان خواتین کے سفر ناموں کے مطالعہ سے راقمہ کو ان خواتین کے مذہبی رویوں کا کافی تضاد نظر آیا۔ ان خواتین کا تعلق طبقہ اشرافیہ کے پڑھے لکھے گھرانوں سے تھا۔ تعلیم کے باجود اندرونِ ہندوستان یہ سب بھی پردے کی حدود و قیود میں جکڑی ہوتی ہیں مگر بیرونِ ملک کی سیاحت پر یہ خواتین بوقت ضرورت اپنا نقاب بھی اتار دیتی ہیں اور غیر محرم مردوں سے مصافحہ کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتیں۔ جس طرح بیگم سربلند پردے کے بارے میں لکھی ہیں کہ نواب سربلند بہادر تشریف لاکر فرمایا، چلو میز تیار ہے، میں نے کہا سب کے ساتھ کھانا کھاؤں گی؟ تو فرمایا کہ ہاں چلو یہاں کون دیکھتا ہے۔[۵۴] اسی طرح جب یہ لوگ پرنس آف ویلز کے ہاں دعوت پر گئے اور وہاں کا ذکر مصنفہ نے یوں کیا کہ میرے پہنچنے کے ۵ منٹ بعد پرنس اور پرنسز تشریف لائے، میں کھڑی ہوگئی اوّل پرنس نے مجھ سے ہاتھ ملایا پھر سرکار سے۔[۵۵]

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز دربار سے اپنی وفاداری ثابت کرنے کی خاطر یہ نوابان حضرات اپنی بیگمات کو بھی ان کے ہاں لے کر جانا ایک اعزاز سمجھتے تھے مگر اپنے وطن میں معاشرے کے دیگر کم پڑھے لکھے طبقے کی مانند پردے کا خصوصی اہتمام کرواتے تھے اور ان خواتین نے بھی پردے پر سختی سے عمل کیا۔ ماسوائے عطیہ فیضی کے، انھوں نے ہندوستانی خواتین میں سب سے پہلے پردہ ترک کیا تھا اور وہ ترقی پسند خاتون میں شمار ہوتی ہیں۔ اس دور کی ایک اور نامور خاتون بیگم صغرا ہمایوں ہیں انھوں نے اپنی زندگی حقوق و بیداری نسواں کے وقف کر رکھی تھی۔ مذہبی وابستگی کے حوالے سے ان کا سفر ناموں کا جائزہ لیں تو ان کے ہاں بھی وہی روایتی پردہ نظر آتا ہے۔ وہ اپنے سفر نامے روزنامچہ سفر بھوپال و آگرہ میں لکھتی ہیں:

> گھر سے موٹر یا گاڑی پر آتے اور ایک پنس (بااصطلاح حیدر آباد میانہ) قبل سے اسٹیشن پر بھیجوی جائی اُس پر سوار ہو کر ریل پر سوار ہوتے۔ مگر اب اسٹیشن پر انتظام کیا گیا ہے کہ دو تین ریکشا پلیٹ فارم پر تیا رہتے ہیں جو گاڑی یا موٹر تک لائے جاتے ہیں جن پر سوار ہو کر ریل کے ڈبہ تک آتے ہیں اور وہ ریکشا ڈبہ سے ملا کر لگا دیا جاتا ہے۔ اس میں سے نکل کر ڈبہ میں چلے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے بہت آسانی ہو گئی ہے۔ فی کس ۳؎ دینا ہوتا ہے۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں ہے جبکہ برقعہ یا چادر میں ہم رہتے ہیں تو پھر

ان چونچلوں کی ضرورت ہی کیا ہے لیکن ہمارے مردوں کی خوشی اسمیں ہے کہ ہم مقید رہ کر زندہ در گور رہیں۔[۸۶]

مصنفہ چونکہ ایک شاعرہ بھی تھیں۔انھوں نے عورتوں کے پردہ کے بارے میں بڑی خوب صورت بات کی ہے۔

مسلمان عورتوں کے جس کو پردا سمجھتے ہیں
پڑیں پتھر سمجھ پر قید کو اچھا سمجھتے ہیں
چھپائیں عورتیں زینت یہی قرآن میں آیا ہے
یہ سیدھے مسئلہ کو بھی مگر الٹا سمجھتے ہیں
یہی ہے حکم رکھیں مرد و زن دلکی نظر نیچی
مگر غض نظر کے خوب یہ معنے سمجھتے ہیں
وائے وحشت عورتیں محلوں میں ہیں بیجرم قید
ان مکانوں کو تو ہم وحشت سرا کہتے کو ہیں
مرد ہی کی بدظنی ہے باعث جس دوام
عورتوں کو ہم تو بے جرم و خطا کہنے کو ہیں[۸۷]

مصنفہ عورتوں کی تعلیم کی پُرزور حامی تھیں۔انھیں انگریزی تعلیم کی اہمیت کا نہ صرف احساس تھا بلکہ انھوں نے اس کے حصول کے لیے کوشش بھی کی مگر اس کے ساتھ ساتھ بیگم ہمایوں اپنے مذہبی عقائد اور نظریات پر سختی سے کاربند بھی تھیں۔وہ مذہبی تعلیم کو بھی اتنا ہی ضروری سمجھتی جتنا مغربی علوم وافکار کو مسلمانوں کے لیے اہم۔ان کا خیال تھا کہ خواتین کو پردے کی وجہ سے اس کے حقوق سے محروم نہیں رکھنا چاہیے۔اس کے لیے وہ مذہب سے بہت سی مثالیں بھی پیش کرتی ہیں۔بیگم صغرا نے اندرونِ ہند بہت سی کانفرنس میں شرکت کی اور اس کی بات کی بارہا وضاحت کی کہ اسلام میں عورت کا بہت بلند مقام و مرتبہ ہے اور اُس نے عورتوں کو علم سے محروم کر کے گھر کی چار دیواری تک محدود نہیں کیا۔حیا و شرم، مرد ہو یا عورت اس کا زیور ہے۔بس اس کی حفاظت کرنی چاہیے اور دنیوی امور سے قطع تعلق کا کہیں حکم نہیں آیا۔ایک جگہ وہ تقریر کرتے ہوئے کہتی ہیں:

میں یہ جھوٹا پردہ ہرگز پسند نہیں کرتی۔مرد کیا اس کا خیال نہیں کرتے کہ جن اقوام میں پردہ نہیں ہے مثلاً پارسی، عیسائی، ہنود وغیرہ تو کیا ان میں عصمت وعفت کی کمی ہے اور کیا پردہ میں شیعہؑ و قبیحہ اقسام کے مذموم افعال کا ارتکاب نہیں ہو رہا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ بڑا پردہ دل وایمان کا ہے۔[۸۸]

مصنفہ نے اپنے سفر ناموں میں دیگر مذاہب کی عبادت گاہوں کی حالت، صفائی، ان کی منظر کشی میں خاصی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔وہ نہ صرف مذہب اسلام کے متعلق معلومات کا وسیع ذخیرہ رکھتی ہیں بلکہ دوسرے مذاہب

کے بارے میں بھی وہ بڑے ذوق و شوق سے روشنی ڈالتی ہیں۔ سفر نامہ پونہ و مدراس میں مصنفہ دوسرے مذاہب کی خواتین کی خوبی ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں:

> پارسی لیڈیون میں سے بڑا وصف ہے کہ خواہ کتنی ہی بلند رتبہ و دولتمند ہوں خانہ داریکے اکثر کام اپنے ہاتھوں سے کرلیتی ہیں اور اس فعل کو کسر شان تصور نہیں کرتیں برخلاف اسکے ایک رسم ہے کہ جہاں ذری ثروت ہوئی کہ ہلکر پانی پینا مشکل ہو جاتا ہے۔[۸۹]

ان کے سفر ناموں میں جابجا اولیا کرام اور ان کے کمالات کا تذکرہ کرنے کے ساتھ وہ جس بھی علاقے میں گئیں انھوں نے درباروں اور مزاروں پر ضرور حاضری دی۔ سفر نامہ رہبر کشمیر میں مختلف شہروں کی سیاحت کا احوال موجود ہے۔ اس میں مصنفہ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، حضرت سید میران حسین، حضرت سید شاہ نصیر الدین، داتا گنج بخش ہجویری، سید شاہ محمود، میرزا زادہ حسن شاہ، مخدوم جہاں نما سہروردیہ وغیرہ صاحب کرامات بزرگانِ دین کا احوال پایا جاتا ہے۔ مصنفہ کے تمام سفر نامے تعلیمِ نسواں، مذاہب اور ان کی اصلاحی کاوشوں پر مشتمل ہیں۔

نازلی رفیعہ سلطان کا سفر نامہ سیرِ یورپ بھی اپنے عہد کی اصلاحی تحریکوں اور مذہبی وابستگی کا آئینہ دار ہے۔ بیگم عطیہ فیضی اور بیگم نازلی کا اپنے عہد کی بے باک اور آزاد خیال خواتین میں شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے مقام و مرتبے کو عورتوں کی فلاح کے لیے استعمال کیا۔ اپنی ریاست میں فلاحی کاموں کا بیڑا اٹھایا اور ہندوستان کی نامور شخصیات کو اپنے ہاں مدعو کیا کرتی تھیں۔ مولانا شبلی نعمانی نے "سیرت النبی ﷺ" بیگم نازلی کے اصرار اور مالی اعانت سے شروع کی۔ مصنفہ کو نہ صرف ادب سے تعلق تھا بلکہ وہ اپنے عہد کے سیاسی، تعلیمی اور مذہبی امور سے بھی دلچسپی لیتی تھیں۔ انھوں نے ہندوستانی عورتوں کو مذہب کی حدود میں رہتے ہوئے جدید تعلیم حاصل کرنے کی جانب راغب کیا۔ سفر نامہ یورپ کا مطالعہ کریں تو اس میں مصنفہ مذہبی گفتگو کرتی بھی نظر آتی ہیں۔ ایک جگہ وہ ایک عیسائی عورت کو مذہب اسلام کے متعلق یوں اظہار کرتی ہیں:

> تم لوگوں کا خدا کانفیوشیش ہے؟ میں نے کہا نہیں نہیں۔ وہ چینیوں کا خدا ہے۔ ہمارے اور تمھارے خدا میں سرمو فرق نہیں۔ جس خدا کو ہم مانتے ہیں۔ اُسی کو تم بھی مانتی ہو۔ حضرت عیسیٰ ہمارے بھی پیغمبر

ہیں۔ اسی طرح حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت داؤد وغیرہ کو بھی ہم پیغمبر جانتے ہیں۔ یہ سنتا تھا کہ انہی سوالوں کی کوئی انتہانہ رہی۔ پھر ہندوؤں کے متعلق دریافت کیا۔[90]

ہندوستان کی دوسری خواتین کی طرح مصنفہ بھی پردہ کا خصوصی اہتمام کرتی تھیں مگر سیرِ یورپ میں طبقہ اشرافیہ کی خواتین کی مانند انھوں نے بھی یورپ جاکر پردہ ترک کر دیااور بہت سی سیاسی، غیر سیاسی، ادبی شخصیات سے ملنے ملانے کے دوران پردہ سے گریز اختیار کیا۔ مصنفہ کی ایسی صورت حال کے بارے میں لیڈی پرنسس کو تشویش ہوتی اور انھوں نے مصنفہ سے دریافت کیا کہ

> پردے کے باہر تم ابھی ہی نکلی ہو۔ تو کیا تم کو عجیب معلوم ہوا؟ میں نے معمولی جواب دیا کہ بہت دشوار ہوا۔ مگر اب عادی ہوتی جا رہی ہوں۔ تو فرمایا کہ اب یہ بتاؤ کہ ہندوستان جاکر کیا تم پھر پردہ کرو گی؟ میں نے کہا کہ شاید اتنے پردے میں تو نہیں جاؤنگی۔ کیونکہ اس طرح پھرنے کے بعد وہ بھی ذرا مشکل معلوم ہوگا۔ لیکن اتنی بات ہے کہ بالکل ترک کر دینا بھی مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ اس قسم کی باتیں ہندوستان میں ابھی رائج نہیں۔ پردہ چھوڑنے والیوں پر وہاں سخت طعن ہوتا ہے۔[91]

محمودہ عثمان حیدر نے اپنے سفر نامے میں بزرگانِ دین کے حالات جس محبت اور فرطِ ادب سے تحریر کیے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں ان برگزیدہ ہستیوں سے بڑی عقیدت تھی اور وہ ان کے مذہبی کارناموں سے متاثر تھیں۔ سفر نامہ میں مصنفہ کی تمام کوشش اس امر پر مبذول رہی کہ ہندوستانیوں کو اپنے مذہب کی پاسداری اور اصلاح کرنی چاہیے۔ ان میں جو غیر اسلامی رسوم وعقائد شامل ہو گئے ہیں ان سے اسلام کو پاک کریں۔ اس مقصد کے تحت بھی انھوں نے سفر نامہ میں مختلف بزرگانِ دین جیسے حضرت حذیفہ بن الیمان، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت سلمان فارسی، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے خیالات اور حالات کی ترویج کی تاکہ اہلِ ہندوستان ان کے کمالات سے آگاہ ہوں۔

تو یہ مذہبی صورت حال پورے ہندوستان خواتین کے لیے تھی۔ وہ عام عورت ہو یا خاص، سب کا دستور ایک ہی طرز کا تھا جس پر عمل سختی سے کروایا جاتا تھا۔ بیسویں صدی کے خواتین کے سفر ناموں کا جائزہ لینے سے ایک بات یکساں معلوم ہوتی ہے کہ تمام سفر ناموں میں ایک ہی طرح کی سیاسی، معاشرتی، تعلیمی، مذہبی فضا چھائی ہوتی ہے کیونکہ یہ عہد سیاسی لحاظ سے بڑا اہم دور تھا اور بہت سی اصلاحی وسیاسی تحریکیں زور وشور سے اپنا اثر ورسوخ بڑھا رہی تھیں۔

اس کے ساتھ ہندوستانی عوام بھی ذلت بھری زندگی سے چھٹکارے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ہر کوئی خواہ مرد ہو یا عورت اپنے اپنے حصّہ کی جدوجہد میں مصروفِ عمل تھا۔

۵۔ معاشرتی رویّے:

برِعظیم پاک و ہند میں جدید تعلیم کا آغاز برطانوی تسلّط سے ہوا کیوں کہ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستانی نظامِ تعلیم مشرقی علوم و فنون پر مبنی تھا۔ لیکن جوں جوں انگریزی کا نظام حکومت وسعت اختیار کرنے لگا اور انھیں مکمل سیاسی استحکام حاصل ہونے لگا تو انھوں نے ہندوستان میں تعلیم کی طرف بھی توجہ دی۔ ان بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی سیاسی، تہذیبی، تعلیمی اور ثقافتی زندگی میں بھی کئی موڑ آئے۔ ہندوستانی معاشرہ جو صدیوں سے ہندوؤں کے ساتھ میل ملاپ اور رہن سہن سے غیر شرعی رسوم و بدعات کا شکار ہو چکا تھا اور انگریزی نظام حکومت کی سیاسی چالوں کی وجہ سے مسلم معاشرہ مزید پستی اور تاریکی کی جانب چلا گیا اور ان پر جہالت کا لیبل لگا کر ان سے رہی سہی صلاحیتیں بھی چھین لیں۔ پورے معاشرے پر جمود کی کیفیت طاری تھی۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کئی اصلاحی تحریکیں شروع ہوئیں۔ ان میں سے ایک سرسید احمد خان کی تحریک تھی جس نے لوگوں کو تعلیم کی جانب راغب کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ انھیں زندگی کے تمام پہلوؤں پر از سر، نو غور و فکر کرنے پر مائل کیا۔

اس تعلیمی و اصلاحی تحریک کے علاوہ ایک اور اصلاحی و انقلابی تحریک تھی۔ اس نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں ایک انقلاب کی لہر پیدا کی۔ انھوں نے لوگوں کو متحد کر کے معاشرے کی سماجی، اخلاقی اور تہذیبی برائیوں کے خلاف جہاد کرنے کے لیے تیار کیا۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کی زندگیوں سے لادینی، توہم پرستی، بے عملی اور ہندوانہ رسم و رواج کے خاتمہ کے لیے جدوجہد کی۔

نوآبادیاتی عہد کی تمام سفر نامہ نگار خواتین نہ صرف ان تحریکوں سے باخبر تھیں بلکہ وہ بذاتِ خود بھی ان کا حصّہ تھیں۔ انھوں نے ہندوستان کے مسلمان طبقے کو قریب سے دیکھا تھا۔ چناں چہ ان خواتین نے اپنی تحریروں میں

ان ہی باتوں کو موضوع بنایا ہے۔ یہ لوگ اس بات سے بخوبی آگاہ تھیں کہ جہالت ہی کی وجہ سے ضعیف الاعتقادی، توہم پرستی اور غیر اسلامی رسم ورواج پیدا ہوتے ہیں۔اس زمانے میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے والوں کو بھی مسلمان اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ان کو "کرسٹان" یا غیر مسلم کے القاب سے پکارا جاتا ہے۔

صدیوں سے چلی آئی مذہبی تقلید نے معاشرے میں ایک رویّہ یہ بھی رواں رکھا کہ معزز گھرانے کی خواتین کو موضوع گفتگو نہیں بنایا جاسکتا تھا اور غیر محرم مردوں میں اُس کا ذکر نہیں کیا جاتا تھا۔اس رویے کے تحت عورتوں کو یہ احتیاط برتنا پڑتی تھی کہ اسے کوئی دیکھ نہ لے، اس کا نام کسی کو پتہ نہ چل جائے یا کوئی اس کی آواز نہ سن لے۔ اِس رویے سے متاثر ہو کر بہت سے خواتین اپنے اصل نام پوشیدہ رکھتی تھیں۔ جیسے بیگم سربلند جنگ بہادر، بیگم حسرت موہانی، بیگم ہمایوں مرزا مگر اس زمانے کی کچھ خواتین جیسے بیگمات بھوپال اور عطیہ فیضی ہمشیر گان اپنے اصلی نام استعمال کرتی تھیں۔

نوآبادیاتی عہد کی مسلم خواتین پڑھی لکھی ہونے کے باوجود ان تکلفات پر عمل پیرا ہونے پر مجبور تھیں۔ انھیں پردے کا ہر میدانِ عمل میں خصوصی طور پر خیال رکھنا پڑتا تھا۔حتٰی کہ اگر وہ شہ سواری بھی کرتیں تب بھی پردہ یا برقعہ اوڑھتی تھیں۔اس عہد کی ماسوائے عطیہ فیضی اور بیگم حسرت موہانی کے باقی سب پردے میں رہتی تھیں اور بیرونِ ملک جا کر اسے ترک کر دیتی تھیں۔ بیگم صغرا ہمایوں کا سفر نامہ بھوپال و آگرہ اور دہلی کے حالات میں ایک ریزولیوشن پردہ ترک کرنے کے حق میں پاس کیا تھا اور پردے پر چند اشعار یہ ہیں:

مسلمان عورتوں کے جس کو پردا سمجھتے ہیں — پڑیں پتھر سمجھ پر قید کو اچھا سمجھتے ہیں
چھپائیں عورتیں زینت یہی قرآن میں آیا ہے — یہ سیدھے مسئلہ کو بھی مگر الٹا سمجھتے ہیں
یہی ہے حکم رکھیں مرد و زن دلکی نظر نیچی — مگر غض نظر کے خوب یہ معنے سمجھتے ہیں
وائے وحشت عورتیں محلوں میں ہیں بیجرم قید — ان مکانوں کو تو ہم وحشت سرا کہتے کو ہیں
مرد ہی کی بدظنی ہے باعث جس دوام — عورتوں کو ہم تو بے جرم و خطا کہنے کو ہیں [۹۲]

ان اشعار کے علاوہ پردہ پران کی تقریر بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ بیگم صغرا ہمایوں کے ہر سفر نامے میں ان کے خود پردہ کرنے کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح نازلی رفیعہ سلطان بھی سیر یورپ میں پردے کے متعلق لکھتی ہیں کہ چائے پینے سے فراغت ہوئی تو لیڈی صاحبہ نے ہمیں دوپٹہ اوڑھنے کے لیے کہا کیوں کہ وہ سمجھیں کہ یہ صرف لپیٹنے کی چیز ہے۔ یہ نہ سمجھیں کہ ہمارے لباس کا جزو ہے۔ عطیہ نے سمجھا دیا کہ یہ چیز ہمارے لباس کا جزو ہے تاکہ سر کھلا نہ رہے۔[۹۳] ایک اور جگہ لکھتی ہیں کہ پھر کہا کہ پردے سے باہر تم ابھی نکلی ہو تو کیا تمھیں عجیب معلوم ہوا؟ میں نے معمولی جواب دیا کہ بہت دشوار معلوم ہوا۔ مگر اب عادی ہوتی جاتی ہوں تو فرمایا کہ اب ہندوستان جاکر پھر پردہ کرو گی؟ میں نے کہا کہ شاید اتنے پردے میں تو نہیں جاؤں گی۔[۹۴]

اس طرح دیگر سفر نامہ نگار خواتین بیگمات بھوپال، حسرت موہانی، محمودہ عثمان حیدر، بیگم سربلند جنگ بہادر وغیرہ کے سفر ناموں میں پردے پر سختی سے عمل کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اس نظام میں کسی طرح کی تبدیلی کا خیال بھی محال تھا مگر طبقاتی لحاظ سے اس میں کمی یا زیادتی کا پہلو نمایاں تھا۔ ان خواتین سفر نامہ نگاروں کو ہندوستانی عورتوں خصوصاً مسلم عورتوں کی فلاح و بہبود سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ نہ صرف ہندوستانی عورتوں کو اپنے حق کے لیے منظم کرنا چاہتی تھیں بلکہ ان تمام رسم و رواج کی مخالف تھیں جنھوں نے عورتوں کی شخصیت کو مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ تمام خواتین ترقی پسند تھیں اور وہ ہندوستانی عورتوں کو بھی ترقی پسند دیکھنا چاہتی تھیں۔ انھوں نے اپنے سفر ناموں میں بہت سی ایسی اخلاقی باتیں تحریر کی ہیں جنھیں پڑھ کر عام ہندوستانی عورت اپنی حالت سدھا دیں۔ بیگم عطیہ فیضی اسی مقصد کے تحت لکھتی ہیں کہ وہاں پہنچے اور ان کے علاقے کے کمرے میں داخل ہوتے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک خوش اخلاق جوڑا موجود ہے (یعنی مہاراج اور مہارانی صاحبہ) حضور مہاراج نے انگریزی تواضع کے مطابق ہمارے لیے بر موقع کرسیاں کھینچ کر رکھیں کہ جس بات سے ہم لوگوں پر عجیب طرح کا اثر ہوا اور حضور مہارانی صاحبہ تقریباً دروازے تک ملنے کے لیے آئیں۔ واقعی سیر و سیاحت اور مختلف قوموں سے ملنے جلنے سے انسان ترقی کرتا ہے۔[۹۵]

زمانۂ تحصیل میں ایک اور جگہ ہندوستانیوں کے متعلق یورپی لوگوں کے رویّے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ لیڈیز پکٹوریل کی ایڈیٹرس اور ایک مصّور بی بی نے مجھے دیکھ کر یادداشت لکھ لی اور تصویر کے لیے دن مقرر

کروایا، سینیچر کو جاتا ہے۔ وہ دونوں میرے لباس کی ہنر مندی اور لیاقت پر حیران ہوئیں۔ ہندیوں کے لیے اب تک ان لوگوں نے ایسے ڈھب خیال مقرر کیے ہیں کہ اگر کسی ہندی سے ملنا ہوگیا اور ان میں اپنے دل میں معین کی ہوئی باتوں کے خلاف نظر آیا تو بے چارے عالم تحیّر میں کھو جاتے ہیں۔[96] ان کا سفر نامہ زمانۂ تحصیل ہندوستانی عورتوں کے متعلق رویوں کے اظہار کی بجائے مغربی خواتین کی ترقی اور ان کی شائستگی کو ہندوستانی اناث کی اصلاح کے لیے بیان کیا ہے اور مصنفہ مغربی تہذیب و معاشرت کی دلدادہ نظر آتی ہیں۔

بیگم صغرا کا سفر نامہ بھوپال و آگرہ اور دہلی کے حالات بھی اصلاح و شعورِ نسواں کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ مصنفہ نے یہ سفر ہندوستانی خواتین کی حالت کو بہتر بنانے کے حوالے سے کیا تھا۔ ہندوستان میں عورتوں کی کم سنی میں شادی، ان پڑھ ہونے کی وجہ سے شوہر کی دوسری شادی، ذات برادری سے باہر شادی نہ کرنا۔ مزاروں کو پوجنا وغیرہ رسومات جس نے اسلامی معاشرے کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ بیگم صغرا بھی ایسی ہی رسومات کے خلاف آواز بلند کرتی نظر آتیں ہیں۔ وہ لکھتی ہیں کہ پھر ریزولیوشن نمبرے پیش ہوا جس کا مضمون یہ تھا کہ تمام ہند کی عورتوں کو گھر کی صفائی ستھرائی کی جانب متوجہ کرنا چاہیے اور اصول حفظانِ صحت سے باخبر کرنا چاہیے۔ اس کے بعد مسز امیر حسن نے ریزولیوشن نمبر ۸ پیش کیا کہ لڑکیوں کی شادی کم سنی میں نہ کی جائے۔ جس کی وجہ سے تعلیم رک جاتی ہے اور بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔[97] اس عہد کی عورت مختلف قسم کی حدود و قیود میں جکڑی ہوئی تھیں جن کی پاسداری انھیں اچھی بیٹی، بہو اور بیوی ثابت کرتی تھی۔ مصنفہ ایک اور معاشرتی رویے کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں۔ بیگم صاحبہ حکیم شفاء الملک آج مجھ سے ملنے آئیں کہ کل جو جلسہ میں شریک نہ ہو سکیں۔ اس کی معذرت کی اور کہنے لگیں کہ میرے خاندان کے رواج کے خلاف پارٹیوں اور جلسوں میں جانا ہے۔ اس لیے یہ مجبوری نہ آئی۔ چنانچہ قیصر ہند جارج پنجم نے دلی میں دربار کیا تھا اور بادشاہ بیگم نے زنانہ پارٹی دلی کی بیگمات اور دیگر روسا دلی کی خواتین کو دی تھی۔ میں بھی مدعو کی گئی تھیں لیکن رواج خاندان نے جانے نہ دیا۔[98] اسی طرح کے معاشرتی رویوں نے طبقہ اناث کا استحصال کیا اور وہ بے زبان حیوانات کی مانند زندگی بسر کرنے پر مجبور تھیں۔ جدید انگریزی تعلیم سے مزین کچھ خواتین آگے بڑھیں اور انھوں نے بیداری و اصلاح نسواں کا بیڑا اٹھایا۔ ان میں بیگم سربلند جنگ بہادر شامل ہیں۔ انھوں نے بھی معاشرتی

اصلاح کے لیے سفر نامہ تخلیق کیا۔ اس زمانے میں اس قسم کی تحریروں کا مقصد معاشرے میں شعور و آگاہی پیدا کرنا تھا۔ بیگم صاحبہ بھی جس جگہ اور جس مقام پر گئیں انھوں نے اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھا۔ ان کے سفر نامے دوسری تہذیب و معاشرت میں موازنہ کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ جہاں بھی لوگوں میں خوبی دیکھتی ہیں۔ اپنے وطن کے لوگوں کو یاد کرنے لگتی ہیں۔ محمودہ عثمان حیدر ہندوستانی عورتوں کی پسماندگی کو یوں بیان کرتی ہیں کہ اسی زمانے میں ہندوستان سے جو مستورات مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لیے آئی تھیں۔ وہ اپنی پرانی وضع کے سفید برقعے پہنے نمائش میں بھی گئیں۔ وہاں ان کی بھی نمائش ہو گئی۔ ادھر سے لوگ بڑے تعجب سے دیکھتے اور فوٹو لیتے تھے۔ ایک موقع پر چند نوجوان ترکی اور شامی لڑکیوں نے چند ہندوستانی برقعہ پوش مستورات کو گھیر لیا اور برقعہ اٹھا اٹھا کر دیکھنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے ہماری یہ ہندی بہنیں تنگ پاجامے اور سر سے پیر تک زیورات میں لدی ہوئی تھیں۔ دیکھنے والیوں کے لیے ایک عجیب تماشا ہو گیا اور تھوڑی دیر میں ان کے گرد سینکڑوں لوگ جمع ہو گئے۔[99] مصنفہ ایک اور جگہ ایرانی خواتین کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ایرانی مستورات نے بھی بجائے جدید برقعے کے جو عموماً سیاہ ریشم کا اور بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اب لیڈیز ہیٹ کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ جس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ ایران سے برقعہ پوشی کا رواج ترکی کی طرح معدوم ہو جائے گا۔ بلکہ یہی رفتار خواتین عراق و شام کی ہے۔"[100]

بیگم حسرت کا سفر نامہ سفر نامہ عراق ایک مخصوص عہد کی داستان لگتا ہے جو بیسویں صدی کا المناک ترین دور تھا اور مصنفہ نے جس کو جیا اور جھیلا بھی تھا۔ وہ تحریکِ آزادی کے کارواں میں شامل رہیں اور اپنی آخری سانس تک اس جدوجہد میں بر سرِ پیکار رہیں۔ ان کے عہد میں ہندوستانی خواتین اپنے حقوق کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے سماج سدھار کا فریضہ انجام دے رہی تھیں۔ لیکن پھر بھی ہندوستانی عورت دیگر ممالک کی خواتین سے بہت پیچھے تھیں اور معاشرے کے پیدا کردہ رسوم میں بڑی طرح جکڑی ہوئی تھیں۔ اپنے سفر نامہ میں عورت کی اسی قسم کی بے بسی کو یوں بیان کرتی ہیں کہ سینما میں میرے پاس اتفاق سے دہلی کی ایک ماں بیٹی بیٹھی تھی۔ میاں ان کے سولہ سال سے یہاں ہیں۔ بیوی اور بڑی لڑکی سال بھر سے آئی ہوئی ہیں۔ باپ نے لڑکی کا

نکاح ماں کی مرضی کے خلاف ایک تین بچوں کے باپ سے کر دیا۔ جن کی پہلی بیوی فوت ہو چکی ہے۔ وہ بھی ہندوستانی تھی اور کل یہاں خانقاہ شریف میں دونوں ماں بیٹیاں ملنے بھی آئیں تھیں۔ اپنی مصیبت بیان کرتی رہیں۔ [101]

یہ تمام سفر نامے اس عہد کی تصویریں ہیں جہاں عورت استحصال کی چکی میں پس رہی تھیں۔ ان کا اپنا کوئی وجود نہیں تھا۔ وہ معاشرے کا غیر اہم پرزہ سمجھی جاتیں تھیں۔ ان کا فرض صرف باپ، بیٹے اور شوہر کی خدمت گزاری تھی اور اسے جذبات سے عاری کوئی مخلوق سمجھ کر اُس کے ساتھ ناروا سلوک روا رکھنا ہندوستانی معاشرے میں صدیوں سے چلا آرہا تھا۔ نو آبادیاتی عہد میں جدید تعلیم نے معاشرے کے ہر فرد کو یہ شعور دیا کہ اسلام میں عورت کے مقام و مرتبہ کو پہچانو اور گناہ کے مرتکب نہ ٹھہرو۔

حوالہ جات

۱۔ سیّد نوراللہ،تاریخ تعلیم ہند،(نئی دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ،۱۹۷۳ء)،ص ۶۲۔

۲۔ سیمیں ثمر فضل،ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصّہ،ص۸۵۔

۳۔ سیّد نوراللہ،تاریخ تعلیم ہند،ص۱۴۷۔

۴۔ جوگیش سی بگل،*Women Education in Eastern India*،(کلکتہ، ۱۹۵۶ء)، ص ۶۲۔

۵۔ سیّد نوراللہ،تاریخ تعلیم ہند،ص۱۵۶۔

۶۔ کے۔ایم۔پنکر،*The Foundation of New India*،(لندن،۱۹۶۳ء)،ص۱۲۰۔

۷۔ شیخ عبداللہ،خاتون(۱۹۰۶ء)،ص۴۹۔

۸۔ سیمیں ثمر فضل،ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصّہ،ص۱۰۱۔

۹۔ ڈاکٹر نسیم آرا،اردو صحافت کے ارتقا میں خواتین کا حصہ،(کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۰۸ء)،ص۸۰۔

۱۰۔ سید انصاری،ہندوستانی تعلیم اور اس کے مسائل،(دہلی: حالی پبلشنگ ہاؤس،۱۹۴۶ء)، ص۱۲۶۔

۱۱۔ سیمیں ثمر فضل،ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصّہ،ص۱۱۵۔

۱۲۔ ڈاکٹر فرحت جہاں،بیسویں صدی میں خواتین کی غیر افسانوی نثر ایک مطالعہ، ص۱۴۔

۱۳۔ ترنم ریاض،بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب،(دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۲۰۰۴ء)، ص۸۔
۱۴۔ ڈاکٹر قمر رئیس،تلاش و توازن،(دہلی: خرم پبلی کیشنز،۱۹۶۸ء)، ص۲۰۔
۱۵۔ محمد امین زبیری،بیگمات بھوپال، ص۴۳۔
۱۶۔ ڈاکٹر محمد شہاب الدین،اردو میں حج کے سفر نامے، ص۶۵۔۶۶۔
۱۷۔ محمد امین زبیری،بیگمات بھوپال، ص۱۰۵۔
۱۸۔ ڈاکٹر رضیہ حامد، نواب سلطان جہاں بیگم، ص۲۴۹۔
۱۹۔ محمد امین زبیری،بیگمات بھوپال، ص۱۰۵۔
۲۰۔ ایضاً، ص۱۳۱۔
۲۱۔ ڈاکٹر فرحت جہاں،بیسویں صدی میں خواتین کی غیر افسانوی نثر ایک مطالعہ، ص۱۳۳۔
۲۲۔ نازلی رفیعہ سلطان،سیرِ یورپ، ص۳۷۔۳۸۔
۲۳۔ ایضاً، ص۱۹۷۔
۲۴۔ نصیر الدین ہاشمی،حیدر آباد کی نسوانی دنیا، ص۵۲۔
۲۵۔ بیگم صغرا ہمایوں،روزنامچہ سفر بھوپال و آگرہ و دہلی کے حالات، ص۴۷۔
۲۶۔ ایضاً، ص۲۸۔
۲۷۔ بیگم صغرا ہمایوں،سفرنامہ یورپ، ص۵۵۔
۲۸۔ ایضاً، ص۱۲۲۔
۲۹۔ ڈاکٹر فرحت جہاں،بیسویں صدی میں خواتین کی غیر افسانوی نثر ایک مطالعہ، ص۱۳۶۔
۳۰۔ عطیہ فیضی،زمانہ تحصیل،(کراچی: ادارۂ یادگار غالب، ۱۹۲۲ء)، ص۶۰۔
۳۱۔ ایضاً، ص۷۶۔
۳۲۔ عبدالشکور (پرنسپل)،حسرت موہانی، ص۱۰۱۔

۳۳۔ سید محمد اصغر کاظمی،حسرت موہانی کی چند نادر و نایاب تحریریں،(لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۲۰۱۷ء)،ص۲۳۸۔

۳۴۔ ایضاً،ص۲۳۵۔

۳۵۔ ایضاً،ص۲۳۲۔

۳۶۔ بیگم صغرا ہمایوں،روزنامچہ سفر بھوپال وآگرہ و دہلی کے حالات،ص۱۰۔

۳۷۔ بیگم سربلند جنگ بہادر،دنیا عورت کی نظر میں،ص۵۳۔

۳۸۔ ایضاً،ص۵۱۔

۳۹۔ محمودہ عثمان حیدر،مشاہدات بلادِ اسلامیہ،ص۱۳۹۔

۴۰۔ ایضاً،ص۱۴۰۔

۴۱۔ اشتیاق حسین قریشی،برعظیم پاک و ہند کی ملت اسـلامیہ،(کراچی: کراچی یونیورسٹی، 1999ء)،ص۲۰۷۔

۴۲۔ معین الدین عقیل،آزادی کی قومی تحریک،(لاہور: مکتبہ تعمیرِ انسانیت،س۔ن۔)،ص۵۲۔

۴۳۔ اشتیاق حسین قریشی،برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ،ص۱۰۵۔

۴۴۔ ابو سلمان شاہ جہاں پوری، تحریکاتِ ملی،(کراچی: المخزن پرنٹرز،س۔ن۔)،ص۱۱۔

۴۵۔ معین الدین عقیل،آزادی کی قومی تحریک،ص۳۴۔

۴۶۔ شیخ محمد اکرام،موجِ کوثر،ص۵۸۔

۴۷۔ محمد مجیب،ہندوستانی سماج پر اسلامی اثر،(کراچی: بک ٹائم،۲۰۱۱ء)،ص۷۰۔

۴۸۔ شیخ محمد اکرام،موجِ کوثر،(لاہور: رفائی پرنٹرز،۲۰۰۷ء)،ص۱۲۔

۴۹۔ معین الدین عقیل،آزادی کی قومی تحریک،ص۶۱۔

۵۰۔ ایضاً،ص۶۹۔

۵۱۔ عزیز احمد،برصغیر میں اسلامی جدیدیت،(لاہور: فائن بک پرنٹرز،۲۰۰۶ء)،ص۶۴۔

۵۲۔ شیخ محمد اکرام،موجِ کوثر،ص۸۷۔

۵۳۔ معین الدین عقیل،تحریک آزادی میں اردو کا حصّہ،(لاہور: علی پرنٹرز،۲۰۰۸ء)،

ص۷۵۔

۵۴۔ اشتیاق حسین قریشی،بر عظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ،ص۳۷۳۔

۵۵۔ معین الدین عقیل،آزادی کی قومی تحریک،ص۷۲۔

۵۶۔ ایضاً،ص۷۳۔

۵۷۔ ایضاً،ص۷۳

۵۸۔ ایضاً،ص۵۵۔

۵۹۔ ایضاً،ص۵۶۔

۶۰۔ ایضاً،ص۵۷۔

۶۱۔ ایضاً،ص۵۷۔

۶۲۔ ایضاً،ص۶۲۔

۶۳۔ اشتیاق حسین،بر عظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ،ص۲۷۲۔

۶۴۔ معین الدین عقیل،تحریکِ آزادی میں اردو کا حصّہ،ص۲۳۰۔

۶۵۔ ابو سلمان شاہ جہاں پوری،تحریکاتِ ملی،ص۳۵۸۔

۶۶۔ ایضاً،ص۲۹۷۔

۶۷۔ معین الدین عقیل،تحریکِ آزادی میں اردو کا حصّہ،ص۲۹۵۔

۶۸۔ ابو سلمان شاہ جہاں پوری،تحریکاتِ ملی،ص۳۲۷۔

۶۹۔ معین الدین عقیل،تحریکِ آزادی میں اردو کا حصّہ،ص۲۲۸۔

۷۰۔ ایضاً،ص۲۲۲۔

۷۱۔ ابو سلمان شاہ جہاں پوری، تحریکاتِ ملی،ص۲۸۴۔

۷۲۔ ایضاً،ص۱۵۲۔

۷۳۔ معین الدین عقیل، آزادی کی قومی تحریک،ص۶۵۔

۷۴۔ ایضاً،ص۶۶۔

۷۵۔ نازلی رفیعہ سلطان،سفر نامہ سیرِ یورپ،ص۱۲۳۔

۷۶۔ ایضاً، ص۱۰۵۔
۷۷۔ ایضاً، ص۳۷۔
۷۸۔ صغرا ہمایوں بیگم،سفرنامہ پونہ و مدراس، ص۳۷۔
۷۹۔ صغرا ہمایوں بیگم،سفرنامہ بھوپال و آگرہ اور دہلی کے حالات، ص۸۷۔
۸۰۔ عطیہ فیضی،زمانۂ تحصیل، ص۸۴۔
۸۱۔ بیگم سر بلند جنگ بہادر،دنیا عورت کی نظر میں، ص۱۷۷۔
۸۲۔ نواب سلطان جہاں،روضۃ الریاحین، ص۱۱۔
۸۳۔ بیگم سر بلند جنگ بہادر، دنیا عورت کی نظر میں، ص۸۔
۸۴۔ ایضاً، ص۱۲۔
۸۵۔ ایضاً، ص۱۵۔
۸۶۔ ایضاً، ص۱۷۶۔
۸۷۔ بیگم صغرا ہمایوں مرزا،روزنامچہ سفر بھوپال و آگرہ، ص۳،۲۔
۸۸۔ ایضاً، ص۳۔
۸۹۔ بیگم صغرا ہمایوں،پردہ، مشمولہ:تہذیبِ نسواں، محمدی بیگم،(لاہور: جلد۲۱،۱۵جون۱۹۱۸ء)، ص۳۸۵۔
۹۰۔ بیگم صغرا ہمایوں،سفرنامہ پونہ و مدراس وغیرہ، ص۱۲۔
۹۱۔ نازلی رفیعہ سلطان،سیرِ یورپ، ص۱۲۳۔
۹۲۔ محمد مجیب،ہندوستانی سماج پر اسلامی اثر، ص۶۴۔
۹۳۔ بیگم صغرا ہمایوں،سفرنامہ بھوپال و آگرہ اور دہلی کے حالات، ص۳۔
۹۴۔ نازلی رفیعہ سلطان،سیرِ یورپ، ص۵۷۔
۹۵۔ عطیہ فیضی،زمانۂ تحصیل، ص۶۳۔
۹۶۔ ایضاً، ص۵۳۔
۹۷۔ بیگم صغرا ہمایوں،سفرنامہ بھوپال و آگرہ اور دہلی کے حالات، ص۱۰۔

۹۸۔ ایضاً، ص۱۰۳۔

۹۹۔ محمودہ عثمان حیدر، مشاہداتِ بلادِ اسلامیہ، ص۳۶۔

۱۰۰۔ ایضاً، ص۱۵۔

۱۰۱۔ بیگم حسرت موہانی، سفرنامہ عراق، ص۱۱۵۔

مجموعی جائزہ، نتائج اور سفارشات

مجموعی جائزہ، نتائج وسفارشات

مجموعی جائزہ:

برصغیر پاک وہند اپنی جغرافیائی اور معاشی اہمیت کی وجہ سے ہمیشہ سے ہی بیرونی طاقتوں، سیاحوں اور تاجروں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ یہ خطہ اپنی زرخیزی اور قدرتی معدنیات سے مالا مال ہونے کی وجہ سے نو آبادکاروں کی آمجگاہ بنا رہا۔ اسے زمانہ قدیم میں سونے کی چڑیا سے تعبیر کیا گیا۔ یہ متعدد تہذیبوں اور مذاہب کا گہوارہ رہا۔ اس سرزمین پر جو بھی حکمران آیا وہ اس کے طلسماتی سحر میں کھو کر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ سولھویں صدی عیسوی میں انگریز تاجروں کے روپ میں اس سرزمین میں داخل ہوتے اور پہلے پہل "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے نام سے ایک تجارتی کمپنی کے حقوق مغل سلطنت سے حاصل کیے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی خوشامد اور سلطنت کے خیر خواہ بن کر ۱۶۱۳ء میں سورت (گجرات) میں اپنی فیکٹری قائم کی اور پھر آہستہ آہستہ کلکتہ، مدارس، بمبئی، بہار اور ملک کے دوسرے حصوں میں انگریزوں کی سازشوں کا جال بچھتا گیا۔ انھوں نے جلد ہی اپنا سیاسی اثر ورسوخ پیدا کر لیا اور آہستہ آہستہ اپنی جڑیں ہندوستان میں مضبوط کرنے لگے۔ یہ موقع انہیں اورنگزیب کی وفات کے بعد ملا اور وہ بل آخر اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گئے۔

اورنگزیب عالم گیر کی وفات ۱۷۰۷ء کے بعد نااہل جانشیوں کی خانگی سازشوں اور عیش وعشرت نے مغلیہ سلطنت کو زوال کی جانب دھکیل دیا اور انگریز کمپنی اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہونے لگی۔ بالآخر ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی اور ۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی نے اس کمپنی کو ہندوستان پر حکمرانی کا موقع فراہم کر دیا۔ اب مغل حکمران صرف نام کے پنشن گزار بادشاہ رہ گئے۔ ساری سلطنت انگریزوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ کمپنی بہادر کی سیاسی چالوں، مغل حکمرانوں کی مفلسی اور غریب عوام کے استحصال سے بہت سی تاریخی کتابیں بھری پڑیں ہیں۔ نو آبادیاتی نظام کے اثرات جہاں دیگر جگہوں پر اثر انداز ہوئے وہیں ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

ہندوستانی عوام کی غلامی کا یہ دور تقریباً دو صدیوں پر محیط ہے۔اس عہد میں نہ صرف علوم وفنون اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں ترقی ہوئی بلکہ اس دور میں برعظیم کے باشندوں کی ذہنی و نفسیاتی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں، جنھوں نے آئندہ زندگی میں اپنے خطے میں بسنے والی تمام قوموں کے انفرادی و اجتماعی شعور پر دیرپا اثرات مرتب کیے۔

اس نوآبادیاتی عہد نے تمام شعبہ ہائے زندگی کو بدل کرر کھ دیا۔ادب بھی نوآبادیاتی عہد کے اثرات و ثمرات سے گہرے طور پر متاثر ہوا۔اس دور میں بہت سی شعری اصناف کے ساتھ ساتھ نثری اصناف کا بھی اضافہ ہوا۔جس میں تنقید، مضمون نگاری، ناول، افسانہ، سوانح وغیرہ اہم ہیں۔نئے اسالیب متعارف ہوئے، معروضیت، مدعا نگاری اور حقیقت نگاری کا چلن عام ہوا۔ادب کو ذہنی و روحانی واردات کے منطقے سے نکال کر خارجی مظاہر کا ترجمان بنانے پر اصرار ہوا۔ سماجی و ثقافتی اور سیاسی مسائل پہلے سے کہیں زیادہ وضاحت اور شدت سے براہ راست ادب کا حصہ بننے لگے۔ مضمون نگاری، سوانح عمری اور تاریخی قصہ نویسی کے ساتھ ساتھ سفر نامہ بھی اس عہد کا معتبر سرمایہ بنا۔

زیرِ نظر مقالے میں خواتین سفر نامہ نگاروں کے حوالے سے تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔اس میں ان خواتین کے سفر ناموں پر بات کی گئی ہے جو نوآبادیاتی عہد میں نہ صرف اس میں طبع آزمائی کر رہی تھیں بل کہ انھوں نے اپنے ملک سے باہر کی دنیا بھی دیکھ رکھی تھی۔یہی وجہ ہے کہ وہ خواتین نہ صرف اپنے ماحول سے آگاہ ہوئیں بل کہ ان کی تحریروں پر بیرونی اثرات بھی مرتب ہوئے۔راقمہ نے ان سفر ناموں کو نوآبادیاتی عہد کے حوالے سے دیکھا ہے۔ان کی تہذیب، معاشرت، رہن سہن، رسم و رواج کے ساتھ ساتھ اس دور میں حقوق نسواں کے حوالے سے جو آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور جو تعلیمی اصلاحات نافذ کرنے کے اقدامات ہو رہے تھے انہیں بھی اپنی تحریروں خصوصاً سفر نامے کا حصہ بنایا۔ان خواتین کی ان کوششوں کو بھی ان کے سفر ناموں کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے جو وہ مقامی خواتین کی تعلیم و تربیت کے میدان میں کر رہی تھیں۔ جنہیں راقمہ نے مختلف مثالوں کی صورت میں بیان کیا ہے۔

سفر پر جانا عام نہ تھا اور اگر طبقہ اشرافیہ کی خواتین کو یہ مواقع میسر بھی تھے تو ان کے احوال بیان کرنے کی جرأت اور صلاحیت مفقود تھی۔ایسے میں ان خواتین نواب سکندر بیگم (تاریخِ وقائع حج)، نواب سلطان جہاں

بیگم(روضۃ الریاحین)،،نازلی رفیہ سلطان(سیرِ یورپ)،، سربلند جنگ بہادر بیگم(دنیا عورت کی نظر میں)، صغرا ہمایوں مرزا(سفرنامہ یورپ اور سفرنامہ عراق)، شاہ بانو(سیاحتِ سلطانی)، عطیہ فیضی(زمانۂ تحصیل)، محمودہ عثمان حیدر(مشاہداتِ بلادِ اسلامیہ)، اور بیگم حسرت موہانی(سفرنامہ عراق)، وغیرہ نے اپنے سفر کے احوال بیان کرنے کی جرات دکھائی اور یہ نہ صرف خود اپنے معاشرے کی سیاسی و سماجی صورت حال پر اپنی رائے کا اظہار کیا بلکہ جن ممالک کی سیر کی ان ممالک کی بھی سماجی و تہذیبی زندگی اور سیاسی نظام پر بھی اظہار خیال کیا۔

بعض مقامات پر تو دونوں کے تقابل کے ذریعے اپنے واضح سیاسی و سماجی شعور کا اظہار کیا۔ ان سفر ناموں کا مطالعہ برعظیم پاک وہند کی ذہنی و فکری تاریخ کے ایک اہم دور کا مطالعہ ہے جو بعد میں آنے والی نسلوں کی ذہنی و فکری نشوونما اور پرداخت کا وسیلہ بنا۔ اس کے علاوہ یہ سفر نامے اس لیے بھی اہمیت رکھتے ہیں کہ اس عہد میں خواتین کی تعلیمی حالت، سماجی شعور اور فکری بیداری کا اظہار کس طرح ہوتا ہے۔ ان کا علمی، سیاسی و سماجی خاندانی پس منظر بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اردو میں خواتین سفر ناموں کے نمونے بیسویں صدی کے اوائل میں ملتے ہیں بلکہ اس سے قبل بھی ہندوستانی خواتین کے سفر ناموں کے نمونے پائے جاتے ہیں جس میں بیگمات بھوپال نواب سکندر بیگم کا یادداشت تاریخ و قائع حج اور نواب سلطان جہاں کا روضۃ الریاحین(سفرنامہ سفر کشور حجاز) اپنے عہد کے نمائندہ سفر نامے ہیں۔ لیکن بیسویں صدی میں خواتین نے کثرت سے سفر نمامے لکھے۔ اس میں حج کے سفر نامے شامل ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد کی خواتین نے سفرنامہ تحریر کرنے پر بھی توجہ دی اور بڑے عمدہ سفری احوال تخلیق کیے۔

یہ تمام سفرنامہ نگار خواتین اپنے عہد کی نامور خواتین تھیں۔ ان کا تعلق پڑھے لکھے، کھاتے پیتے اور باشعور خاندان سے تھا۔ انھوں نے اپنے وقت کی سیاسی و اصلاحی تحریکوں میں حصہ لیا اور زمانے کی دوڑ میں ہندوستانی عورتوں کو شامل کرنے کے لیے فریضہ انجام دیا۔ انھوں نے تعلیم و بیداری نسواں کے لیے مختلف وسائل میں مضمون نگاری کی، مدارس قائم کیے، شہروں شہروں جا کر کانفرنسوں اور جلسوں کی صدارت کے علاوہ ان میں شمولیت بھی کی۔ خواتین

سے رابطے کے لیے ملک گیر تحریکیں چلائیں اور انھیں جدید تعلیم کے لیے بھی اکسایا۔ بعض خواتین نے سفر نامہ نگاری کے ساتھ ناول نگاری بھی کی جس میں صرف خواہش کی فلاح و بہبود اور سماجی شعور کا نظریہ کار فرما ہے۔ اس سلسلے میں بیگمات بھوپال کی خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ان خواتین نے مسلمان عورتوں کی تعلیمی اور سماجی اصلاح کے لیے انھیں موثر ذریعہ کے طور پر کام لیا۔ چنانچہ اردو کے ابتدائی سفر ناموں نے ہندوستانی مسلمان عورتوں کی ذہنیت کو بدلنے اور ان کی پس ماندگی کو دور کرنے اور انھیں جدید تعلیم کی اہمیت سے روشناس کرانے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے اپنے سفر ناموں میں اپنے عہد کی سماجی و ثقافتی اقدار کی بھی ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ جس ملک میں بھی گئیں اپنی تہذیب و معاشرت کا موازنہ دوسرے معاشرے کا موازنہ دوسرے معاشرے کی تہذیب سے ضرور کیا۔ جو اچھی چیزیں اپنے ملک کی تھیں ان کا اظہار کسی دوسری جگہ کی خامی کو دیکھ کر کیا۔ ان سفر ناموں سے لگتا ہے کہ جیسے سماج سدھار مقصد کے تحت ان کو تخلیق کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر ان سفر ناموں کی سیاسی، سماجی اور تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں قدیم ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی عکاسی ہوتی ہے۔

نتائج:

اس عہد کی خواتین کے اردو سفر ناموں کا جب مطالعہ کریں تو تمام سفر ناموں میں ایک بات یکساں ہے کہ ہر ایک نے شعوری طور پر تعلیم و بیداری نسواں کا بیڑا اٹھایا ہے۔ وہ خود بھی اس وقت کی سیاسی و تعلیمی اور اصلاحی تحریکوں سے متاثر تھیں اور وہ اپنے حلقہ اور گروہ میں بڑی متعدی سے اپنی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئیں تھیں۔

راقمہ کے زیر مطالعہ سفر نامہ نگار خواتین کا تعلق چونکہ طبقہ اشرافیہ سے تھا اس لیے انہیں اس دور میں چلنے والی ذہنی و فکری بیداری کے عمل نے دیگر خواتین کی نسبت زیادہ متاثر کیا۔ اس بات کا اظہار ان کے سفر ناموں، دیگر تحریروں اور اصلاحی جدوجہد سے ہوتا ہے۔ جیسے بیگم صغرا ہمایوں کے ناولوں اور مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی ان تحریروں کے ذریعے ہندوستانی عورتوں میں معاشرتی، علمی اور سیاسی سطح پر بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بیگم حسرت موہانی سیاسی جدوجہد میں اپنے شوہر کے ساتھ بر سرِ پیکار رہیں۔ انھوں نے جدوجہد آزادی میں اپنے

عمل اور تحریروں سے حصہ لیا۔ عطیہ فیضی، نازلی فیضی، محمودہ عثمان حیدر اور بیگم سر بلند جنگ کی ہندوستانی عورتوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور انھیں معاشرے کا کارآمد رکن بنانے میں اہم خدمات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض موقعوں پر ان خواتین سفر نامہ نگاروں نے اپنے سفر ناموں میں جس جرأت مندانہ انداز میں مختلف کیفیات اور واقعات کی نشاندہی کی ہے، وہ ہمیں اس دور کے مرد سفر نامہ نگاروں کے یہاں نظر نہیں آتے۔ ان خواتین نے اپنے زمانے کی مروجہ رسوم و بدعات کے خلاف جہاد کیا اور انھوں نے اپنے سفر ناموں کے ذریعے یورپی ممالک کی تہذیب و معاشرت سے آشنا کروایا تا کہ ہندوستانی خواتین جہالت کی گمراہیوں سے نکل سکیں۔

راقمہ السطور نے ایک بات شدت سے محسوس کی ہے کہ ان سفر ناموں میں روایتی انداز پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر جغرافیہ تاریخ، حدود، سماج اور سیاست پر زور دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ہندوستانی عورتوں کو دوسری دنیا دکھانے میں رہنمائی کر رہی ہیں۔ زیادہ تر سفر نامے خطوط اور روزنامچے کی تکنیک میں لکھے گئے ہیں۔

مقالے میں جن سفر ناموں کا مطالعہ کیا گیا ہے وہ تمام کتابی صورت میں موجود ہیں۔ کچھ سفر نامے ایسے ہیں جو کتابی صورت میں اشاعت سے پہلے رسائل میں قسط وار شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے یورپ (نازلی بیگم) زمانہ تحصیل (عطیہ فیضی) بیگم صغرا ہمایوں کے تقریباً تمام سفر نامے، سفر نامہ عراق (بیگم حسرت)۔ اس موضوع پر تحقیق کے دوران مختلف ذرائع سے نو آبادیاتی عہد کے دیگر سفر ناموں کے نام اور ان کی تفصیلات بھی دستیاب ہوتی ہیں، جن تک رسائی ممکن نہیں ہو سکتی۔ جیسے امۃ الغنی نور النساء کا "سفر نامہ حجاز، شام و مصر" اور راحیل شروانیہ کا "زاد السبیل"ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سفر نامے بھارت کی لائبریریوں میں موجود ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی ایک محقق کے لیے تمام سفر ناموں کو حاصل کر لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ چنانچہ ان سفر ناموں کے ناموں کا سامنے آنا بھی تحقیق کے لیے اور در وا کرنے کے برابر ہے تا کہ آئندہ کام کرنے والوں کو آسانی ہو۔

اس موضوع پر کام کرتے ہوئے راقمہ کو بہت سی مشکلات کا سامنا اس وقت کرنا پڑا جب ان تمام خواتین کے سیاسی و سماجی اور علمی پس منظر کو بیان کرنا تھا۔ خاص طور پر بیگم سر بلند جنگ بہادر اور محمودہ عثمان حیدر کے بارے میں

معلومات کہیں بھی دستیاب نہ ہو سکیں۔ حتیٰ کہ ایک عرصہ لگا بیگم سربلند کے اصل نام تک رسائی حاصل کرنے میں، راقمہ نے اس عہد کے رسائل تہذیب النسواں، عصمت اور خاتون کھنگال ڈالے مگر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ پھر تذکروں میں تلاش بسیار کے بعد کچھ معلومات دستیاب ہوئیں۔ اس تحقیقی کام میں سفر ناموں کے علاوہ تذکروں سے بھی کافی مدد ملی۔ جن میں خصوصاً خواتین کے حالات زندگی شامل ہیں جو کہیں اور دستیاب نہ ہو سکے۔ یہی حال محمودہ عثمان کے سلسلہ میں رہا اور سفر نامہ مشاہدات بلاد اسلامیہ میں موجود معلومات پر اکتفا کرنا پڑا۔

دوران تحقیق دو نایاب سفر نامے بھی دستیاب ہوئے۔ ان میں سے ایک کا تذکرہ ڈاکٹر قدسیہ قریشی نے اپنی کتاب "اردو سفر نامے انیسویں صدی میں" کیا ہے۔ مگر اس کے متعلق یہ معلومات فراہم کی ہیں کہ یہ سفر نامہ یاداشت تاریخ وقائع حج کے نام سے غیر مطبوعہ حالت میں رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔ مگر راقمہ کو یہ سفر نامہ انگریزی زبان میں شائع شدہ ملا اور اس کی انیسویں صدی میں اولین اشاعت کے بارے میں بھی معلومات دستیاب ہوئیں۔ دوسرا سفر نامہ بھی بیگم بھوپال، نواب سلطان جہاں کا سفر نامہ روضتہ الریاحین (سفرِ کشورِ حجاز) کی تمام تاریخی کتب میں نہیں ہے۔ حالانکہ یہ قدیم سفر نامہ ہے اور بیگمات بھوپال پر تحریر کی گئیں تمام کتب میں ان کے اسفار اور سفر ناموں کے بارے میں معلومات درج ہیں۔ لیکن کسی نے بھی ان سے استفادہ نہیں کیا اور خواتین کے سفر ناموں کی روایت ان کے ذکر کے بغیر ہی رہی۔

ان خواتین کے سفر ناموں کی دستیابی کے بعد راقمہ کی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بیگم نازلی رفیعہ سلطان کے سفر نامے سے پہلے نواب سکندر جہاں بیگم کا سفر مانہ تحریری صورت میں انگریزی زبان میں ۱۸۷۰ عیسویں میں شائع ہو چکا تھا۔ یوں زمانی لحاظ سے نواب سکندر جہان بیگم کا سفر نامہ اردو ادب کی سفر نامہ نگاری میں اولیت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں راقمہ نے تحقیق کے دوران ایک اور سفر نامہ بھی دریافت کیا ہے جس کا ذکر کسی تاریخی کتاب میں نہیں ملتا۔ یہ سفر نامہ روضتہ الریاحین (سفرِ کشورِ حجاز) کے نام سے مطبع سلطان سے شائع ہوا۔ اس سفر نامے کے آخری صفحے پہ مصنفہ کی جانب سے بتاریخ ۸ جمادی الثانی ۱۳۲۲ ہجری درج ہے۔

ان سب سفر ناموں کے مطالعے سے ایک نمایاں خصوصیت یہ سامنے آتی ہے کہ سب میں مشترک موضوعات، اسلوب، متاثر اور رجحان ملتے جلتے ہیں اور ایک دوسرے سے مماثل دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں ہندوستان، یورپی ممالک اور بلاد اسلامیہ کا ہر پہلو زیر بحث آیا ہے۔ ان کے ذریعے اس عہد کی تاریخی، سیاسی، سماجی، مذہبی رجحانات کا سراغ ملتا ہے۔ ان سفر ناموں کے مبسوط مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سفر نامہ نگار روشن خیال، تعلیم یافتہ اور کشادہ ذہن کی مالک تھیں۔ تمام یورپی سفر نامہ نگار خواتین دیگر ہندوستانی لوگوں کی نسبت برطانوی استعماری طاقتوں پر برہمی کا اظہار کرتی نہیں پائی جاتیں۔

راقمہ کے زیر مطالعہ جو کتابیں رہیں اس میں ایک سفر نامہ نگار عزلت بیگم کا ذکر پایا گیا اور ایک "سفر نامہ عراق" بھی ان سے منسوب تھا مگر دوران تحقیق یہ بات بھی سامنے آئی کہ ''عزلت بیگم ''صغرا ہمایوں کا لقب ہے اور انہی کے سفر نامہ عراق کو دو مختلف ناموں سے منسوب کر دیا گیا جو ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا۔ یہ ایک بڑی تحقیقی خامی ہے جو بعد میں آنے والی تحقیقات میں جوں کی توں بیان ہوتی رہی۔ راقمہ نے دوران تحقیق دکن کی خواتین کے دستیاب شدہ تذکروں سے جو استفادہ کیا ان میں بھی اس خاتون "عزلت بیگم "کا نام نہیں ملا کہ جس نے سفر نامہ عراق لکھا ہو۔ یہ امر بھی افسوس ناک ہے کہ قدیم عہد کی خواتین کے سفر ناموں پر تفصیلی کام نہیں ہوا۔ عطیہ فیضی کے سفر نامے زمانہ تحصیل کی تدوین ڈاکٹر محمد یامین نے اور شاہ بانو کے سفر نامے سیاحت سلطانی کو ان کے نواسے محمد شہریار نے مرتب کیا مگر بہت سے سفر ناموں پر اب تک کام نہیں ہوا۔ خواتین کے چند سفر ناموں پر صرف چند سطور پر مشتمل معلومات ملتی ہیں اور زیادہ تر کتابوں میں صرف ناموں کی فہرست پائی جاتی ہے۔ اب تک سفر ناموں کی صنف پر تحقیقی کام تو ہوا ہے لیکن ان سب میں نو آبادیاتی عہد کے تمام سفر ناموں کے نام تک نہیں ملتے بلکہ ان کا صرف سرسری سا روایتی ذکر ہی راقمہ کو نظر آیا۔ اردو سفر نامہ نگاری کی تاریخ کی کتابوں اردو ادب میں سفر نامہ از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ میں بیگمات بھوپال کے سفر ناموں کا نام تک موجود نہیں ہے۔ حالانکہ یہ سفر نامے ہندوستان کی نو آبادیاتی عہد کی اہم تاریخی دستاویز کے علاوہ اس دور کی تہذیب و معاشرت کی بھی یادگار ہیں۔ لہذا ان سفر ناموں پر تفصیل سے کام کیے جانے کی ضرورت ہے۔

سفارشات:

۱: مختلف لائبریریوں میں نایاب سفر ناموں کا محض ایک ایک نسخہ موجود ہے۔ یہ سفر نامے ادب کی تاریخ میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں لہٰذا ان سفر ناموں کا دوبارہ شائع کیا جانا ضروری ہے تاکہ تحقیقی کام کرنے والوں کو مشکل پیش نہ آئے۔

۲: نوآبادیاتی عہد کے سفر نامے سیاسی و سماجی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان پر کسی اور جہت سے کام بھی کیا جانا چاہیے۔

۳: چند سفر نامے جو غیر مطبوعہ حالت میں موجود ہیں ان کی تدوین و ترتیب کی جاسکتی ہے۔

۴: ترجمہ شدہ سفر ناموں کو بھی موضوعِ تحقیق بنایا جاسکتا ہے۔

۵: بعض سفر نامے جو صرف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں ان کو مرتب کیا جاسکتا ہے اور ان پر حواشی و تعلیقات اور مقدمہ تحریر کیا جاسکتا ہے۔

۶: مقامی سفر ناموں پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

۷: ہر ملک کے سفر ناموں کو زیرِ مطالعہ لا کر اس ملک کے سماجی و سیاسی ارتقا کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

کتابیات

کتابیات

آزاد، محمد حسین۔سیر ایران۔مرتبہ، آغا محمد طاہر۔لاہور: کریمی پریس، ۱۸۸۶ء۔

آغا، وزیر۔"سفر نامے کی بحث"۔ مشمولہ: اوراق، سالنامہ، لاہور (۱۹۷۸ء)۔

آکسفورڈ ایڈوانس لرنرز ڈکشنری (Oxford Advance Learners Dictionary)، ۲۰۰۴ء، ۷ ایڈیشن۔

احمد خان، سرسید۔مسافران لندن۔لاہور: مجلس ترقی اردو، ۱۹۶۱ء۔

احمد، عزیز۔برصغیر میں اسلامی جدیدیت۔لاہور: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۶ء۔

اشرفی، وہاب۔"شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری"۔ مشمولہ سیمیں، ثمر فضل، ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی ناولوں کا حصہ، دہلی: اے ون آفیسٹ (۱۹۹۱ء)۔

انصاری، سحر۔(فلیپ)دھوپ کنارہ۔کراچی: بیلا پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء۔

اکرام، شیخ محمد۔ موجِ کوثر۔لاہور: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۷ء۔

بانو، شاہ۔سیاحت سلطانی۔آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۹۱۵ء۔

برنی، ضیاالدین۔"اقبال دیگر مشاہیر اور عطیہ"۔ مشمولہ: ماہ نو، کراچی (اپریل ۱۹۶۷ء)۔

بسمل، محمد عبدالرزاق۔تذکرہ جمیل۔حیدر آباد: دکن: بیرون دبیر پورہ، ۱۹۲۹ء۔

بہادر، بیگم سربلند جنگ۔ دنیا عورت کی نظر میں۔دہلی: خواجہ برقی پریس، ۱۹۱۰ء۔

بہادر، نواب لیاقت جنگ۔سفر نامہ یورپ و امریکہ۔دکن، ۱۹۴۷ء ۔

بی، طیبہ۔تاریخ فرمارو ایان بھوپال۔بھوپال: بھوپال پریس، ۱۹۷۷ء۔

بیگ، حامد مرزا۔اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ۔اسلام آباد، ۱۹۸۷ء۔

بیگم، سلطان جہاں۔حیات قدسی۔بھوپال: مطبع ریاست، ۱۹۱۷ء۔

بیگم، محمدی۔تہذیب نسواں۔جلد ۴۶، ۷ اگست ۱۹۴۳ء۔

بیگم، نعیمہ۔حسرت کی کہانی: نعیمہ کی زبانی۔کراچی: المخزن پرنٹرز پاکستان چوک، ۱۹۶۹ء۔

بیگم، نواب سلطان جہاں۔روضۃ الریاحین۔بھوپال: مطبع سلطانی،۱۳۲۷ھ۔
بیگم، نواب سلطان جہاں۔تزک سلطانی(حصّہ اول)۔بھوپال: مطبع سلطانی،۱۳۲۸ھ۔
پینگوئن ڈکشنری آف لٹریری ٹرمز (Penguin Dictionary of Literary Terms)،ص۹۹۔
تنویر حسین، پروفیسر۔اصناف ادب اردو۔لاہور: مقبول اکیڈمی اردو بازار،۲۰۰۹ء۔
جعفری، احمد رئیس،(مرتبہ)۔سفر نامہ ابن بطوطہ۔کراچی: نفیس اکیڈمی،۱۹۶۱ء۔
جعفری، رئیس احمد۔"عطیہ بیگم فیضی"۔مشمولہ:نگار، جلد نمبر ۵۸(نومبر ۱۹۷۹ء)۔
جہاں، رفعت۔بیسویں صدی میں خواتین کی غیر افسانوی نثر : ایک مطالعہ۔علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس،۲۰۱۵ء۔
حامد، رضیہ۔نواب سلطان جہاں بیگم۔بھوپال: باب العلم پبلی کیشنز،۲۰۱۱ء۔
حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز۔کشاف تنقیدی اصطلاحات۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۹ء۔
حیدر، محمودہ عثمان۔مشاہدات بلاد اسلامیہ۔کراچی: مشہور آفسٹ پریس،۱۹۶۲ء۔
خان، نگہت ریحان۔اردو مختصر افسانہ فنی و تکنیکی مطالعہ۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۵ء۔
الخیری، علامہ راشد۔"مضمون: محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ"۔مشمولہ: عصمت، جلد ۳۶(فروری ۱۹۲۶ء)۔
دلوی، میمونہ۔بمبئی میں اردو۔دہلی: مکتبہ جامعہ،۱۹۷۰ء۔
دی انسائیکلو پیڈیا امریکن(The Encyclopedia Emerican)، انٹرنیشنل ایڈیشن، ص۸۸۔
دی نیو انٹرنیشنل ویبسٹرز کمپری ہنسیو ڈکشنری آف انگلش لینگویج (The New International Webster's comprehensive Dictionary of the English Language)، ۲۰۰۶ء، (انسائیکلوپیڈیا ایڈیشن)، جلد ا، Naples: Trident Reference Publishing۔
رضوی، سید شفقت۔بیگم حسرت موہانی حیات و سیرت۔کراچی: نشاط النساء میموریل سوسائٹی، ۱۹۹۶ء۔

روزنامہ جنگ، کراچی، ۷ جنوری ۱۹۶۷ء۔
سدید، انور۔ اردو ادب میں سفر نامہ۔ لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء۔
سعید، حمیرہ۔ اردو ناولوں میں سنائی حسیت۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹ء۔
سلطان، نازلی رفیعہ۔ سیرِ یورپ۔ لاہور: یونین اسٹیم پریس، ۱۹۰۸ء۔
سلطانہ بخش، ایم۔ پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار۔ اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء۔
سورۃ العنکبوت، آیت نمبر ۲۰۔
شاہ جہاں پوری، ابو سلمان۔ تحریکاتِ ملی۔ کراچی: المخزن پرنٹرز، س۔ن۔
شاہین، روبینہ۔ "سفر نامے کے بنیادی مباحث"۔ مشمولہ، خیابان (خزاں ۲۰۱۴ء)۔
شہاب الدین، محمد۔ اردو میں حج کے سفرنامے۔ دہلی: بھارت آفیسٹ، س۔ن۔
شیرازی، سید تنویر۔ اجنار بلدیہ۔ جلد نمبر ۸۔۹ (دسمبر۔ جنوری ۱۹۰۰ء)۔
صاحبہ، و۔ا۔ تذکرہ بیگمات بھوپال۔ لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۳۳ء۔
صدیقی، مولانا محمد حسین (مرتبہ)۔ ہندوستان کی بیس بڑی خواتین۔ کراچی: زمزمہ پبلشرز، ۲۰۰۳ء۔
طیب علی، عبدالرسول۔ تذکرۂ سیفی (مرتبہ)۔ جبل پور: مطبع نادری، ۱۹۳۰ء۔
عابد، سید عابد علی۔ اسلوب۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ء۔
عارف، نجیبہ۔ جنوبی ایشیا میں اولین سفر نامہ انگلستان تاریخ جدید۔ مشمولہ، بنیاد، جلد ۵ (۲۰۱۴ء)۔
عارف، نجیبہ۔ اٹھارھویں صدی کا ایک نادر سفر نامہ روس وچین۔ مشمولہ، بازیافت (جولائی تا دسمبر ۲۰۱۴ء)۔
عالی، جمیل الدین۔ تماشا مرے آگے۔ لاہور: غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۵ء۔
عبدالشکور، پرنسپل۔ حسرت موہانی۔ آگرہ: عزیزی پریس، ۱۹۴۶ء۔
عبدالرحمان، مولوی۔ خلاصہ تحفہ النظار۔ دہلی: جمال پریس، ۱۹۷۲ء، ص ۱۱
عثمان، محمد یامین (مرتبہ)۔ زمانۂ تحصیل۔ کراچی: ادارۂ یادگار غالب، ۲۰۱۰ء۔
عثمان، محمد یامین۔ "عطیہ فیضی کا خاندان"۔ مشمولہ: تحقیق، جام شورو (سندھ)، شمارہ ۲۹ (جنوری تا جون ۲۰۱۵ء)۔
عقیل، شفیع۔ زندگی بھر کہاں۔ لاہور: بک ہوم، ۲۰۰۶ء۔

عقیل، معین الدین۔آزادی کی قومی تحریک۔لاہور: مکتبہ تعمیرِانسانیت۔
عقیل، معین الدین۔ "اردو کی اولین خودنوشت سوانح عمریاں"۔ مشمولہ:خدا بخش لائبریری جنرل، (جنوری،مارچ ۲۰۰۴ء)۔
عقیل، معین الدین۔تحریک آزادی میں اردو کا حصہ۔لاہور: مجلس ترقی اردو،۲۰۰۸ء۔
علی، محمد برکت۔آج کل اورسفرنامہ۔مرتب ۳۲۔
فاروقی،احسن۔ "فکشن اور تکنیک"۔ مشمولہ،سیپ، کراچی: شمارہ ۲۹۔
فرخی،اسلم۔کنارے کی دھوپ۔ مشمولہ دھوپ کنارہ از جمیل زبیری، کراچی: بیلا پبلی کیشنز،(۱۹۸۱ء)۔
فضل، سیمیں ثمر۔ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی ناولوں کا حصہ۔دہلی: اے ون آفسٹ،۱۹۹۱ء۔
فیضی،عطیہ۔زمانۂ تحصیل۔آگرہ، مطبع مفید عام،۱۹۲۱ء۔
قریشی،اشتیاق حسین۔برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ۔کراچی: کراچی یونیورسٹی،۱۹۹۹ء۔
قریشی،قدسیہ۔اردو سفر نامے انیسویں صدی میں۔نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،۱۹۸۷ء۔
کامران،جیلانی۔ "حج کے سفر ناموں کی روایت"۔ مشمولہ،ماہ نور (نومبر ۱۹۷۸ء)۔
کمبل پوش،یوسف خان۔عجائبات فرنگ۔لکھنو: مطبع نول کشور،۱۸۹۸ء۔
کِی کنسپٹس اِن پوسٹ کولونیل لٹریچر(*Key Concepts in Post Colonial Literature*) ، نیویارک: پال گریو میک میلین(Palgrave Macmillian)، ۲۰۰۷ء۔
لانگ مین ڈکشنری آف انگلش لینگویج(*Longman Dictionary of English Language*)،۱۹۸۴ء، ص ۲۸۸۔
مارہروی، محمد امین زبیری۔حیات سلطانی ۔آگرہ: عزیزی پریس،۱۹۳۹ء۔
مارہروی، محمد امین زبیری۔بیگمات بھوپال۔بھوپال: مطبع ریاست،۱۹۱۸ء۔
مجیب، محمد۔ہندوستانی سماج پر اسلامی اثر۔کراچی: بک ٹائم،۲۰۱۱ء۔
محمد اکرام الدین،خواجہ (مرتبین)۔اردو سفرناموں میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت۔نئی دہلی: قومی

کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۱۰ء۔
محمود، خالد۔اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ۔ نئی دہلی: دریا گنج، ۱۹۹۵ء۔
موہانی، بیگم حسرت۔سفرنامہ عراق۔ کراچی: نشاط النساء میموریل سوسائٹی، ۱۹۳۷ء۔
نارنگ، گوپی چند۔ادبی تنقید اور اسلوبیات۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۸۸۹ء۔
ناشاد، ارشد محمود۔"سفر، سفرنامہ اور فرصت نگاہ"۔ مشمولہ، سہ ماہی، عطاء سالنامہ(۲۰۱۲ء)۔
نعمانی، مولانا شبلی۔سفرنامہ روم و مصر وشام۔ دہلی: قومی پریس، ۱۸۸۱ء۔
ہاشمی، رفیع الدین۔اصنافِ ادب۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔
ہمایوں، بیگم صغرا۔رہبر کشمیر (مقدمہ)۔
ہمایوں، بیگم صغرا۔سفرنامہ پونہ مدراس(مقدمہ)۔
ہمایوں، بیگم صغرا۔سفرنامہ عراق۔ مطبع نظام دکن، حیدرآباد، ۱۹۱۵ء۔
ہمایوں، بیگم صغرا۔سفرنامہ یورپ۔ حیدرآباد دکن: اعظم، اسٹیم پریس چار مینار، ۱۹۲۶ء۔
ویبسٹر سکول ڈکشنری(*Webster School Dictionary*)، ایڈیشن ۱۹۸۰ء۔

ضمیمہ جات

A PRINCESS'S PILGRIMAGE

Nawab Sikandar Begum's

A Pilgrimage to Mecca

Edited, Introduced and with an Afterword by

SIOBHAN LAMBERT-HURLEY

OXFORD

UNIVERSITY PRESS

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا

لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلٰثَةِ مَسَاجِدَ

دفتر اول

رَوضَةُ الرَّيَاحِين

۲۱. ۱۳ھ

مِن

مَسِيرِ السُّلطَانِ إِلَى البَلَدِ الأَمِين

وَ

مَدِينَةِ النَّبِيِّ سَيِّدِ المُرسَلِين

یعنی سفرنامہ سفر کشور حجاز ہز ہائنس علیا حضرت قوی شوکت الحاجیہ نواب سلطان جہان بیگم صاحبہ

دام مجدہا رئیس دلاور اعظم اعلیٰ طبقہ سلطنت ہند

فرمان روائے بھوپال وسط ہند

مَنْ حَجَّ وَلَمْ يَزُرْنِي فَقَدْ جَفَانِي

در مطبع سلطانی باہتمام حافظ کرامت اللہ مطبوع گردید

HER HIGHNESS THE BEGUM OF BHOPAL.

بیگم ایم اے میم نازلی رفیعہ سلطان ریاست جنجیرہ ۱۸۷۴ء تا ۱۹۰۷ء

سیر یورپ

یعنی

ہر ہائینس نازلی رفیعہ سلطان نواب بیگم صاحبہ

ریاست جزیرہ

کے

سفر یورپ کا روز نامچہ

جسکو

بیگم خواہر محترمہ سیرا بیگم فیضی صاحبہ نے مرتب کیا

گم عطیہ فیضی

ہوالمستعان

زمانۂ تحصیل

مصنفہ

عطیہ بیگم رحمین

۱۳۳۹ھ
۱۹۲۱ء

مطبع مفید عام آگرہ میں باہتمام محمد قادر علیخاں صاحب کے چھپا
۱۹۲۲ء

کتابیں عطیہ بیگم کی تصانیف کے سرورق

SANGĪT OF INDIA
BY
ATIYA BEGUM

قُل سِیرُوا فِی الاَرضِ ثُمَّ انظُرُوا کَیفَ کَانَ عَاقِبَۃُ المُکَذِّبِین

سفرنامۂ یورپ

حصۂ اول

مشتمل بر حالات مقامات انگلستان

مرتبہ

علیا مکرمت صغرا بیگم صاحبہ متخلص حیا ایم آر اے ایس (لندن) اڈیٹر النساء

(محل عالیجناب سید ہمایوں مرزا صاحب بیرسٹر ایٹ لا خلف حضرت سید شاہ الفت حسین فریاد علیہ الرحمۃ رئیس عظیم آباد)

مصنفۂ

مشیر نسواں۔ تحریر النساء۔ مجموعۂ نصائح۔ سفینۂ نجات۔ سیر بہار و بنگالہ۔ روزنامچہ

بھوپال دو بار۔ سفرنامۂ عراق۔ آواز غیب۔ سفرنامۂ مدراس و ایلورہ

جنوبی ہند سرگزشت ہاجرہ

[illegible]

THE PUNJAB PUBLIC LIBRARY
ESTABLISHED 1884
LAHORE

قل سیروا فی الارض ثم انظروا کیف کان عاقبة المکذبین

سفرنامۂ یورپ

حصۂ دوم

مشتمل بر حالات [illegible] سنہ [illegible]

مرتبہ

[illegible] مسز صغریٰ بیگم صاحبہ متخلص بہ حیا [illegible]

[illegible] حضرت [illegible]

مصنفہ

[illegible] تحریر النساء۔ مجموعہ نصائح۔ سفینۂ نجات۔ سیر بہار و بنگال۔
[illegible] دہلی وغیرہ۔ سفرنامہ عراق۔ آواز غیب۔ سفرنامہ [illegible]
سیاحت جنوبی ہند۔ سرگزشت ہاجرہ۔

[illegible] پریس چار مینار حیدرآباد دکن میں طبع ہوا

۱۹۳۶ عیسوی

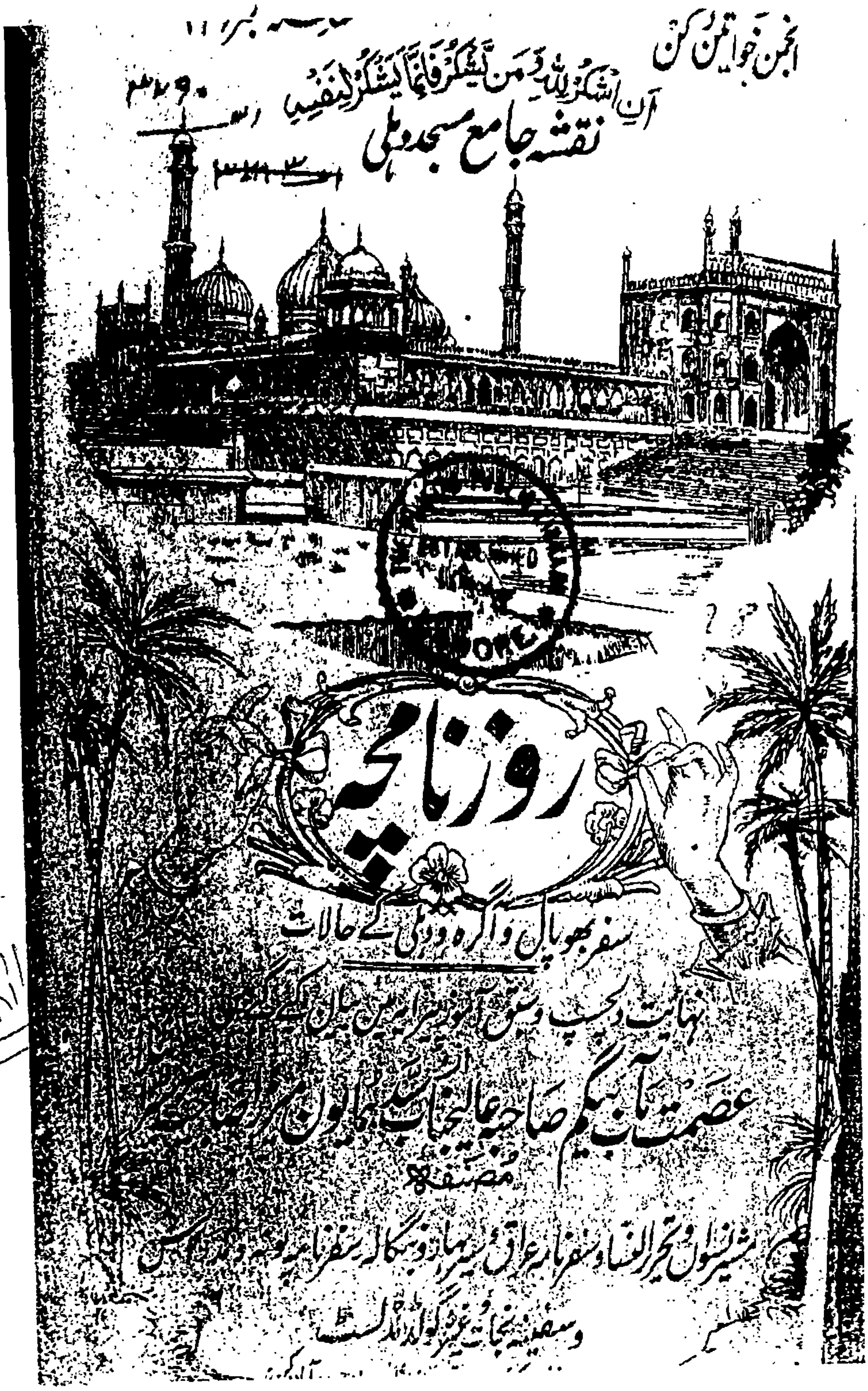
أن اشكر لله ومن يشكر فإنما يشكر لنفسه
نقشہ جامع مسجد دہلی
روزنامچہ
سفر بھوپال و آگرہ و دہلی کے حالات
عصمت مآب بیگم صاحبہ عالیجناب سید ہمایوں مرزا
مصنفہ
مشیر نسواں و تحریر النساء و سفرنامہ عراق و سیر بہار و بنگال

سفرنامۂ عراق

از

جنابہ نو[illegible] عصمت و عزلت بیگم صاحبہ عالیجناب معلی القاب

مسز سید ہمایوں مرزا صاحب بیرسٹر ایٹ لا

مصنفہ

مشیر نسواں۔ تحریر النساء۔ سفینۂ نجات وغیرہ گولڈ مڈلسٹ

در مطبع نظامی دکن واقع بازار [illegible] طبع شد

کتب خانہ خاص
انجمن ترقی اردو (ہند)

٨٦
٩٢

[illegible]

از

صغرا ہمایوں مرزا

سفرنامۂ پونہ و مدراس وغیرہ

از

بیگم صاحبہ ہمایوں مرزا صاحب بیرسٹر ایٹ لا حیدرآباد دکن

۱۹۱۸ء

صغرا ہمایوں مرزا

نشاط النساء

بیگم حسرت موہانی

سیرت و خطوط

کی روشنی میں

از

سیّد اِشتیاق اَظہر

ناشر

مولانا حسرت موہانی میموریل لائبریری اینڈ ہال ٹرسٹ

بیگم حسرت موہانی

مشاہدات
باب و البہائیہ
حصہ اول و دوم
از
محمودہ عثمان حیدر

بیگم محمودہ اور ان کے شوہر سید عثمان حیدر